

دیوار کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے درختوں پر چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔
یہ چڑیاں سب اس کی دیکھی بھالی تھیں۔ یہاں ان سب کو صبح آنکھ کھلتے ہی آپس میں لڑتے جھگڑتے ایک
ایک تنگے کے پیچھے گھم گتھا ہوتے دیکھتی تھی۔ سورج کی مری مری سی خیالی کرن سیدھی اس کی آنکھ میں
گھسکتی۔

ہر روز سونے سے پہلے وہ سوچتی تھی، آج کھڑکی کے پرٹ بند کر کے سوؤں گی۔ لیکن وہ اس کھڑکی سے نظر
آنے والے جگہ گاتے قیلے آسمان سے پہلے جدا ہونے کو تیار نہ تھی۔
رات بھر کی تھکان اور رات جھگڑے سے بوجھل سرخ آنکھیں اس نے کھڑکی سے باہر غل بچانے والے
پرندوں پر مرکوز کر دیں۔ وہ اس کی بے چینی، اذیت، کرب، ہر چیز سے بے نیاز پکی پکی جامنین توڑ کر فرش پر ڈھیر
گر رہے تھے۔ اس نے رات بھر کی مسلی چادر پانچویں پر گر کر کھڑکی پاٹوں پاٹ کھول دی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے
ہلکورے لیتے درخت اور درختوں کے پیچھے بہت آہستہ سے ابھرتا سورج تو اس کا اپنا ہی تھا۔
حالانکہ اب تو اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اس کے دل نے شبیدہ کی تھی۔ درخت
اجڑتے ہیں یا فرش بگڑتے ہیں اس کی بلا ہے۔ اس کو اینٹوں اور سیٹھ سے بنے اس مکان پر کوئی جذباتی
حق نہیں ہونا چاہیے۔

سستی اور بے زاری سے بے دار ہوتی صبح نے سارے شہر میں تھلک مچا کر رکھ دیا۔ اخبار والے،
جمہدار، دودھ والے۔

میوہل سمیٹنے کے ٹرک پر سات آٹھ جہاز روئے قدر کی جھانڈ میں لے کر سڑک کو ٹریفک شروع ہونے سے پہلے چمکانے کی جھڑپیں تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ٹریفک کا سیلاب گھروں سے بچنے والوں میں لپٹ کر چمکے گا اور سرسختی سڑک کو خلافت میں لپٹ کر چل دے گا۔

یہ سڑک بھی اس کی مانی تھی۔ اور سائیکلوں پر سوار مین کے منوں میں دودھ پیچنے والے بھی۔ تیز تیز پیدل مارا توہ جواں بہت اخبار والا بھی۔ جو بچوں کے جہاز کی طرح ایک انڈین میں اخبار دیوار سے ہرج تہہ پھینک اٹا۔ ہاں ایک وقت تھا جواس کو اخبار کی شدت سے ضرورت تھی۔ وہ وہ ٹرک ہونی اخبار اٹھ کر میز پر عیاں پڑھ جاتی۔ لیکن اب کوئی خبر کوئی واقعہ ایسا نہیں رہا تھا جو بچوں کو جس کو سننے کی خواہش رہ گئی ہو۔

اس نے فطری دیکھی۔ برآمدے میں ٹرائی کی ریز کے ساتھ برتنوں کی چمن بچن اس بات کی علامت تھی کہ آیا اماں جان کی ہیں کہ وہ جاگ رہی ہے۔ آیا اماں کے دل میں وہ کاکر کھلے جس کا ایک سزا اس کی چٹکوں سے بڑا ہے۔ اور اس کی آٹھ ٹکلی کو ضرور ڈانے پر دستک ہوئی۔

”آجائے اماں۔“ اس نے چہرے سے ساری تھکان دھو کر شاشت سمیٹ لی۔ ان افسرہ لوگوں کو باپو میں لپٹ دینے کا کیا فائدہ؟ انسان اپنا زہر بکتر پینے رہے تو محفوظ بھی رہتا ہے اور لوگوں کی ترس کھاتی نگاہوں سے بچا بھی۔

”اس نے خوش خلقی اور مسکراہٹوں کے خول میں آیا اماں کو ریہو کیا۔“

”آج تو تم جاک تمسک دینا؟“ آیا اماں نے اس کی تقریر پر توجہ نہ دی۔

”رات نیند چھٹک سے آئی؟“

”آیا اماں نے پلایا کہ پھر سے یہ قہر اپنی عادت بنایا تھا۔ ان دونوں نے شک سے ایک دوسرے کی سرخ آنکھوں کو دیکھا۔ پھر وہ نظریں بچانے لگیں۔“

”ابھی ہو گا پلایا۔“ آیا اماں نے بہت گہرا سانس لیا۔

”یہ کوئی بکلی نہیں ان تو آئیں رہیں۔“

واقعہ۔ ابھی چند دن پہلے اس خرمیں جو کرام چا تھا۔ وہ ٹھنڈا نہیں برا تھا۔ لوگ بڑی مصیبتوں سے دور دراز کے سڑک کے پلے کار سے دینے آتے لیکن اس کے دل میں اب کاکر خضت ہو گئے۔ وہ آسویہ کو اپنے آپ کو چوک میں نہیں کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ اس کو ماری کے سارے اعزاز میٹھے کا شوق تھا شاید اسی لیے تائی اماں نے جاتے ہوئے اس کے خوب لے لیے تھے۔ ان کے گمان میں۔ سلیت لے لگام اور خود غرض لڑکی تھی۔ جو مات کی ناگمانی وفات پر آسویہ کے بجائے اس لیے خوش خوش پھرتی تھی کہ وہ اپنا ایک انجی بیل دلیت کی مالک بن گئی ہے۔

وہ خاموش رہتی تھی۔ تائی اماں کے ساتھ ولید بھائی تھے۔ مالا مال ولید بھائی اسے بھی بے نہیں لگے۔ وہ جب بھی ان کے ہاں آتے سونپاتوں سے لدے پھرتے وہ اس کو چھوٹے سے بچی سمجھ کر مذاق کرتے۔ ”نہیں آتے تھے۔ اور یہی تائی اماں تھیں جو

ولید بھائی کے حلقوں سے اپنے سینے کی پناہ میں لیے انہیں بڑا بھلا کہتی رہتیں۔

”مے جٹ کم بخت کیا دیکھو نہ ہوا ہے۔“

زندگی اس کی دواؤں اور پچھتوں کے پیچھے تبدیل ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ حفاظت اور پناہ کا احساس ایست مٹی سے نہیں ہو گا۔ یہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو نہیں ہر طرح کی آفت سے پناہ میں لے کر رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کے تمام عزیزوں کا کوئی قصور نہیں تھا تائی اماں کا بھی نہیں وہ اس کو لینے ہی تو آئی تھیں۔ مدد کے قربان ہوئی اور اپنے خور و خرچہ کی آخری نشانی کی وفات پر چین کرتی۔ یہ وہی تھی تو بھلا کی تھی۔ جو اس نے بچا ہے اور وہ نکلاتے سر کے ساتھ سب کے سامنے مارا کیا چھٹا کر دیا۔

وہ سمجھ بھی نہ پاتی کہ ولید بھائی نے اپنا کاکر آکھیں کیوں پھیر لیں۔ اور تائی اماں کو اس کی وفات میں ہر طرح کا بیزاری کیوں نظر آئے لگا۔ حالانکہ ابھی پلایا کی زندگی میں وہ ان کی زندگی کا مرکز تھی۔

وقت انسان کو بہت جلدی مستیہ پڑھتا ہے شاید اسی لیے پھولوں میں بکھرے ہوئے لڑکیاں کانٹوں کے چیمے پر بھی پڑا دیا نہیں جاتی۔

”ماں! تم اسے لینے آئے تھی اس میں اتنی تھی کہ ساری رام کمانی سنانے کے بجائے اس نے محبت بھری مندرت کر لی۔“

”کوئی بات نہیں۔ ماں! یہاں تو کمر مہ پانے ہیں اور یہ گھر ہے اور یہ بھی تو سنا تھی میں رہتی ہے۔ یہ ہر وقت خیریت معلوم کرنے آتی رہتی ہے۔ ہاں جب بھی دل کھیر لیا آپ کے پاس ضرور آؤں گی۔“

دور نشست۔ دینی ممبئی کی آنکھوں کی نفرت پلکیں پھینک کر ٹائٹی رہی۔

”لو کیا خاندان بھری نظریں پھینکا۔ سرگشتہ اور زکی بدتمیز ہوئے کی شرت باجی تھی۔“

ان کی دواؤں کے اس طرف کو بھی دیکھو اس وقت اگر بار ہوئے تھے۔ جب ابھی وہ بہت چھوٹی چھٹی تھیں۔

”انکل! ٹرانسفر ہوئے ان کے شہر میں آئے تو اس نئی جگہ پر نہ ان کا دل لگتا تھا نہ انہی کا۔ یہ بیانی تھے کہ جن کی وجہ سے انہیں شہر میں لایا گیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بیلا کی ماں مرض الموت میں مبتلا ہوئی تھیں۔ اس کی لوگوں نے زندگی کے آخری ایام میں ان کی خدمت کی۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بیلا کو اس حالت میں روکھا تھا۔“

شام کو آسویہ سڑک کے لیے لائ میں دوڑتے تو وہ ساتھ دوڑتی۔ وہ دن بھر کی رپورٹ سنانے لگی تو بے چین رہتی۔ کاج کے تے کو سستی کی باتیں ہے وقت کو سستی کی منافقتیں پھر وہ برآمدے میں آکر بیٹھ پونچھنے لگتے تو وہ بڑی شاندار پاسے بنالائی۔

”کوئی۔“ چائے کی بیانی ہاتھ میں تھا۔ وہ وہیں دیوار کے نیچے آکر چلائی۔

کو سستی اسٹیل پر چڑھ کر دواؤں پر لنگ جاتی۔ وہ جاتی تھی ایسا ہی ایک اسٹیل دیوار کے دوسری طرف انہی مقاصد کے لیے کھلے سے موجود تھا۔ وہ دیوار اسٹیل کی پھل کر اسٹیل پر اور اسٹیل سے زمین پر آ جاتی۔

”ٹرس میں پیشہ بین پالیں موجود رہیں۔“

”ماں! وہ بد دوست کرنا۔“ خالی چائے انکل۔ ”وہ چلائی۔“ کیا اس نظر چائے کے لیے آپ مجھے آوازیں دے رہے تھے۔“

”تم بہت مٹی ہو رہی ہو گشتی اماں۔“ ہے ہیں لیکن میں جان بوجھ کر چھوڑ آئی

ہوں۔" بیلا اتر آئی۔
بیلا اپنی ساری ایکس راز بھول کر اپنی پلٹ میں گوشتی کے چمپا کلائے پکوڑے بھر لیسے۔ وہ دونوں شرط لگا کر کھاتے اور بانے ان میں سے جیسا کون تھا۔ پھر شام کو بیلا اور جو کر اپنی بڑی کیونٹی کے ساتھ کلب نکل جاتے۔
مئی کے انتقال کے بعد بیلا کو گوشتی کے گھر سے آگے کہیں جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ وہ بیلا کے آگے سے پہلے پوری شام بیڈ منشن ٹیبل کر گزارتیں کہ گوشتی نے ان پھر زیادہ کیلوریز لے لی تھیں۔
بیلا کے ساتھ بیلا کا کپڑا بھی شام بھر کا ساتھ ہوتا لیکن اس رات بھر ساتھ میں بھی کوئی چیز اور صوری نہیں رہ جاتی تھی۔

پھر وہ اور گوشتی ہوتیں۔ سو شرطیں لگا کر کلب میں بڑھتی۔
نئی ترکیبیں باورچی خانے میں تختہ مشق بنیں۔ مئی کہ رحیم چاہا چاہا آجائے۔ ان کے خیال میں اپنی اچھی لڑکیوں میں بیلا بیلا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ مئی وہ کوئی نئی چیز بنا تھیں۔ اس ان تیار ورجی فائنڈ برتوں سے اور کوڑے کی کوڑی سبزوں کی انزب سے بھر جاتی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بڑھتی چلا تھیں لیکن ہمیشہ ایک آہنی کی سرورہ جاتی۔ بھی کارن طور ڈالنا یاد نہ رہتا۔ بھی سبز میں بچہ چل پھل کر بھرتی بن جاتا۔

ٹی وی کی۔ یہ بڑھ رہے۔ وہ بڑھتی۔ بھی کٹن پیٹ میں فحش کر بیٹھے لیکن بہت اچھا لگا۔
بیلا رات گئے آتے۔ بھی بڑھ رہے اور اس کے جھیلے ساتھ نہیں لاتے تھے۔ سوائے بیلا صاحب کے گھر میں کسی کا آنا نہیں تھا۔ لیکن گھر میں کسی عورت کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ باہر کے لوگوں کی گھر میں آمد رفت کو ان کے جگہ بچہ بچہ رہنے سے خوف زدہ ہوتے تھے۔
دراصل اپنی ذات رہنے ان کا اعتبار اٹھتا جا رہا تھا۔ وہ شاید بیلا کو کھانا پروا نہ تھی۔ وہ لوگ سرکھ کھا کر ان کے گھر میں چلی جاتیں کیا آہیں والے کمرے میں رہتے۔
انہوں نے کسی گئے کی بھرپور ہاں عائد نہیں کی تھیں۔ لیکن بیلا سمجھتی تھی کہ بیلا کے پسند کر س گئے۔ گوشتی دندنا رہتی ہوئی بیڈ میں بار کرتی جا رہی تھی۔ بیلا جانتے تھے وہ بیچتی چلائی رہے گی۔ اسی لیے ان کو کائنات سمیٹ کر بین ہوئے۔ میں انکار اس کی طرف متوجہ ہو چلا۔

"آخر آپ لوگ کتنا پیار لمانا چاہتے ہیں؟"
"دیکھو ٹی بی۔" وہ دریا سے سمجھاتے۔ "پیر کمانے کے لیے کوئی مارگٹ نہیں ہوتا۔ آپ کسی بزنس میں کوہ نہیں سمجھاتے کہ آپ کا بزنس یہ ہے۔ بس اتنا پیار آپ کو لمانا ہے۔"
"اگر ہم لوگ بیچہ دن کے لیے میرا سر کھانا چھوڑ دو تو میں بہت بڑے راجیکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ اتنے اہم اور اچھے راجیکٹ پر کہ۔ اور یہ بلا کماں گئی جو تم میرا سر کھانے آگئی ہو۔" وہ درمیان سے اتر کر جھنجھکتے۔
"کچھ نہیں۔ صرف ایک تقریبی کئی تھی۔"

پھر اس دن آخر میں انہوں نے ڈاکٹر ثار کو فون کر کے بلایا۔ وہ ایک مدت سے بیلا کے دوست تھے۔ اور جب آجائے تو کھر بھر کا جنرل جیک اپ ان کے وہ ہوتا تھی کہ وہ گوشتی کے ابو گوشتی بری نہیں کرتے تھے۔



وہ نیچے آکر بہت غصا ہوتے۔

انہوں نے بیلا کو الگ بھارا۔ "میں باب کا ٹکٹ بیچتی تھی سب کچھ بند کر دو ایک دم۔"
اس نے کیس میں جاتے جاتے پہلی مرتبہ اپنے باب کا چروا ترا ترا کھا۔
"بیلا۔ انکل بشارت کس بات پر ناراض ہو رہے تھے؟"
"انکل بشارت ناراض ہونے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں بیلا بشارت کو میڈیکل کی ڈگری کوڑے کے ڈیس سے بڑی ملی تھی۔ پہلے اس کا نام کچھ اور تھا ڈگری مل جانے پر بدل لیا ہے۔"
وہ بیلا کی بشارت بھری طبیعت سے آگاہ تھی۔ لیکن پتا نہیں تھیں اسے ٹک سا ہوا۔ وہ ایسے ہی غلطی نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بعض چیزوں پر ٹک کا فائدہ نہیں شہید نقصان پہنچاتا ہے۔
اس لیے اگر وہ اس وقت بیلا کی منتقلی کے دھوکے میں نہ آتی تو شاید نقصان نہ اٹھاتی۔
میں صاحب بولا گئے ہوتے تھے کہ تو دنیا اسے اپنے کاموں میں بھی بیلا گوشتی کیس میں تھی۔ گوشتی کے ابو اس تھے۔ اور اباں بوس میں بیٹے ملائے گئے تھے۔
بیلا اسے بونے طوفان کا آہنی نرم مزاجی سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کیس سے واپس آئی تو تکی در ٹک اس نے سفید چادر اوڑھے بیلا کو بیچانے سے انکار کر دیا۔ اسے لگا اس کی بصارت کچھ ہو رہی ہے۔
زین آسمان لکڑی کر چہرہ ہے ہوں۔



"میں برف کی کام چور اور کال ہو۔" گوشتی دوارے اسٹول کے سہارے بیلا جگہ مار کر اتری۔
"میں بیلا تھا۔" مہینس پر حال میں کیس جانا ہے۔ ابو چلے گئے ہیں۔ ساری سچ وہ بارن بجائے رہے۔
خود تو جاکو سوں سے دیکھنے کا بیٹھے خواہ خواہ خوار کر دی۔ رحیم چاہا۔ تاشا۔
وہ کرسی سمیٹ کر میر جاتی۔

بیلا جاتی تھی وہ کیوں پلائی ہے۔ کیوں بار بار فیس میں آجاتی ہے۔
صرف اس لیے کہ گھر میں بڑے اس جمود اور سناٹے کو توڑ دے۔ ہم آگے ہیں بند کر کے بھی تو آسانی سے مسائل سے بھاگ لیتے ہیں۔ وہ یہ تاثر دنا چاہتی ہے کہ اس گھر سے ایسا کوئی شخص غائب نہیں ہوا۔ جس کے بغیر یہ دنیا جڑ جڑ ہو جائے۔
"اگر آج کا پیر مرس کیا تو کل سے میں تمہارا انتظار نہیں کروں گی۔" وہ کسی بے ضرری چیز کو لکھ لکھتی۔ سناٹے میں ارتعاش پیدا ہوتا۔
لیکن یہ بہت عارضی بہت متوقعی ہوتا۔ حقیقت آگے نہیں پھاڑے ایسے نظریں کھڑے والوں کو گرفت میں لینے کی بھڑک رہی تھی۔
کیا اس طوفان بد نظری سے بیلا میں مل جاتی ہیں؟
حقیقت چھب چلی ہے؟

گوشتی کا خیال تھا وہ جاکو میں مار کر روئے گی۔ سبے ہوش ہو جائے گی اور شاید اس صدمے کو سہارنے کے لیے زندہ بھی نہ رہ سکے۔
لیکن اس نے جس استقلال اور جرات سے اس مصیبت کا سامنا کیا اسے گوشتی کو کھلا دیا۔
اس سے تو اچھا تھا وہ سیدہ کوئی کٹی بیل نہیں اور جاکو کی طرح بیلا نہیں کرتی۔ لیکن یوں



کی منزل چرپی کیتی جسے واس کے پلار سے ہائے گئے چھینے والے نچے۔

پاں راست کی تاریکی اس کی باقی تھی۔
وہ ابھی اس کوئی کھول پتی۔ درختوں کے نیچے اپنا سر مڑا رہی، گستاخ کیلئے جان بھر لیک غم فکر سے بے نیاز
ایسے سے ہنسنے لگا، وہ اب اپنے بھائیوں سے بے نیاز ہو کر سوچ رہی تھی ابھی اس کی پسینوں میں بھر کے
لڑکائی کی دیکھنے والوں کے لیے صرف ایک چمکا گولا ہی تھا، نیو نیواری جھانپتیں اس کی آنکھوں میں گھسکیں تو
نہیں لڑکھائی، دنیا کے سامنے اس کے کھڑے بھی نہیں کھڑے تھے۔

جس کے چہرے پر جیسے یہاں مستقبل اس کا چہرہ کھڑا تھا۔
بھانک اور کھانا چل اور سناؤ پیش ہوں جانے یہ تو وقت کی آنکھیں بھی ناب نہیں سکتی تھیں۔ وہ
جن لوگوں کو جانتی تھی ان پر ہوسہ کرنے کا درس دینا ہے اسے نہیں دیا تھا۔ وہ خاموش جا رہی تھی پر بڑی
چست پر آنکھیں گاڑے اندکی کے مختلف پانچ باتی رہتی تھیں۔
رات بھر جیسے کشادہ اور سب آسمان زمین اور محل و محلہ کرکھ جائیں۔

وہ لوحِ حق و تائیدِ مہر و شہادتِ یقین تھی۔ ماری مجبوراً محرماتِ عیال، ایک جھنگ سے بستر میں
بچاؤ کی پہلی ہوجاتی۔
وہ ہر آن تو غنائیں بچے سحرانِ مختلف کمرؤں سے بے زار تصور تھیں۔ نہ انے اوسر سے کوہِ غم جو تھے
نظر آتے۔

”کیسی نہ ان ماری لوں کی بھی تھی۔ ارچہ کو کٹر مکرور دیکھتی ہے۔ کمرے میں پھول جھانکا اچھا رہتا ہے۔ پھر لوگ قتل کھاتے کھاتے دعوت دینے لگے۔“

وہ کپڑا خست ہوتی، مہمان خاتون سے اصرار کرتی۔
 ”نہ تو لکھا تھا کہ چاہا۔“ وہ ایک رکابی سے نڈھال کھینچ کر کھینچ چڑھتی گئیں۔
 ”نہ تو جتنی ہو بھی تیس ساٹھ لے جانے میں شاید ہمارا کوئی فائدہ ہے، بہنو بابا اور اصرار کی وجہ سے کہتے ہیں۔ ایک سو دھکے۔“

اسے ان کے غافلوں پر کوئی شہ نہیں تھا لیکن وہ اس گھر کو چھوڑ کر بھی نہیں سکی تھی۔ اس وقت تو اس کو کم از کم ایسا ہی لگتا تھا۔ وہ ان کی بار بار پھر مہربانوں کا جواب دیتی تھی۔

جانتے آتے ہیں ایسا لگتا تھا جیسے لوگ کے گئے ہیں۔ ان کی آنکھیں ان کی زبان کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ یہ سب بولتے ہیں کہ تم انہیں جھکا لیتے ہیں اور جب انہیں کھولتے ہیں تو منہ بند کر لیتے ہیں۔

چچو اور اصرار وہ بڑی تھیں تو انہیں اس کا بھیہم اور کھٹک نہیں۔

”ابا کہہ رہی تھیں یہی تھمارا۔“ کہیں ساتھی ملے جانے کو کہہ رہی ہو گی کیا؟ — نمبر۔“
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حال کے بچے نے شیشے کی آرائشی سیڑیہ اڑا کر کیا کھانکھانکھان پڑا ہوا تھا۔ وہ
چپ چاپ بیٹھ گیا۔ شیشے کی گڑبان کر کے پٹکانے لگا۔

سورہ شمس کی تفسیر میں یہ آیت مذکور ہے کہ "وہ جو پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہے، وہ دیکھ نہیں سکتا۔" اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ "وہ جو پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہے، وہ دیکھ نہیں سکتا۔" اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ "وہ جو پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہے، وہ دیکھ نہیں سکتا۔"

خاموش رہ کر اپنے سینہ میں نہ کرتی۔
وہ بچھوری نہیں تھی۔ اسے دکھ اور افسوس نہیں تھا اور وہ ہلک مٹی بھی نہیں تھی۔

اسی گئیے اس نے خام اور معمولی کالوں کی طرح اپنے اب کے مدمے کو کوچی طائر میں منایا۔
نہی اس نے کالوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ باپ کی موت نے اس کو ہران کر دیا ہے نہ ہی
اس کو کالوں کی مجبوری کی ذرات چاہیے تھی اس کو خیرات میں ملے ایسے کسی کھنڈے کی ضرورت نہیں
تھی جس پر سرور کر دے کہ وہ آئندہ نہا سکے۔

پھر بین کرنے لوں دھوئے سے اسے مٹا بھی کیا۔ سوائے ترس کھاتی تماشادہ بھی نظروں کے جھنکی
ہندوئی زور کھے واسوں یکے۔

باب تھا تو وہ بالکل بچی تھا۔ باب نہ رہا تو وہ خوباب بن گئی۔
 باب نے اسے کس سمیت بچہ کھ کے سامنے لا کر کیا تھا۔ وہ لاڈلی تھی۔ اس کے حصے کے سارے
 دیکھو خود جیسے کرا کر ایک برسوں تک بھری بھولی ہوئی تو کسی اس کے لیے لے آتے تھے۔

وہ صابر آدمی قبول کرتے تھے۔ ہمدرد آدمی کی طرح اسٹیج پر آتے تھے۔ وہ باہم اور پر استقلال آدمی کی ایک جگہ کرتے تھے۔

ان کے ملک میں تو یہ ہے۔ قدم قدم پر اس کی راہ میں بکھرے۔ اس نے سکون سے ایک ایک غلاف اپنے چوڑے چڑھا لیا۔ وہ کسی بن گئی تھی اور اوپر تمکنت۔ جس دن سے وہ کیا کندھوں پر اٹھا کر لے گئے تھے۔ پھر رنگ رنگے لوگوں سے بکھریا۔ خاک کی مرتبہ۔ گوش کے اپنے مہمانوں کے درمیان بد اخلاقت کی۔ کئی مرتبہ کئی ہی قیلولہ پر ان کے بے سہانتہ ٹوکا۔ بھانت بھانت کی عورتیں پاکستان بھر سے اکٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن بڑی مہارت سے ایک ایک کو سنبھال رہی تھی۔

یہ بھی ایک راز ہے کہ قحطی و ہزینات سے تباہی اور قتل کے اوصاف سیکھ رہی تھی۔
وہ غمناک خاموشی اور بربادی سے گھر میں خوش سینکڑوں عورتوں کی بھانجرتیاں سننے والی تھی۔
ناز و ارباب کرتی رہی۔ وہ جیسے سب کی سب کی دلکش آئی تھیں۔

کونسی کو بڑھیا کو نے میں کو نہ لیے ہیں جس لیے سفر سے اس کا کہنا اڑ گیا تھا۔
 کسی کو کہیں کی پرانی شکایت تھی اس کو بار بار پیش کردہ نسخوں کو دیکھ کر غور کا کر خوراک سپیا کئی
 دن پہلے پا لیا اور ریح چاہا اسے چاہتے چلے آؤں گے جس سے تھکے۔

کسی کا اناڑہ ناشتے میں فراہم کیا جاتا ہے۔ کسی کا کمر چلتا ہے۔
 سچو لوگوں کو ناشتا اسے کمرے میں کرنے کی اجازت تھی۔ کچھ لان میں کرتے۔ کوئی ٹرائل کھینچتا تھا۔ کوئی
 کھانے کے کمرے میں آتا۔

”ہر تو بخس کی بات کہانی کا گھر سمجھ کر آ گئے تھے۔“

وہ نعل سے ایک ایک کی شکایت سنتی۔ بہت زور سے: "اور ریم چاچا کو متویہ کرتی۔ ان سب

[illegible]

آپ نے خاموشی سے بکھرے بہن سمیٹ لیے۔ یہ جھڑا ب طول پڑ جائے گا چاہا رحیم کو بار بار ماکو
تجارت خانہ ان کا کس نہیں جیتا تھا وہ نہ ڈوٹی اٹھا کر وہ ب رشتہ داروں کو جیتا کرتا ہے۔ دقوں و ققوں
سے ان کو بھی جھٹھا کرنا پڑتا تھا۔

جی بات یہ بھی گنتی کہ بھڑا پر اشور مچا پٹا بنائے کر رہے گھر سے بھی اچھا لگے لکھا تھا۔ کان بچا جیتی آوازیں
جہانی کے خوفناک بھوتوں سے ہزاروں رچے بھرتہ ہوئی ہیں۔

کمریوں کے علاوہ لازقہ میں ہزاروں نکروں میں وہ جمال سے گزرنے لگیں تو ان کے سامانوں سے بھری مینیں۔ حالانکہ وہ جتنی بھی انیس ایک دن جانا ہے لیکن یہی اکیلے پن کا خوف بھجھتا ان کا رزہ کھتر تو گرا سے بڑھ جاتا ہے کی کو شش کرتا۔

کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا جانا اس حساب کتاب میں بڑے گا۔

مالی اماں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے چور کا وسواں بڑے تزک و احتشام سے کریں گی۔ ارے یہی خاندان کا وہ آخری جزا غناور مرحوم نے قسمت سے اولاد نہ رہے بھی نہیں چھوڑاں جو اس کی نام لیا ہوئی

اور اتنا بڑی جہالت ہو گئی کہ اس نے کہا کہ میں نے اپنے دل سے یہ بات نکالی ہے۔

میں نے کہا: لیکن گمشدگی کے اسے فحش کر کے رہتے تھے۔ یہ ہنگامہ غرضی ہے آخر وہ چلے جائیں گے اور مسمانوں کو رہنا اور رہنا ہی رہتا ہے۔

وہ سب کو کھانا شام تک چلا۔ آئی ایل شامیہ نے کہے: پس کبریا تجھ رکھد ایات برقار ہیں۔

اور شاہد کی منطوقیہ کو لے کر کچھ جھگڑا ہوا۔ ایک مہمان کے ساتھ سے ڈور جھٹوت مچی۔

وہ زہر ممان و فرمائش پر کافی پوچھیٹ رہی تھی۔ گویا کہ ان کے بقول رحیم چاہا کافی اچھی نہیں بناتے

تھیں اور آج کے مجسمے ایک ایک آدمی کو تھکا کر چھوڑ گیا تھا وہ زوالی تحسین برتن لگا کر ملائی و ناس
شورو غل میں نکل پڑی اور اسٹانیفیل میں دے رہی تھی۔ بہت دیر بعد اسے کچھ خدا کے احکامات اور کچھ
شریعت کے قاعدے سنائے۔ ابھی کچھ آستان کے قاتلین کو لفظ بھی سنائی دیتا رہا۔
آستان بڑا بڑا کر تھیں اپنا کوٹھڑی میں جا بیٹھیں۔

میں اس وراثت کا قانون زیر بحث تھا۔ جو کہ وہابیوں کی فریاد بنوادی نہیں تھی۔ لہذا ان کے پاس اعتراض

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق جو تھا اپنی حصہ آغا علی اپنی حصہ وراثتیں تقسیم ہونا چاہیے ورنہ نہ اسے فیصلوں کی تعمیری کو کہنے والوں کو جو قسم حاصل کر رہا ہے۔

یہ ایک قیامت کی گھڑی تھی۔ اس میں بڑے کلمے آن پڑنے، مذہب، غیر مذہب، ایک ہی قطاریں
کھڑے ایک ہی جیسے لگ رہے تھے۔ کیا یہ گھڑی ان کے لیے تمام ثابت ہوا۔

ان میں سے کوئی بھی بیباکے گئے تھے نہ کسی کے ابی کچھ فائدہ دینے کے رشتے دار تھے، کچھ کم دے رکھے، اب ان کو یہ بات ثابت رہا تھی کہ وہ بیباکے گئے تھے کم سے کم دے رکھے تھے۔

وہ ناموش ایک طرف کوئے میں تپائی پر بیٹھی اس حشر کو سمجھتا دیکھنے کی منتظر تھی۔ کہ دروازے پر زور ہے بیل ہوئی۔

اس وردی بوسہ کے نے جوشیاری اس گھر میں آتھا، نور درمحل کی۔
 لہجہ ہر کے بے میل کی اس شدت نے سب کو لادیا۔ جوشیاری شاموش ہو گیا۔ ہاں کہ جوشیاری

یہ زمانا تھا۔
پہلے رنگ کے سبز پیشانی والے بدلتی کانٹوں اور سہول والے سڑک کے ساتھ اور پھر بہت سے گاڑے

یہاں تک کہ وہ چونکہ سب ایک ہی جگہ تھے لہذا الزامہ ممانوں کے عین درمیان کیوں اٹھایا۔

وہ تو دلائل بھی۔ لیکن مہمانوں کی کوئی اتنا احق نہیں تھا۔ وہ تھک کر رہ گئے۔ بڑا سردار

ہو گئے۔^{۱۲} مئی ہڈی بات اور ام سے چوہا گرد شہر گئی۔
 "ہمارا مذاق رہنا باکیا۔ ہم سے اچھا رونا کایا وا۔"

”آخر کیا ہوا؟“ لکھنا ہے؟ ”چیز کیسے؟“ وہ ہر ایک سے پوچھتی۔
”اُسے یہ تو سنیں کہ جیسے جانتی ہیں۔“

"اے تمہارے باپا ساری جانیں دینے کے لئے فرشتہ کر چکے ہیں۔ اور اب تو یہ گھر بھی تمہارا نہیں رہے گا۔ خالہ! خالہ! میرے لئے دعا کرو اور اے بھونر!"

”ہلو چپ کو جسے دیکھنے دو۔“ (لغافہ) اتنی مرتبہ تغزل میں بکھو جیسے کسی سخی نازب کی مغل میں

اور وہ جیست، تھپت کرانہ پڑ کر یوسید کیے کاغذ کافی زالی کے پس چرمزے رو گئے اب

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ نے غلطی رہا ہے، تیار ہو جائیے۔“
وہ انہوں کی مشکلیں ادا نہ کر سکا، ابھی ایک ایک کو پکڑ رہا تھا۔

معلوم نہیں کیسے اطلاع اڑتی اڑتی گوشہ کے ابو تک پہنچی وہ سارے کام چھوڑ کر بے جھجک ان کی منی
مطل میں آگئے۔

”ڈراما میں یہ کاغذات دیکھ سکتا ہوں؟ دراصل ان کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں تھی۔“

”انگل جیمز انکل جیمز۔“

وہ ایل کی لکٹ آنکھوں میں چھپائے ایک تکیہ ان کی صورت دیکھتی رہی۔
انگل جیمز نے چہرہ صاف کر کے لگانے اور کلفڈات پر ہنسنے میں پہنچی وہ لگائی وہ لمحہ بھر بل صراط پر
گرتی اور ہنسنے لگی۔ انہوں نے ایک لفڈے کے بغیر کاغذات مزید گرا دیے۔
وہ ساکت رہ گئی۔ اس کے ارد گرد سے دو ادریں سرک لگیں۔

”میں شق ہو گئی۔ آسمان میں گئے۔“

وہ خلاؤں میں نابود سارے کو بتاتا تھا تپاؤں مار رہی تھی۔

”پاپا اتنی بڑی بات مجھ سے پچھانیس لکھتے یہ ضرور کوئی جھوٹا ہے۔ کوئی خلا نہیں ہے۔“
وہ اپنے کمرے سے ایک دم فگھے گئی۔ وہ اتنی کمزور نہیں تھی لیکن بند ہوتی کھلی آنکھوں سے
جب بھی اس نے دیکھا لوگ اس کے گرد جمع ہوتے۔

پھر باری باری بلبل ہٹنے لگے۔

”مجھے تو پیش نمازت دو۔“ قہقہہ کے مٹان نزدیک ہیں۔ وہ تو میں مشکل سے چھٹی لے کر آئی
تھی۔ ”آئی اے نے گوشت میں رکھا اس کا سرا حقیقت سے واپس کیے پر رکھ دیا۔“ پھر ان شاء اللہ امتحانوں کے
بعد دوبارہ آؤں گی۔ اور دیکھو میں کسے دیکھوں اب تم میرے ساتھ رہو گی۔“
لیکن وہ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہریں۔ پھر کوئی پیشی القلب ہوتا ہے۔ کون جانے کب اس کی محبت
جوش میں آئے اور وہ اٹھ کر چل پڑی۔ وہ سوئی بہاؤ کاغذ کاغذ تار تار تھ۔
”وصان رکھنا اس بلک۔“ وہ سہانے پیشی کوچی گورائیں جاری کر رہی۔

”اس کی غیبت تھیک نہیں دو وہ پلٹا۔“ یعنی دیتے رہنا۔ میرا تو اپنی جی اس میں لگا رہے گا۔“ خلد نے
رفتہ سے کہہ۔

”وہ ڈان کی بیماری کی اطلاع۔“ آئی ہوئی تو میں ایسے سے غلی جاتی۔ اور دیکھو خط لکھو اتنی ریسو دوسرے
تیسرے وقت۔“ پھر ان کی رات کا خاصہ دور ہو آگ چنی لے جانے کی ٹھانی۔

ان کے کہانے داروں نے پھر تک کرنا شروع کر رکھا تھا۔ مگر میں لڑکیاں ایللی ہیں۔ کوئی ایسی کسی بات نہ
ہو جائے۔

اور پچھلے کے ساتھ بھلائی ہو کہ ان کا ترسنے پہلے اطلاع ہو گئی۔
ان کے کہانے عزت کا برا نہیں بلکہ خط آیا تھا۔ جس میں اس کی محبت اور ستم کی تفصیلات لکھی تھیں
اور یہ بھی کہ تمہارے پیالے جانے کیا سوچ کر اتنی بڑی غلطی کی کہ اب تم گھر سے نہ ٹھکانا۔ نہ کمانی کا کوئی
ذریعہ۔ چاہیں تم میرے جیوگی؟ میرے پاس ایک کپڑا ہے لیکن اس میں آج کل ایک میرے سرلی عزیز
ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے رخصت ہوتے ہی میں تمہیں لکھ کر لوں گی۔

وہ پتا نہیں کہ دن بیتی رہی اور کتنے دن سوئی رہی۔
لیکن جہاں اٹھی تو اس کا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ تھی اماں خالی ہاتھ دامن بھانڈا کر رہ گئی۔

بشارت آنکل جیمز گرجی آیا ایل۔

وہ آنکھیں بند کر کے ایک ایک کی شکل دیکھتی۔

”گوشہ۔“ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے مذاق کیا ہے۔ کاغذ چھوٹے ہیں۔“

”لیکن میں تمہارے ساتھ جھپٹ نہیں پوچھوں گی بھاب۔“ وہ چار سے سمجھاتی۔ ”وکیل صاحب منیجر
صاحب نے ان کاغذوں کو بچا لیا۔“ وہ لکھ لیا نے سب کچھ اپنے پادشہ کو دیا ہے۔ سوچنے والی بات
صرف یہ ہے کہ کیا کیوں ہوا ہے؟ یہ زندگی بے کوئی کہانی نہیں۔“

”زندگی تو کہانیوں سے بھی گلی گزرتی ہوتی ہے۔“
پھر جی مرتبہ آنکل جیمز کے مرتبہ منیجر صاحب آگئے۔ کتن مرتبہ وکیل صاحب کے ماتھے گھری
پٹا لٹھ ہوتی۔ چوں کی لٹھ ہوتی۔ کتنی مرتبہ پوروی کھنگو اس کے کتوں میں پڑتی۔
وہ سب لوگ ایک دوسرے سے آگے ہیں چراتے تھے۔ وکیل صاحب خاموشی سے قائل اس کے
سامنے پھیلا دیتے۔

”اس کو علی کر کے سٹخا کروں۔“

وہ مٹا کی انداز میں قائل کے کھوئی مطلبہ جیک کھنگاتی اور سٹخا ٹوٹ کر پڑتی۔

”اس گری میں بیٹے میں جانے کہہ رہے ہیں۔ تمہی چلو گلی کھرا تو آجانا۔“ وہ مسکراتی رہتی۔
پھر منیجر صاحب آگئے وہ آگئے دیکھتے نہیں تھے جیسے وہ پیشہ اس کے پیالے کے سامنے دوپ رہتے
تھے۔ ایسی اہمیت سے وہ اس کو عدالت کے کاغذات دیکھتے رہتے۔

ان سب نے اتفاق فیصلہ کیا تھا کہ انکل کے اس فیصلے کو عدالت میں چیلنج کیا جائے گا۔ اسی طرح ج اور
جھپٹ سامنے آئے گا۔ کیا بھی جاتی تھی سب کچھ اس طرح کھٹکے گا۔ لیکن کب کھٹکے گا؟

”اس مہینے کے آخری ختے میں میں یہ کہہ خالی کرنا ہے۔“ منیجر صاحب ڈرتے ڈرتے کہتے
اور سب تک۔ جوت ری نہیں کھلا جانا، وہ کہاں جا چکے۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ وہ خوش نظمی سے مسکراؤ گئی۔

”اور کیا۔“ وہ جیتے چلے پلٹ آگئے۔ ”روا آپ کو پھر ری غلی بی بی، ان کہہ رہی تھی پیالے کی زندگی میں تو
آپ کبھی ایسی جاتی تھیں۔ اب تو بالکل ہی آچھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے مجھے کہا تھا میں آپ کو ساتھ لے
کر آؤں۔“

”میں ضرور آؤں گی کسی دن منیجر صاحب۔ لیکن ابھی نہیں۔“

پھر کاغذ بشارت اس کے چیک آپ کے لیے آئے نہ ہری کھاس پر وسیع آسمان کے پس منظر میں بھی
دل شکستہ سی دکھائی دیتی۔ لیکن وہ جلد ہی سے مسکراؤ گئی۔

”اب میں بالکل تھیک ہوں آنکل بشارت۔“ وہ جلد ہی سے کہتی تھی۔

”اگر تھیک ہو تو یہ میں جانا شروع کرو۔“ وہ اس کا پیالے چیک کرتے۔

”لیکن یہ اہم ہے۔“ وہ کانوں سے اشارت کو آپ آ رہے تھے کہ کیس میں میں سے بہت دور ہے۔

ایسا کرو ہم ہمارے طرف شفت ہو چوہ علی کے پاس بانگ ہے آئے جانے میں مولت رہے گی۔ پھر
کب چوہ۔“

ہاں اب میں نے کا آخر۔ یہی آخری تاریخ ہے۔

پھر وہ جی جان سے اٹھ گئی۔ یہ گھر رخصت ہو گیا تھا لیکن اس گھر کے جھپٹ باقی تھے۔

سے سڑست اپنا ضروری سامان پیک کر کے لڑا ہوا۔ یہ ایک اہم چیزیں سنبھالنا تھیں اور باقی چیزوں کو
15

کسی نہ کسی طرح سے ڈھونڈ کر لیا تھا۔
وہ مسکرائی، وہی ایک ایک مسئلے سے علیحدہ علیحدہ غمگینی رہی۔
سب سے پہلے اس نے پاپا کے کمرے کے سامنے کی طرف توجہ دی۔ اسے اپنی یادوں کی ایک فاصلہ بنانی
تھی جس میں سب سے پہلے اسے پاپا کی یادوں کو سنبھالنا تھا۔
پاپا کی دھاری میں مٹی کی ضرورت کی بہت سی چیزیں سمیت بیٹھ کر رکھی تھیں۔ ان کی کچھ چیزیں
تھیں شادی کا وہ پتہ تھا۔ استعمال شدہ صندیں تھا، پھولی سی ڈائری اور پتھر تھا۔
اس نے پاپا کی چیزیں دکھائیں۔ ان میں سے کچھ بھی اس کے لیے اتنی ہی تھیں پاپا کی پائپ "ان کی پسند
کے تمباکو" ان کے تیس شوز، ان کا کاج ٹکڑی۔
ہر چیز ایک مددگار کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ یہ یہ مال، یہ مٹی وہ فاصلہ سوٹ کے ساتھ پہنتے تھے یہ
جوتے ان کے پسندیدہ تھے۔ پاپا ان کی پسندیدہ شہ گنتی تھی۔
یہ ان کی دائری تھی اور وہ ان کا قرآن۔
اور اس شرافت میں سب ان کی پسندیدہ کتابیں تھیں۔
وہ کون سی چیز خزانہ کرے اور کس چیز کو ساتھ لے جائے۔ یہاں تو ایک شے قیمتی تھی۔ جس کی وہ
کوٹ بھی بہ آخری دن تک وہ پہنے ہوئے تھے۔ وہ بے ساختگی میں اٹھی اور کوٹ سے لپٹ کر چھوٹ چھوٹ
کروٹے لگی۔
وہ برا ظالم تھا جس نے پاپا کا یہ گھر خرید لیا۔
لیکن کتنا مہربان تھا کہ اس کو یادوں کی اس سلسلہ الیت سے نجات دلا گیا۔ شاید پاپا کی غیر موجودگی میں
وہ اس گھر میں ایک گھر بھی نہیں رہ سکتی تھی۔
"میں دوری طور پر یہ گھر خالی کر کے اوجھڑا آجاتا چاہیے۔" غمگینی اس کو بہرہ لانا چھوڑا اور حقایق
بزرگانے لگی۔ "اس طرح تو ہم بہار پر جانو کی مہاراجہ کی یہ تعلیف مذاق نہیں۔"
"موسم گھبراہٹ خلی کرنے کی ضرورت نہیں۔" تو مکمل صاحب آئے۔ "جب تک عداوت کوئی
حقیقی فیصلہ نہ کرے۔ تب یہی سلمان ایک کمرے میں بند کر کے کالا ڈال دیجئے یہ تگاہوں کی موجودگی
میں گناہ است تو زمانا گونا" ہر دم ہو گا۔
وہ سب کہتے تھے اور اس کے بارے میں کس طرح سوچتے تھے۔ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو چکی
تھی۔ اسے یہ گھر خالی کرنا تھا اس کا یہی فرض ہے۔
مخ سے سب اس کا انتظار کرتے رہے۔ اور وہ اپنی گاڑی لے کر نیک کے کام نڈھانے چلی گئی۔ اس
کے گاڑی میں حیرت انگیز حد تک رقم موجود تھی۔ جو اس کو زندگی بھر چلانے کے لیے لائق نہ ہوئی لیکن
کسی ایک وقت تک جب تک وہ کسی کے حرم سے اس کو بوجھنے سے نجات داسکتی تھی۔
وہ مخ سے شام تک کام میں اس طرح جی رہی تھی جیسے کسی خوش آنند مہمان کے استقبال میں وہ گھر سجاتی
پھر رہی ہو۔
اس نے کتنے چرس فرودخت کوئی تھیں۔
بچہ چرس ڈکوں کو بخش دی تھیں۔ یا خیرات کر دیں۔
جب بھی خوش آتی وہ پانکوں کی طرح کام میں جی رہتی اس نے مدت سے کچھ کھانا منہا چھوڑا
تھا۔ شہ ماہو تائیں دو چرخیاں لگی۔ یہ بھی۔

تو مائیں کی اس تاریخی تک وہ اسی دن وہی سے کام میں لگی رہی۔ کچھ کو اس نے مالک کی آمد سے قبل
جی اس نے خاموشی سے گھر چھوڑا۔
وہ سب لوگ اس کے ارد گرد تھے۔ جو اس کے اپنے تھے۔ کبھی کبھی زندگی اتنی تلخ ہو جاتی ہے کہ آپ
کے اپنے اور رہاؤں کو علیحدہ علیحدہ نمایاں کر رہتی ہے۔
وہ سب کے سب باہر تھے اور چھوٹی لڑکی کی امت بندھانے کے لیے جی بھر کے ہنسنے مگر اتے تھے۔
اس گھر میں آخری دن ان سب نے مل کر منایا تھا۔ لیکن ایک سو سے سے ظہر پر چلتے چھوٹی چھوٹی
پائپیں کرتے جیسے کوئی بڑا واقعہ اس گھر میں نہیں ہونے والا۔
میں صاحب نے تاملے چیک کیے اور چپاں وکس صاحب کے حوالے کر دیں۔ انکل جشیہ کوڑوں
کھدووں میں کی ضروری چیز کے بہرہ جاسے کی لکڑی میں جھٹکا جاتے رہے۔
ڈاکٹر شرافت اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر بار آئے۔ کئی خوش فاقہ اسے سے خوفزدہ اس
کے ساتھ چل رہے تھے بھائیں بھائیں کرا خاموش سناٹے میں گھرا گھر پلینوں کو بڑی خاموشی سے دیکھتا
رہا۔
یہ گھر بھی کتنا خاموش سا ہے۔ گوشے دیکھ سے سوچا۔ ایک وقت تھا جب اس گھر نے پاپا کو مٹی بیاہ
کر لاتے دیکھا تھا۔ پھر اس گھر نے ایک دن بار کا پیمانہ بویا تھا۔ مٹی جب ہسپتال سے بلا کر لائی ہوئی
گی وہ دن اس چار دیواری کے لیے مسرت بھرا ہو گا۔ پھر اسی گھر سے وہ خاموشی سے رخصت ہو گئیں۔ اس
گھر نے پاپا کو بھی خاموشی سے جاتے دیکھا۔ گھر جو سب سے ظالم محبوب ہے۔ وہ کسی سے دل نہیں
لگا سکتا۔ تو ہم بھی ہیں۔ ہوائی ساری یادیں ساری تھیں۔ ایٹھ چنے کے اس گھر سے وابستہ کر لیتے ہیں۔
حالانکہ آئے والے زمانوں میں یہ گھر بے گناہ سرگم نہ یادیں نہ سمجھتیں۔
اس نے پاپا کو اس گھر کی طرف نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہاں تو انیس دے کر پتھر بنا دینے والا کوئی نہیں
تھا۔
اس کے قیام مشہور تھے اور سکون سے زمین پر اسی وقار اور تمکنت سے اٹھ رہے تھے۔ جو اس کے
پاپا کا خاصہ تھی۔ اس کے ہاتھ کے لگائے پودے تن آرزو رشت مہارو پتے پھولوں کے لگے ہوئی ہلی
چنبیس سے لہرائے لگے۔
"پاپا! خدا حافظ۔" اس نے دل میں پاپا کو جواب دیا۔
لیکن اس وقت بھی وہ نہایت خاموشی سے رجم چاچا کے ساتھ ان کے گھر کی طرف جا
رہی تھی۔

"اچھی جی۔" پاپا کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ان سرمان لوگوں کے پیار کا جواب کس طرح دے سکرے کے
چند بول رہیں اس کے منہ سے بھٹ کر نکل سکا اس کا گھار بڑھا ہوا تھا۔ رخصت کی یہ گھڑی آگاہ تھی اور
امتحان کی گھڑی ہوئی ہے۔ اس میں رہ جانے والا قیام تہذیب و شکست کھاتا ہے۔
ڈاکٹر شرافت انکل جشیہ گوشہ منیر صاحب کو تیل صاحب قہقہے لگاتے ہنسنے مسکراتے ایک قطار کی
مورت کا دل میں چلے۔ وہ ان کوئی کسی قصور و لاپرواہی کی بات ہوگی۔
رجیم چاچا۔ سب سے اہم اور مہتر آدمی کی طرح آگے۔ آگے آخری دن نے سب امیر کیرول پر اسے
چٹا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ "اس طرف سے موٹیلیٹائی۔ اس کے گھر کی۔"

اس کی آواز بلند اور مغرور تھی۔
 "بس جی۔ اس سے آگے کچھ نہیں گاڑی نہیں جا سکتی۔ ابھی دن رہی ہے سڑک ہو ٹھیک صاحب نے وعدہ کیا ہے۔"
 ڈون شب کی اس دروازہ کی کچی پستی میں رحیم چاچا کے یو پی سے رہتے تھے۔ کتنی ہی مدت پہلے وہ چلا کی فاداری میں سب بچہ بچہ لایا تھا۔ ابھی بھار میں ایک آدھ چکر لگا رہا تھا۔ "تب تب اسے تنخواہ پہنچانی ہوتی۔ اور تب ہی جب اس کو صاحب کی طرف سے بڑی بچوں کے لیے نئے کپڑے ملتے۔"
 "خدا کر رہی تھی یا کسی قسم کا گستاخی برا تر آتی تھی۔ شہید خواجہ کے بلو جو کسی نے اس کو کہاں رہنے پر ابھلا نہیں کہا۔"
 "بات ہے انکل۔ مجھے رحیم چاچا کے ساتھ کاٹا کھانے کی عادت رہی ہے اور رحیم چاچا اتنے عرصے سے اپنے گھر والوں سے الگ ہیں۔ اس لیے میں یہاں آگئی ہوں۔ اور ویسے مجھے آپ کے سہارے کی سخت ضرورت ہے۔ میں آپ سے رابطہ رکھتی رہوں گی۔"
 گوشتی کو شہید صمد پر پچھانوا اس کا ساتھ بڑی مصروفی گفتگو کر رہی تھی جیسے وہ بھی اس کی پیروی کر رہی تھی۔
 "مہمان خد طرہ ارات کے بعد زحمت کرو لے گئے۔"

کچے کے اس مکان میں جس کی دیواریں مٹی اور کھوکھلا تھیں۔ پوری طور پر جھاڑو بچھ کے بعد ایک دھوپ میں بڑی سی باتوں والی چابی ہوئے۔ ان تمام سے اس کے لیے ڈال دی گئی۔ چوٹی نے جلدی سے چوٹی پر سبز چادر اس پر بچائی۔ سہارے لگی رکھ پا سکتی۔ اڑھتے والے چادر کی شرمساری ملامت کی چابی کی پٹی پر لٹک گئی۔
 یہ ایک انکل بنی۔ جگہ تھی اور ان چھیل کا اس کو عادی ہونا تھا۔ اس کی سیاس کا بھی جو کھلی رہتی تھی اس کی سیاس کی طرح سارے گھر میں چھیلی تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی مٹی کا بھی جو ہر وقت جھڑتی تھی۔ اور ان تمام آؤں کا بھی جو اس سے کچی محبت کر رہے تھے۔
 بے ریا بے لاک مٹی کا جام کو سامنے رکھے بغیر کسی مطلب کے نہیں۔
 "مشرادوں کو جس نے یہ دن دکھائے خدا اس کو برباد کرے۔" چچی آسمان کی طرف سراٹھا کر بپا کر بدو تھیں۔ دینے لگیں۔ "اسے اس کو طائون کھائے۔ اس کی لاش کو گھسے۔ کراسیر۔"
 وہ بچی سے گھبرا کر گھڑی ہو گئی۔ چاک رحیم چاچا کا ہاتھ مناما گھر دو گول سے بھر گیا۔
 "کیوں جاہل عورتوں کی طرح تین ڈال رہی ہے۔ مٹی۔ بی بی چکی ہوئی تکی ہیں۔ انہیں آرام کرنے دے۔"
 رحیم چاچا نے دھڑلے سے دروازہ کھول کر سب چھری عورت کو ڈانٹا۔ چابی نے سسم کر تھوٹک کر لے۔
 وہ چاچا سے ہست ڈرتی تھیں۔

چاچا کے روانہ ہونے ہی کو راتوں کے چھینکھنے سے اسے گھیر لیا۔ اس کی آمد کی اطلاع اس کے آنے سے پہلے ہی کے کوئے کوئے میں پہنچ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے چابی پر بیٹھ کر بین کرتی رہتی چلائی۔
 راتوں سے ہندو دیال۔ سیتی رہی۔
 ان کو اس سے کوئی براہ راست دلچسپی نہیں تھی لیکن مظلوم پردی ساری کی ساری ان کی اپنی ہوتی ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو۔ بہت جلد جلا کو سمجھ گیا تھا۔ ان سب کے دلوں میں بھی کسی کے نرم

برے ہو جاتے تھے۔
 "وہ عورتیں جس اور سخت کی کمائی لوٹ کے لے جانے والے کے خلاف وہ اپنی دینی مہرستی پر دعائیں دیتی اس کا جگر پھٹتی کر رہی تھیں۔ وہ چھریوں کی خاموشی سے چابی کے کوئے پر مٹی کی لغزشیں دیکھتی رہتی۔ پھر چاک سے خیال آیا۔ اس کو ان کے درمیان رہنا ہے۔ ان جیسے ملن کر۔
 وہ خاموشی سے چابی سے اڑ کر فرش پر ان کے ساتھ آئی۔ صاف صاف فریضہ جو عالمی دن غری کی دھلائی رکڑائی کے بعد خوب گھبرا گیا تھا۔ سڑک میں چابیوں سے بنایا گھر سکون بھی تھا اور خوب صورت بھی۔
 لوگوں کی ہال ہال کے باوجود وہ دونوں کھٹے جوڑے تھوڑی گھنٹوں پر ٹکائے ان کے درمیان خاموش بیٹھ گئی۔ رحیم چاچا آج علاقے کی سب سے اہم شخصیت تھے۔ مٹی کمروں سے آئے اس کے لیے کھانا بھیجا گیا۔ جو انہوں نے عادت سے ٹکرایا۔
 "بی بی کو میسرے علاوہ کسی اور کے ساتھ کھانا پند نہیں۔"
 رحیم چاچا فریضہ سے پچھلے نہ سنا تے۔ صحن کے کوئے میں سبے باہر چلی خانے نما چوڑے پر کھانے پکانے کا اہتمام کرتے تھے۔
 "تم لوگوں نے کیا ناشائستہ کھانے جاوائے اپنے گھروں پر۔"
 "لوہے کی پھونکی سے لکڑیوں کے درمیان پھونک مارتے سحرے لگ رہے تھے۔ ان بے چارے کو بھی ایک مدت سے ان چوڑوں کی عادت نہیں رہی تھی۔
 "عروق میں سے کئی نے ان کو دھکی کی طرف توجہ نہیں دی۔
 "خاکم نے مجھ نہیں تھوڑا بائیں کپڑا لٹے۔ پورے بھوکے سے لوٹ لیا۔ توہ۔"
 "بس بچی تقدیر کے چیل ہیں۔ جب ہندوستان پاکستان کی جنگ لگی تھی۔ تو ہم ٹیٹ پٹ کر ہمارے چلے گئے تھے۔ وہاں ایک مدت گزار کر پاکستان میں آئے۔ عوامی اور داری زمین سمن خوب سلیٹے سے بھلایا۔ دوسری جنگ لڑی تو وہاں سے نکال دیے گئے۔ اس سبب ہیں کہ کیا پورے کپڑا لٹے۔"
 "ارے عسکر کو بی بی جان تو پچی یہاں تو سب بی بی نہیں کھانا کھا کر کھانا کھا رہے ہیں۔ کیا فائدہ اس دم کا۔ یہ بھی۔ رتا۔"
 "خاکم بی بی۔" رحیم چاچا نے چچی میں سا زکاٹ بھر ڈالا۔
 "معاف کرنا بی بی۔" رحیم چاچا کا ہاتھ خشک کرتے اس کے پاس آگئے۔ "تم بی بی آئی ہو۔ تاکہ یہ لوگ یا رکھا اٹھا۔ اسی طرح کرتے ہیں۔"
 "کچھ ہرچ نہیں چاچا۔" اس نے دھیمے لیے میں کہا۔ "چھا لگ رہا ہے۔"
 اس کی آنکھوں میں نرم نرم سیانی تیر رہا تھا۔ چاچا چپ چاپ چلے گئے۔
 "دن کم بخت لکڑیوں کی عادت بھی تو نہیں رہی۔ تکی ہیں بالکل۔" چاچا نے بے تحاشا ہتھیلی آتشیں سے گزرا۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اس نے آسف سے سوچا۔ حالانکہ وہ اپنے پیاروں کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ چچی دروڑ تھیں اس کے پاس تھیں۔ اس سے زیادہ دروڑ لگائیں۔
 وہ اس کے کپڑوں کو تھوکر دیتی رہیں۔ اس کے ٹاپس پر ہاتھ لگا لگا کر ٹیٹ کر رہیں۔ پھر شرمشا کر مسکرائیں۔ صاف اتنی ہی دیر میں وہ اس کا مکمل اندر ہو کر چکی تھیں۔ اس کو کھانے میں کیا بند۔ ہے کیا وہ

رسالے پر جتنی ہے؟ یہاں باقی زہروں کے گھر گھائیوں والا رسالہ آتا ہے اس میں خبریں بھی ہوتی ہیں۔ وہ جب منہ دھوئیں تو لڑائی صابن ان کو ضرور دکھائیں۔ کیا آپ کے پاس میک اپ کا سامان ہے۔ سرخی پاؤں، مسٹرٹیس ان کو ہر ماں شدید مایوسی ہوتی۔
 لائبریری کی شخصیت کی طرح ایک مصروف دن گزار کر وہ گئے پریشانی ڈاسے خراب کیا۔ آج کے دن اس نے پہلے تمام نوٹوں کے مقابلے میں پایا کو بہت کم پایا ہے۔
 یہ نگاہ جو سخت لگتا ہے اور میلا تھا۔ اس نے سر رکھا تو لگا ایٹھ پر رکھا ہے۔
 مساب نے اصرار کیا تھا۔ انہی شدید ضرورت کی چند چیزیں ساتھ رکھ لو۔ لیکن اس نے ایک چھوٹے بیکٹ میں کچھ لے کر گئے تھے۔ کلاؤ کچھ بھی نہیں رکھا۔
 کدھیری کپ رات میں جہاں نہ کسی ہائٹ لپ کا تصور تھا نہ کسی اسٹریٹ لائٹ کا۔ اندر ہر جوتوں جیسی شکل بنا کر اس کے سامنے ناخن لگا۔
 بل اگر ایک مرتبہ بھی اس نے کہا اس کا کچھ ضائع نہیں ہوا نہ ذرا نہ کچھ نہ یہ وہاں صرف اس کا باپ اور باب آکر تڑپا رہے تھے۔ دالے اس سے اتنا یاد نہ کریں۔
 دنیا کتنی دھبی ہے۔ اور کچھ بابت کر کے اس کے ہاتھ سے اسے آج ہی پتا چلتا لوگوں نے اس سے بھی بڑے دکھ جیسے ہیں۔ اس سے زیادہ نقصانات اٹھائے ہیں۔ اور یہ تصور کتنی قس دیتا ہے کہ دیکھی دنیا میں آپ کیلے تو نہیں۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

کوشی اس کے لیے بہت بے چین تھی۔ انکل جشیہ نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں پوچھا تھا۔ ان کے ہوا میں کسی گھر کا انتخاب کر سکتی ہے اور گھر بھی اس کا۔ اور اگر انکشارت کی طرف چلی جاتی یا میٹر صاحب کے ہاں رہنے لگتی تو شاید ان کو اتنا قلق نہ ہوتا۔ وہ اس ضدی لڑکی سے بالکل ناراض ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے کوشی سے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں اس خود سر لڑکی کے بارے میں زیادہ سوچئے۔ چند دن سن مانی کر کے اس کے لیے اپنے منہ کی کھانک کرپ آجائے گی۔
 غصہ تو کوشی کو بھی بہت کیا تھا۔ لیکن وہ اس سے ناراض نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس سے بول بھی نہ کر سکتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ دن بعد اسے بے چین ہو کر اس کی ہستی کی طرف سے چھپ چھپا کر آکر۔
 اس کو ڈھونڈنا اس کے لیے اتنا مشکل نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ شہر کلب سے زیادہ چھتا ہوا لکھتے تھے۔ کوشی ایک جیسے بے گھر لوں میں سے اس کا گھر بھول گئی۔ لیکن ساری ہستی جتنی بھی وہ شہر سے کئی مظلوم لڑکی بنا کر اس کے ہاں ٹھہری ہے۔

”یہ خوب صورت ہی ہیں نا۔ باری ہی سی۔“

وہ چھوٹی سی لڑکی اسے ساتھ لیے رحیم چاچا کے دروازے پر ٹھہر گئی۔ اس نے ہلکی آہٹ سے دروازہ کھولا اور ٹھنک لگی۔
 اس کے ارد گرد ابھی تک لوگوں کا بوجھ تھا تھا۔ وہ رنگین چٹیلر مکھن سے چڑے مولی کے پر اٹھے کما رہی تھی۔ لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے کسی کے پاس سرسبز کا ساگ تھا کسی کے پاس ماہہ تھیں کوئی گاڑی کا ڈھکی لسی لایا تھا۔ کسی کی کولی میں بون کا اجار تھا۔ کوشی نے ایک لمبا سا کرا سا سن لیا۔
 تو بلائے بالکل سچ بھلا کہ لیا کے بارے میں بھلا کرنے میں بڑی باڑی ہم نے کی۔
 وہ بیٹا کے ساتھ دوسری بچی پر بیٹھ کر سارا اٹھا کھانے لگی۔ ہوتے سے آخرت ہی سیدھا اس کی

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

خدا مت میں پیش کیا گیا تھا۔ چاچی نے جمع ہڑایا۔
 ”اس کی ہنسی آئی ہے۔ وہ کچھ آپس کی باتیں کریں گی۔“
 بچی سی جھٹکے والے تنگ سے کمرے میں جہاں کوشی نامی کوئی چیز نہ تھی۔ ہاں چمت کے نزدیک ایک بنا روشن دان تھا۔ جہاں سے روشنی اور تازہ ہوا چھٹی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ روشنی کی بڑی سے کیر جس میں مٹی کے ننھے ننھے لاکھور اور ایک کھڑکی میں کمرے میں گرے تھے۔
 ”م خوش ہو؟“ کوشی اب تھکے ہوئے بھیر کر پھر ان کے جمع ہونے کا ہاتھ کر رہی تھی۔

دو بول غاموش ہو گئیں۔
 یہ بولی کھیل نہیں ہے کوشی نے سوچا۔ لوگوں کو تبصرہ دینا بھی تھا تھا نہیں۔ وہ زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سوچے توڑے کے لیے بار بار نہیں آئے گی۔
 چاچی نے دو کلاس چائے بنا کر کھتری میں سجا کر انہیں پیش کی۔ یہ چائے خاص طور پر انہی کے لیے تیار ہوئی تھی۔ تھکے ہوئے کوشی کے زیادہ تر لوگوں کو چائے کے مزے کی عادت نہیں تھی۔ رحیم چاچا کے شہر بچانے کے بارے میں چاچی بیٹا کو ہر کام خود کرتی تھیں۔ چاچا چنج کر نہ تھا لیکن اسے بڑی خوشی ہوں۔
 کوشی نے بیٹا کو ہر کام خود کرتی تھیں۔ اسے لگا تھا کہ اس میں بھندرا چائے گا۔ چائے میں لکھنیا کے ملا وہ ہار کی بھی خوشبو تھی۔ لیکن وہ اسی سکول سے پیشے کے پیلے کلاس میں رچا سب سے کچھ مزے مزے سے چائے پیتی رہی۔

بیٹا اسے چھوڑنے سڑک تک آگئے۔ کیونکہ کار کو کبھی سے بہت دور رکنا پڑا تھا۔ وہ سارا راستہ غاموش ہی رہی۔ اسے ایسا لگا اب ان کے درمیان کچھ بھی مشترک نہیں۔ آخرت اس سے کس مونس پر بات کرے۔

”کچھ دن کے لیے میرے ساتھ چلو بیٹا۔“

”ہاں ضرور۔ کسی دن آؤں گی۔“

کوشی کا جی بھل گیا۔ رحیم چاچا داری بھائی بھی اسے اپنی تھی۔
 وہ حضو لکھنیا کی جتنی اذیت ناک مزاح خود کو دے رہی تھی اس کچھ حاصل بھی تھا؟
 وہ ضدی اور کشا نہیں تھی۔ تو خود سے کچھو اگر کے انداز سکھ رہی تھی۔ اور اندر سے اپنی بھر پور اگلی تھی کہ کوشی کی جیسے اسے ڈھونڈ کر رکھ دیتی۔
 انسانیت پر اپنا اعتبار دلانے کے لیے اس کے پاس ایسے ہی رشتوں کا ہونا ضروری ہے اور ایسے ہی خالص بچ کا۔

اس نے طے کر لیا تھا وہ آئندہ یہاں نہیں آئے گی۔ وہ اس کے مسئلے پر ایک لفظ نہیں بولے گی۔ اور اس کے لیے کوئی راہ تلاش نہیں کرے گی۔ اس لیے جس کو وہ اس سے ناراض تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کا برا نہیں سوچ سکتی تھی۔

شاید اسی لیے اس نے ایک لفظ بھی اپنے بے حد لاڈلے انکل جشیہ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔
 ”تم پھر انکی کوشی؟“ اس نے اسے کار میں بٹھاتے ہی لپکا ہٹ سے پوچھا۔
 وہ چپ رہ گئی۔ معلوم نہیں وہ بول سے چاہتی تھی یا یہ بھی رسم شمار ہی تھی۔
 ”اگر تم چاہتی ہو تو ضرور آؤں گی۔“

باقی چوروں کی طرح کوئے میں بھسپ کر بیٹھ رہنے سے یہ بہتر تھا۔ اس نے تفصیل سے ایک ایک "ضرورت" کو دیکھا۔

"وہ اسکول کی نوکری کے لیے تو ایم اے مانگ رہے ہیں سو تو تم اچھوڑ آئی ہو یا پھر ایڈمیرا خیال ہے، تمکھ کی انجکشن آئے آئے گی۔ ہوائی کمپنی پر لغت کیجیو، ہم تم سے اتنی بوری برواشت نہیں کر سکتے اور سیکرٹری وغیرہ کیا ہوتی ہے۔ بار کھٹی تک یہ دوا دے پھر رو کیا ہے جس کی ہم عوام میں عزت نہیں کر سکتے۔ جائے کیل حالانکہ دیکھا جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

اور یہ تو خاصا مسئلہ خیرا شہنا ہے ضرورت سے ایک ایسا لڑکی کی جو تعلیم یافتہ ہو گھر داری میں ماہر ہو، فنون لطیفہ اور انتظامی صلاحیتوں سے آگاہ ہو، گھرواری کا تجربہ لیکن بیلا اہموں نے یہ گھما ہی نہیں کہ لڑکی بہتر صوم سلو ہو کر نہ ہو۔"

ایک مدت بعد گوشتی کے کانوں نے بیلا کا تعلق یہ سنا تھا کہ مطمئن ہو گئی۔ تو بیلا زندگی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اس نے کانڈوں کا ذخیرہ اسے دلایں تھا۔ وہ چلو میرے ساتھ۔ "گوشتی نے اس کی سب چیزیں سمیٹ کر ایک فیصلہ کن انداز میں کہا۔ بیلا مسکرو گی۔"

"پہلے میرا ایک کام کو۔ مجھے کچھ بیرونی ضرورت ہے، میرا چیک کیش کرو۔"

"چلو میرے ساتھ۔" اس نے فانی رٹ جاری کر لی۔ "اور۔" پیش کرواؤ۔"

"نہیں۔ میں نہیں جانا جاتی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں تم بیرونی ہو؟" اس کا خیال تھا، "جوش میں آجائے گی۔ اور فیصلے میں پہنچ چلائی اپنے نام سے بیلا کا دھماکا اس کے ساتھ بھلے ہوئے۔ لیکن وہ نہ کسی ہی رہی پر سکون اور خاموش۔"

"اے! اگر تم میرا کوئی کام کر سکتی ہو تو بیلا چیک۔"

اس نے چیک اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ یو کی عورت اس نے چیک کی رقم پر نظر ڈالی اور اچھل پڑی۔

پتا نہیں اس کے کیا ارادے تھے؟

وہ اتنی بڑی رقم سے کیا کرنے کا روبرو کر رہی تھی؟

اگر وہ یہ سب پیسے لٹا دے گی تو زندگی کے باقی دن کے لیے کہا سو۔ چنگی؟

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ واقعی اب ٹھیک سوچتے ہیں۔ وہ اپنی سن الٹی کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ لیکن اتنی جلدی ہے اور اتنی محکم ہے کہ اس کی بات سنانے بغیر گزارا بھی نہیں !!!

بہت زیادہ دن گوشتی بھی اس کے بغیر گزار نہیں سکتی تھی۔ اس لیے سو چند دنوں اس نے اطمینان سے گزارے۔ اس چند دنوں تکلیف سے۔ اور اس کے بعد کامیاب ہو گیا۔ اس کے لیے دوا دے دیا گیا۔ اس نے ملے کر لیا تھا، اپنی صورت دکھا کر بار بار اس کے لیے مشکلیں کھڑی نہیں کرے گی۔ لیکن پتا نہیں کیوں بار بار اسے لگتا، چلا کو اس کی ضرورت ہے۔ دراصل یہ ہماری اپنی بیکار ہوتی ہے۔ ہمیں خود کسی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم کسی اور کے سر بھوپہ دیتے ہیں۔

وہ دو مہینے بعد وہاں پہنچی تو موقع نہ ملا کہ گھر گیا تھا۔ دو کوہلوں والے اوٹ کی طرح اس بار کوئی پیشکش نہ تھی۔ کٹ نہیں تھا۔ نیا چننا اس کو بھر کر تماشہ دیکھ کر، آٹو ہار کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ ایک رستم پا چایا تھے جو کی جان سے اس کی خدمت میں جتے تھے۔

وہ برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھی کانڈوں اور پسلوں سے کچھ کھیل رہی تھی۔ کوئی کوٹا دوپٹے سے مر جھانک رہی تھی۔ گئے طرز اسے پائوس کیا ہے۔ وہ گوشتی کو دیکھ کر کھل اٹھی، لیکن اس نے اتنے دن بعد اسے کاٹھون بھی نہیں کیا۔

اس کا روگروا چار رساں کاٹھون لگا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" گوشتی نے پہلا سوال ہی نہ پوچھا ہوا کیا تھا۔

"وہ جب وہ تھی۔" پوچھنی اخبار رسالے ہیں۔

"وہ تو نظری آ رہے ہیں۔" گوشتی نے اچھ کی جینٹ سے ہکھیر دیا۔

"وقت گزارنے کے لیے کیا کروں؟" رستم پا چایا کی کام تو کرتے نہیں دیتے۔

"میں اس ہی کیا ہے جو وہ نہیں کرتے ہیں اور تم کو۔"

"ہاں، واقعی سوچ رہی ہوں۔ چاہے کر لوں، مزار ہے گا۔"

"تم اپنا بڑھائی تو مکمل کرنا سب تمہارا پوچھتے ہیں۔ صرف روق بھی ڈاکٹر سن بھی اور ہیڈ ٹوکل کہہ رہے تھے۔ شک نہ آج بھی جوائن کر لے۔ اس کا نام نہیں لے گا۔ اور تو اور بیلا کہیں اس موٹے عاشق سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ تو بے چارہ کافی دلا ہو گیا ہے کہہ رہا تھا میں بھی امتحان میں نہیں بیٹھوں گا۔"

بیلا کے چہرے پر مسرت کی ہلکی سی کلن چمکی اور ماند پڑتی ماضی کے حزاروں میں کیا رکھا ہے؟ زندگی سانسے ہے۔ وہ بہت بڑے خاموش رہی۔

"یہ بہت سے اخباروں کی کلکٹنگ ہے۔" اس نے ایک موٹا سا ڈیوہ اس کے آگے کیا۔ "آج کل میں دن رات بین میٹا لہ کر رہی ہوں۔ کو تو اس کا امتحان ہوئے اور تو اس نے بات کو سمجھنے کے لیے نہ دیا۔ یہ اسکولوں کی نوکریاں ہیں۔ زیادہ تر پرائیویٹ اسکول ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں ہیں۔ یہاں رہائش میرے لیے مسئلہ بن جائے گی۔ یہ جانب ہوائی کمپنی کی ہے۔ پتا نہیں مجھے اس بھی آتی ہے کہ نہیں۔ یہ ایک قابل بلا ہے۔ میں کسی گھر کو کسی مسئلہ کی ضرورت ہے۔ جس میں اختلافی ملا جلتیں ہوں پتا نہیں مجھ میں ہیں کہ نہیں، یہ کسی مانی نے سیکرٹری وغیرہ کے لیے دیا ہے، مجھے ناپ آتی تو میں پڑ سیکر لوں گی۔"

اس کے اس اخباروں کے تراشے تھے۔

اس نے اس کے ہاتھ سے نائل لے کر آہستہ آہستہ پڑھنی شروع کر دی۔

پانچ گنا ناپ کی گھٹ گھٹ "پھر کون سی تتر" وہ دوسرا دوسرا کاغذ لٹکی پانچ پھر گز رہی یہی خان کا اختیار اٹھا لیا۔
یہ کون سا شہر تھا ہم سے تو صوبہ سرحد کا وہی علاقہ لگتا تھا بلوچستان کی طرف بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کو یقین مانو جلا تھا کہ یہ علاقہ ہمیں صوبہ سرحد کے آس پاس ہی ملے گا۔
وہ تین مرتبہ کی گفتگو کے بعد اس نے اشتہار پر بیا سگول نشان بتایا "پتا اپنی انٹری پر انار اور ڈٹری پرس میں بند کر کے ضرورت کے پانی کا ملبہ بر غور کرنے لگی۔
گوشتی نے جو پیسے سے پہنچائے تھے ان میں سے کچھ اس نے تیار نچو کر دیا تھا بقول گوشتی کے اور باقی پرس میں اس کے آٹے و قند کے لیے سنبھل لیے تھے اس نے رحیم چاچا کو ان کی ضرورت کے مطابق پتھر رموی بھی تاکہ وہ سگول کو فرش لگا کر وائیں اور غسل خانے کی پھت ڈالوائیں فاطمہ کو گھر کی پار دیارنی اور لیائی پتائی کے لیے "زہو جو چیزیں چند برتنوں اور چلوں کے لیے جو اس کی شادی کے بعد اس کی زندگی میں کام آسکیں۔ اس نے آبا لاس کو چیک بھجوا یا لائی اور لٹکی کی بھی بیانیے مانی صرف اس لیے رکھا تھا کہ اس کا ذریعہ کوئی صرف اس گھر سے وابستہ تھا ورنہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا تھا جہاں مالی جیسی مشقت کا کام اس کے بس کا نہ تھا اس نے گوشتی کو کچھ اکاؤنٹس ادا کرنے کی ہدایت کی تھی۔

"اس دن میں کہیں بھی رہوں ایک کھانسی کی تنخواہ پہنچتی رہتی ہے۔"

"تم کہاں چلا رہی ہو۔" اس نے شک سے پوچھا۔
"کہیں بھی گوشتی را آخر مجھے کہیں تو جاتا ہے۔" اس نے اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی تھی۔
"لیکن تم کو کہاں جانا ہے؟ سوچو ہم ایم اے مکمل کر لو تو تمہیں کسی طرح کی بھی نوکری مل سکتی ہے۔"
"لیکن میں مجھے جلدی ہے میں فوراً نوکری کرنا چاہتی ہوں۔" وہ ناراض سی ہو گئی۔
"تم اپنے معاملات میں خود مختار ہو کر تم گھبرا گئی ہو تو میرے پاس آؤ۔"

"میرا تو میں گئی ہوں لیکن اس طرح نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہو۔" اس نے لگے لگے کچھ دن مصروف گزارے وہ محکمہ سیاحت کے دفتر سے معونات کے کر آئی بہت سے کاغذات محنت سے تصویب دیے وہاں اس کو اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں ملی تھیں۔ پھر اس نے ڈاک خانے سے لفافے خرید لیے کھرچ کر وہ بھی چوڑی چٹیاں لٹھے بیٹھ گئی۔ رحیم چاچا اس کو عجیب و غریب کاموں میں الجھا رکھے رہے تھے لیکن وہ زیادہ تر خاموشی اختیار کرے رکھتے تھے وہ مالک محلی بے شک ان کے گھر اگر رہتے لگی تھی۔ رحیم چاچا کو یہ دے تھے کہ خط بھیجنے کے بعد وہ کچھ دن عجیب و غریب قسم کے جوش و ولولے میں مبتلا رہی۔ شاید وہ باب کے دشمنوں کا کھون گانے کی کوشش میں ہو۔ ان کا چھوٹا سا ذہن اس سے آگے سوچنے کی کوشش بھی نہیں کرنا تھا۔ وہ اس کا ایک ایک پیسہ بھی تقسیم کرنا دیکھ رہے تھے ان کا دل کڑھتا تھا وہ بے کا بے شکل بنایا ہوا ایک ایک پیسہ لارہی تھی۔ ان کی اس سے اس موضوع پر بار بار جھڑپ بھی ہو جاتی۔ لیکن وہ اسے باب کی طرح نہیں دیکھتے اس کے ہاتھ میں آتا وہ ہانٹ دیتی اور اسے ہانپ کی طرح اسے پیسے کی شکل کا مطلق مال نہ تھا پھر کچھ عرصہ بعد اسے وہ رشتہ دیکھڑ موصول ہوا جس سے اشتہار میں وہ ایک ایک دن کاٹ رہی تھی۔

"مجھے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے رحیم چاچا۔" اس نے لفافہ جلد بائیں سے بائیں سے دیکھاں بکھیر کر کھولا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرہ خوشی سے تھماتے لگا تھا "لیکن رحیم چاچا! یوں ہو گئے تھے۔"

"تم ہمارے جیتے جی نوکری نہ کرو بیٹا مالک کے سامنے تو مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ کل کو تو وہ مجھ سے ہی سوال کرتے تھے۔"

"یہ ایسی دیکھی نوکری نہیں ہے رحیم چاچا بہت اچھی نوکری ہے۔"

"آپ نے دنیا میں دیکھی یا نہیں؟ کیا جانے کہاں ہوں گون ہوں، کیسے لوگ ہوں، کہیں کوئی تمہارا دل نہ دکھا اسے۔" ان کی جھنجھکی ہوئی کمر پریشانوں سے وہ ہر کی ہو رہی تھی۔

"رحیم چاچا۔" اس نے سونے سے پہلے ان کی اپنی طرف سے سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی۔

"اس دن میں جتنے لوگ آتے ہیں ان سب کو ایک دن اپنا بوجھ اٹھانا ہوتا ہے جلد باریک۔ بعض لوگوں کی باری ہوتی ہے۔ ان سے میری جلدی لگتی ہے شاید۔ پھر ہمیں ان لوگوں سے بھی بھڑکانا پڑتا ہے جن کے ساتھ ہم رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن نقدیر کو شاید یہ ساتھ بھی زیادہ دیر کے لیے پسند نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم بچھڑ جاتے ہیں۔"

رحیم چاچا اس کے مشکل الفاظ اور روشنی موفی ترکیبوں کا مطلب تو نہیں سمجھتے تھے لیکن وہ یہ جان گئے تھے کہ اس نے اب یہاں سے رخصت ہونے کے لیے کہا تھا وہی ہے۔ انہوں نے رات کو ستر لٹھنے ہی ہو چکا تھا کہ وہ پہلا کام یہ کریں گے کہ گوشتی کو ایسا کو بیٹا کے عزائم سے آگاہ کر کے کوشش کریں۔ تاکہ وہی اس کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکیں۔

وہ صبح اٹھے تو وہ ان سے پہلے اپنا سامان تیار کر کے بیٹھی تھی۔

"مجھے صبح کی گاڑی سے پشاور جانا ہے چاچا۔ مجھے اسٹیشن تک چھوڑ آئیں۔" رحیم چاچا اپنے ارادے میں باورس حیران پریشان ہو گئے۔

"آپ کہاں اتنی دور کس کے پاس جا رہی ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں رحیم چاچا! وہ دشمن نہیں اور وہاں پہنچ کر میں آپ کو تحصیل خد لکھ دوں گی۔ اگر وہاں مجھے کوئی پریشانی ہوئی تو میں فوراً آپ کے پاس آجاؤں گی۔ رحیم چاچا! میں بھی نہیں بھولوں گی اگر اس دنیا میں میرا کسی آخری ٹھکانہ ہے تو وہ آپ کا گھر ہے۔" رحیم چاچا نے خوشی سے سرخ ہونے چہرے کے ساتھ اس کا سوت کیس اٹھا لیا۔

"معاف کرنا بیٹی میں تمہیں اپنے علاقے کی لڑکیوں کی طرح سمجھنے لگتا ہوں حالانکہ مجھے پتا ہے کہ تم پڑھی لکھی ہو اور سچی بات یہ ہے کہ مرادو ہو۔"

"مرادو تو آپ کی لڑکیاں بھی بہت ہیں۔ رحیم چاچا۔"

"آپ نے گوشتی بیا کو تو بتا دیا نا۔" وہ تائے میں اس کا سامان لے جاتے ہوئے بولے۔ رحیم چاچا کی لہجے سے پتہ چاچا نا تھا پھلتا تھا۔ یہی اس کو بیوقوف اور روڈ والی سرک تک پھوٹنے آرہے تھے۔

"اس کی ضرورت نہیں چاچا! میں خط لکھ دوں گی۔" سمجھوتہ کرنا ناگاہانہ کی خاموشی کو اپنی ترتیب سے پڑتی ناپوں سے توڑنا جا رہا تھا۔ صبح کی ملکی سی نیم اٹلی روشنی میں آسمان زمین چھوٹے

”وا۔“ چھوڑ چکا کرولی۔
”والد۔“

”جی ہاں۔“ مہرین کھڑکی کے پاس منتظر سے اوپر ابر طلوع ہو رہا تھا مضامین کا علاقہ چھوڑ کر مہرین اب اپنے کمرے میں دوڑی تھی۔ جہاں کالوں میں بڑے بڑے خاموشیوں کے آہستہ آہستہ سورج کی روشنیوں میں بند ہونا شروع ہو گئے تھے۔

اس نے خاموشی سے ٹھنڈوں پر ٹھوڑی ٹھک کے خواہش رقی کا بیڑہ لیتا شروع کر دیا۔ فصلوں کی کٹائی کا وقت ابھی نہیں آیا تھا سو مارا راستہ یہاں سے بھرا ہوا تھا۔

”مسرول جاری ہو۔“ اکیلی ہو خاوند ساتھ ہیں۔“

”مہرین پر آئیں گے نا۔“ دو مری نے لقمہ دیا۔

بلکی ہوا سے لہراتے جھوٹے کھیتوں سے آگاہ تک کر رہا رہا پر اس کی طرف جاتی۔ اس نے خاموشی سے اپنا پرس اٹھا لیا۔ زپ میں اس کا پیسہ بیگ کیا ہوا وہ براؤن لٹفٹ انجی تک رکھا ہوا تھا۔ جس میں اس کی قدر کا فیصلہ ہونا تھا اس نے ایک نظر لانے کے لیے جھپٹے جھپٹے پر ڈالی۔ پیچھے والا قیاد طہیت کا کالہ تھا۔ اس نے اندر آہر کئی جگہ ایڈریس لکھ رکھا تھا۔

وانیل خان۔ گرضی۔ ٹی خان۔ تحصیل اور ضلع کی تفصیلات بھی وضاحت سے لکھی تھیں۔ اندر خاتون کا کچا تھا۔ انہوں نے ایک جگہ لکھ رکھا تھا آپ کو شہر اور اسٹیشن پر ہمارا آدھی لے آئے گی کیونکہ یہ علاقہ دور دراز اور تمام ماہے۔ جب تک پہنچی راہستوں سے واقفیت نہ ہو۔ انسان تنگ سکتا ہے۔ جھگڑے لگتا ہے آپ بہادر قانون ہیں۔“

اس نے خدا اور چوراہوں کو تیزی سے پیچھے کی طرف رہ چلنے والے چراہے اور اس کے پوٹھ کی طرف دیکھا۔

یہ اس کے بارے میں لوگوں نے عجیب سا تاثر قائم کر لیا ہے کہ وہ مت بہادر ہے۔ اس نے شیشے سے ناک لگائے لگائے سوچا نا لاکھ وہ لوگوں کو کیسے سمجھائے کہ وہ کتنی بڑا ہے اتنی بڑی کہ لب بھانگے بھانگے بھی تنگ نہ ہوں۔ چاہے چاہے چور چور ہو گئی ہے۔ اسی لیے وہ دنیا اور اس کے پھیلوں سے اتنی دور جاری ہے۔ جہاں نہ کوئی اس کا واقف ہو گا نہ جانے والا نہ اس کے ماضی کو کھنکھرا کر اس کے باپ اور باپ کے دوستوں کو برا بھلا کہنے والا۔

”ارے کیا باپ تھا وہ ستوں کی محبت تھا اور اس کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔“

وہ کتنی بدلت سے رشتہ داروں سے ملنے والوں سے اور ہزاروں سے اپنی باپ کی حقائق کے قصے سن کر رہا ہوا ہے۔ کتنی ہی ہاں وہ بہادر نہیں تھی۔ کس کس کو نہیں لائے گی۔ لیکن وہ والوں کے سامنے اسے بہادر نظر آنے کی جدوجہد بڑی کامیابی سے کرتی رہی تھی۔

”خان کل اس شخص کا نام ہے۔ جو تمہیں اپنے آگے گاؤں بھروسے کا آدمی ہے۔ دایال کا اصرار تھا کہ میں خود تمہیں لینے اسٹیشن کوں لیکن میں آئیں سکوں گی۔ کیونکہ میرے لئے تقریر کا کارہ ہو چکے ہیں۔ انصافیت نہ ہو بھر ہے۔ کھر داروں کے پھیلے مجھ سے سنبھالے نہیں جاتے اور اسی لیے اشتہار دے دیا تھا۔ اور شکر ہے کہ ہمیں کافی دور ڈاکٹریں موصول ہوئیں جن کو ہم مختلف وقتوں میں ملا کر انڈیا کرتے رہے۔“

جھوٹے گھر سے پراسرار کتے پر محو نہ کھائی دے رہے تھے۔

”میں وہاں ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہی چاہا۔ میں ماحول کو جانچ کر کہ لوں پھر آپ کو اطلاع کروں گی۔“ وہ روشن صبح کی خوب صہرتی کا پردہ رجم چاہا کہ پریشان سوالوں سے چاک ہو کر اکیلے رہی کچا جو آگے بڑھتے چاہا کہ ساتھ چار کی ہنگامہ مارے بار بار اس کا سوٹ کس سنبھالے اس کی پتھروں کی کتنی کرتے۔

کھانے کا نقش جو ہاتھ کے گھر سے کیا تھا اصل بھی والے تکیں کے لڑ چاچی نے مارے کے مارے اس کے حوالے کر دیے۔

پانی کا گھر اس جو چاہا پانی کے گھر کے ساتھ خرید لائے تھے کہ بیابانی ابال کرینے کی عادی ہے۔ ضرور پورہ آئے ان کا اچال زیادہ پھیل گیا تھا۔ ہاں سے انہوں نے ٹیکسی کی تھی۔

”صاحب کی زندگی میں تو آپ کبھی جانی تو جانا میں جانی تھیں اب یہ لوگوں میں پائنت ہمارے حالوں تو کس کی تھی۔ مالک کی روح گھر کے گی ہم پر۔“ آگے تھو مہاں خانہ لال یہ تم نے ہماری بیٹی کی عزت رکھی۔“

”اف ہاؤ رجم چاہا۔“ اس نے جھپٹا کر کہا۔
”آپ انی میں سامان رکھا۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہی۔“ واقعی اس نے تیز تیز دوڑتی ہو کر پیچھے رہ جانے والے درختوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

”چاہے کب زندگیاں میں وہ دوبارہ اس شہر اور اس شہر کے لوگوں کو کچھ بھی سکے گی کہ نہیں اور حقیقت یہی ہے۔ بڑے لوگ سمجھتے نہیں کہ وہ بہت بڑی ہے۔ امار سے لائے وہ اتنا جڑا جو اس شہر کی زندگی بسر کر سکے۔ جہاں قدم قدم اس کے باپ کی یادیں بکری ہیں۔ وہ گوشی کو کیسے سمجھائے کہ وہ رجم چاہا کہ گھر پر بھی نہیں رہ سکتی۔ کتنی مرتبہ تو رجم چاہا اسے وہاں تھے۔

”میں اس کے لیے ہو کر کپ کے پلانے سے بہت ڈواں تھی اور کھرے کھرے جب سے پہلے نکال کر راج مزدوروں کو کچا کھانا ملا۔ لاکھ اپنی اپنی کے لوگ کرتے کر رہا یہ نماز بھی نہ لیتے۔“

”چاہا اچھا بیٹا تم کو لاکھ کو سونا۔“ رجم چاہا نے کھار ٹھٹ کی کھٹی سے جیسے اس کا داس پڑھ کر کہا۔
”اور کھٹ نہیں ہوا تو ہوا بلی ہو جائے گی جلدی خٹ لگتا اور جلدی آئے گی کرنا۔“ گاڑی چھینا کر گھڑا۔
لڈنگی تو رجم چاہا کی آنکھ میں آنسو آگئے۔

”جس سے گھر پر ہوا ہوتی بیٹا پہلی مرتبہ جدا ہو رہی ہو۔ اچھا باری باری سب ہی جدا ہو لیے ہم تو بھی خدا کے حوالے کیا۔“ وہ سونے۔“ مہرین نے کھار ٹھٹ کی کھڑکی پر کھڑک دوڑتے دوڑتے کہا۔

”راستے کا پانی نہ پینا۔ کسی سے کوئی چیز نہ لے کر نہ کھانا۔ کسی سے بات نہ کہتے۔ مہرین بہت آگے نکل گئی۔ انہوں کی تیزی نہیں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ رجم چاہا کی رندھی آواز اور آنسو بھری آنکھیں زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکیں۔

اس نے کھڑکی کا شیشہ کرا لیا۔ اب وہ ہاتھ ہاتھ کی فن کو تلی ویٹا بھی چاہتی تو پیٹ فارم بہت پیچھے رہ چکا تھا۔ لٹھلے ہوئے پیر اس نے جو توں میں دے لیے۔ مہرین ٹھٹ زیادہ کتنی ہے اس کا اندازہ نہیں تھا۔
”لوگوں تھے تمہارے۔“ مہرین کی بیٹھ میں بھی عورت نے بڑا دھجی سے پوچھا۔

ہیں۔ اگر تم باکام رہیں تو اب یہ ہے کہ رات میں جاؤ گی اور باں فکر نہ کرنا۔ بولی ہی پر سبیل تذکرہ کر رہے ہیں۔
 یہاں پہنچے ہر تہیں آنے اور جانے دونوں طرف کا گریہ ادا کر دیا جائے گا۔
 ”یہ رات کی بات ہے۔ ساتھ کی سب سے ایک پشانی عورت نے بھی سے لکھڑا ہاتھ تھیں بھیج کر اس کے آگے کر دیا۔“

”میرا ب۔ اس نے لافاف بھی کی چکانا ہٹ سے پچانے کے لیے جلدی سے ایک طرف کر لیا۔“
 ”میرا ب۔ وہ بھر چکی سی ہو گئی۔“
 ”ہاں ہاں کہہ جاتا ہے۔ وطن؟“ ساتھ میں ہی بیٹھی فتنہ لگا کر نس بڑی۔
 ”ہم اپنے دیس کو وطن کہتا ہے۔ ہم ابھی مرزا کا رہنے والا ہے۔ تو ہم بڑے کام مرزا ہمارا وطن۔“

”اس حساب سے میں ہمارے ہوں اور شاید ہر طرح سے ہمارے ہوتی ہوں۔“ اس نے پھر کھیت کھیلان پر نظریں گاڑنے کی کوشش کی اس کا فلسفہ ڈسے کی عورتوں کو سمجھ میں نہ آتا تھا۔
 ”آپا۔ کتنی دیر انہوں نے کوشش کی کہ اس پر امرار لڑکی کو سمجھ لیں جو تھما سکر رہی تھی۔ اور ذرا آگے گھبراہٹ ہوئی تھی۔ خیر میل کے اس ڈسے میں عورتیں آپس میں کیا بل رہی تھیں یہ غرضوں اچھی کتنے کیے جو دوسرے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔“

”مرزا ب۔ دانیال خان کا صرار ہے۔ میں کام کی تفصیل تمہیں اچھی طرح سمجھا دوں گا کہ تمہیں آنے کی خواہش نہ ہو ورنہ تم مرنے والے ہو۔“ یہی تالیف نہ تھا۔ وہ ہمارے گھر ہے لیکن دانیال یہاں رہتے نہیں کاروبار کے سلسلے میں ملک ملک گھومتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے باہر بھی ہر بار ان کا چکر لگتا ہے۔ لیکن وہ پلٹ کر ہی آتے ہیں۔ کہیں ان کو وطن ہے۔ اور جب وہ آتے ہیں تو گھرانہ کو مکمل حالت میں کھلا جاتا ہے ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کے ساتھ دست احباب ہوتے ہیں جن کی خاطر دربارت کرنا اب میری ہمت سے باہر ہے۔ اس لیے ہمیں کسی ایسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ جیسا ہمت ہو گھر دارن کا تجربہ رکھتی ہو۔ اچھی تنظیم ہو۔ گھر میں ہو۔ نو لے لے گھوٹے ہوئے کاموں کی دیکھ بھال کر سکے۔“

وہ خلا پر تھکتے تھے۔ ساتھ میں بڑی گوشی نے کہا تھا۔ انہوں نے یہ تو بتایا نہیں کہ لڑکیاں ہر صوم صلاؤ ہو کہ نہ ہو۔
 اس کو بتا دیا کہ کپاس پڑوس کی عورتیں ہر سے منوج ہو گئیں۔ کافی دیر سے اس کو کھلائے بیٹھی تھیں۔ اور جو کئی ہوئی اس نے خواہواہش کر اپنے پاؤں پر کھٹائی مار دی۔ اس نے منہ پھیر کر باہر توجہ کر لیا۔
 باہر کے مناظر ہر طرف اندر سے دلچسپ تھے۔

ایک عورت کے بچے نے اس کے کپڑوں کے بالکل نزدیک گریشاب کیا۔ اور اس کا شرعی نقطہ یہ تھا کہ بچہ کا پیشاب پٹاگ نہیں ہوتا۔ وہاں تھے سنبھالے شریعت کے نازک مسئلوں سے بچ سکتی تھی بیٹھی تھی۔ سفر لہا تھا۔ وہ کسی سے جھگڑا مولا لینا نہیں چاہتی تھی۔ کیا رنٹ بننے پائی کی نڈی ہا ہوا تھا۔ مسافروں کا بیشتر زمان بچوں کے ہاتھوں فرش پر گر کر پائی میں تیرا پھر ہاتھ ا سے بہت دیر سے ہوک الگ رہی تھی۔ لیکن کھانا کھاتے کچھ خوف سا محسوس ہوا تھا۔ اور دھر نظر سے چراتے اس نے خالہ فاطمہ

کے کھانے کا فٹن کھول ہی لیا۔

رویاں مسکاتیں۔ ”بھئی وال“ وہی سلاو تین ڈونوں میں پوئی تھیں کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں میں ٹھونس ٹھونس کر بھرا ہوا تھا۔ رحیم چاچا کی بدلیت کے مطابق اسے باہر کے کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سب کچھ کر خاموشی سے کھاتی رہی۔ غیبت ہوا انہوں نے لے والی عورتیں اپنی سیٹوں پر اٹھنے لگی تھیں۔ اس نے خاموشی سے دیکھ کر میں پھلا لیا۔ چپکے سے کہنا سامنے رکھا۔

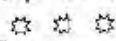
ابھی پہلا لقمہ توڑا ہی تھا کہ اجار کی شیش اس کے سامنے آگئی۔ کھانچکی دھکاس، ہر غصہ اپنا دوسری عورت نے پیش کر لیا۔ خوب کچی ہوئی اور محاس سے شہ چائے بیسری عورت کی طرف سے۔ وہ رحیم چاچا کی بدلیت، بھول کر صمان واری کے مزے لوٹنے لگی۔ پچھلے کافی دنوں سے اس کو غایت پڑ گئی تھی۔ ہر لمحہ اپنی خاموشی ارات کرانے کی اس کا سرخون بھٹ رتک برتے کھانوں سے بھر رہا تھا۔ وہ سب عورتیں اس کو دھکی دھکی کھتی تھیں۔ کڑی روت تھیں اور بول رہی تھیں۔ ان کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔
 پھلا کھائے ڈیسے میں تھنے۔ وان لٹنے والی اشیاء کھلا کر کھال لے جائے گا۔ اور کھائے جا کر کرے گا بھی کیا اس نے تقریباً پنا خالی پر سببیت کر سوجا۔

وہ بہت عرصے سے لوگوں کے غلوں کو جانتے جانتے حیران رہ رہی تھی۔ ایک مدت تک بیلائے اس کو لوگوں سے الگ رکھا۔ گھر آنے والے والے کتنی کے جو لوگ وہ وہ بھی تھے وہ بادی بادی اس نے آنا لے تھے۔ رشتہ دار دور کے تھے یا نزدیک کے سب ہی مطلب بہت اور خود غرض تھے۔ ہاں اس کے بعد زندگی میں جو خور و آس کا انسانیت سے اعتبار اٹھوائے نہیں آیا۔

انگل جھپٹتے تھے۔ پھر صاحب تھے۔ رحیم چاچا کی امان خالہ فاطمہ اور ان کی بہتی۔ اگر وہ وہاں رکھ لی گئی تو سب کا نام نہام تفصیلی خد کھے گی۔ جس میں ہر فرد کا کلمہ بھگدوش کر دیا جائے گا۔

اس نے آسم کے چار کی چابک شکر کے ساتھ وصول کر لی تھی۔ اور کھانے کے بعد اس کی عقلی آہستہ آہستہ چوتھی ری پھلے اس نے جھلک کو شہر میں پڑا تھا۔ پھر عورتوں کو بے تحاشا ہشتاد کچھ کرٹو پیچا ہر پچھت دیا۔ اور یوں ہی انگلیوں سے پکڑ کر اٹھ گئے کچی رہی۔ اس نے تیرہ کر لیا تھا کہ وہ جن لوگوں میں رہے گی ان جتنی بن کر رہی صورت اور چٹائی پر دکھائی دینے والے لوگوں سے بچے رہ جائے۔
 والے پیار نہیں کرتے۔ بہت کم مدت میں اس نے زندگی سے بہت سے دست و پا کر حاصل کر لیے تھے۔
 کبھی کبھی زندگی اتنی بے فنیال ہو جاتی ہے کہ انسان تجرہ کا دیش جائے اور پھر تجربہ کار ہو جاتا ہے۔
 جتنی دیر اس نے الگ تھلک دینا سے کٹ کر زاری وہ ایک بچہ کی رحم ہار میں زندگی تھی۔ محفوظ نامہن شمرنا اب وہ شمرنا میں نہیں تھی۔ دانیال کی گود میں اور اب اس کے پاس وہ رہت۔ کبھی نہیں بچی تھی جس میں سر چھپا کر وہ ظالم سے بچ سکے۔

اس نے ٹھکرا دالی جگہ چھوڑ دی۔ اور ان سب کے درمیان آبیٹھی وہ سال زیادہ محفوظ اور مکمل تھی۔
 ان سب کے درمیان مری پچھلے اسٹیشن سے ٹرین صوبہ۔ جب صوبہ وکر صوبہ کرحد میں داخل ہو چکی تھی وہ وہل کی جیسے آگاہ نہیں تھی۔ رات سن زبان، تعلیم طرز زندگی، بل صرف خلوص اور محبت۔



ٹرین پشاور میں داخل ہوئی۔ رات بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ کینٹ اسٹیشن، کماحول، لوگوں کی تاقہ

مزدور کو واؤدی۔

”یہ سوٹ کیس اٹھاؤ۔“

مزدور نے سوٹ کیس اٹھا کر مختلف قسم کے وسیلہ شدہ تمام فن کیمرے پوٹلی گھڑی سوٹ کیس پر رکھنا شروع کر دیے۔

”اٹھ جاؤ، یہ سوٹ کیس سچھا تھا کہ آپ پر بھی لکھی ہوئی ہیں۔“

”اچھا آپ کے یہاں پر سے لکھے لوگ ایسا سامان لے کر آئیں تو ان کی فیکری ضبط ہو جاتی ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”یہ ضرور آپ کی پالیسی کا کارنامہ ہو گا۔ ان کی مچھلیں آگاہی ہیں۔“

”میں مچھلی سے نہیں آتا۔“ اس نے ساوکی سے کہا۔

”اچھا۔“ وہ تھک کر رک گیا۔ ”بچہ ہماری دوستی ہو سکتی ہے۔“

”یہ بھی ضروری نہیں۔“ وہ وقار سے قدم اٹھاتی اس کے ساتھ ساتھ جیسے لگی۔ اس نے ایک نظر غور سے رک کر اس کی سی ٹی وی کی طرف دیکھا۔ قد میں اس کے کان تک آتی تھی لیکن اپنے بے پناہ اعتماد اور طبیعت کے سکون میں اسے کوئی ہنگامی ہوئی صورتحال نہ تھی۔

پلیٹ فارم کے گھپٹ والے ٹکٹ چیکر اطمینان سے اپنی بیچ پر جابٹھا تھا سارے مسافر جا چکے تھے۔ اگلی لوکل گاڑی آدھی رات کو لڑی کوئل سے آئے گی۔ اس سے پہلے اسٹیشن پر نہ کوئی آنے والا تھا اور نہ جانے والا۔ ان کو باہر نکلا دیکھ کر بھی اس کا ٹھٹھکا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سوسا سوسا خاموش سا پلیٹ فارم باسی پھولوں اور پرانے کانوں کی اس سارے اسٹیشن کو ایک قصوں پلیٹ فارم کی بو سے واؤ رہی تھی۔

وہ سرزد ہی چلتی پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔ اڑیل اور ہندی ٹوکوں کی طرح۔

”کیا لی گئی آپ نے؟“ وہ بھی لیا تھا نہیں۔

”ہاں لیا تھا۔“ وہ جھپٹ کر ایس آگئی۔ جیکر سٹوڈنٹ اٹھان کے پاس آگیا۔ جیکنگ کے سوا اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

”تو جیک کر وائیں نا۔“ یہاں ہماری بھی کوئی عزت ہے۔“ وہ انگریزی زبان کے سہارے اس سے مخاطب تھا۔

”ان کا ٹکٹ چیک کر رہی تھی۔“

”کہاں گیا۔“ وہ کھیر کھیر کر پرس ٹولنے لگی۔ ایک ایک ذب ایک ایک جیب اس نے کھول کر دیکھ لی۔

چیکر اسے تسلی دے رہا تھا۔ آرام سے دیکھیں اطمینان سے دیکھیں مل جائے گا جی اس کے بعد وہ بے زار سا بیٹھا۔ ”ہو گا جی نہیں مل رہا تو کیا ہوا رستے میں سو جاگہ چیک ہوتا ہے۔“ وہ فرائض کی نگرانی کے بعد تھک سا گیا تھا۔ وہ غصے سے اسے دیکھنے لگا۔

”ٹکٹ نہیں ملتا تو بتا دیتیں اسٹیشن پر ہوا لیتے۔ جیکر کے ہاتھوں بے عرقی الگ کر دائی۔ سو ایسے جا کر بیٹھا ہے جیسے احسان کر رہا ہو۔“

”ایسے تو کوئی نہیں بیٹھا۔“ وہ جھینپ گئی۔

”نہیں کیا کولن ہی نہیں رہا۔ یہیں کیس تو رکھا تھا۔“ اس نے بڑا سا پرس گود میں الٹ لیا۔

بھاگ دوڑ میں زندہ زندہ لگ رہا تھا۔ بڑے بڑے نیون سائین سرکری لائٹس مٹا چکے والے کیمبل پر ٹہرین قسم ہو جاتی تھی۔ لیکن بچہ بھی مسافر جلدی میں تھے۔ اسی لیے اترتے وقت انفرافری میں غور میں سترے اور بچے منہ مٹاتی بیٹھے اتر گئے۔ وہ اسے بالکل ہی فراموش کر بیٹھی تھیں۔ وہ اپنا سوٹ کیس سمیٹ کر دروازے تک لے آئی۔ پلیٹ فارم پر کسی تلاش میں بھاگنے والے سب ہی لوگ ایک جیسے تھے اس کے گمان میں تو سارا شرف خان مٹ چکا کسی ٹی نے اس کا سامان بچے ڈال دیا۔ وہ بھی خاموشی سے اتر آئی۔ سرت تھوڑی دیر میں سارا ریش ختم ہو گیا۔ جو ہونے والوں نے اپنے جانے والوں کو ڈھونڈ لیا تھا۔

وہ خاموشی سے اپنے سوٹ کیس پر بیٹھ گئی۔ خان گل بھی اس کو خود ہی ڈھونڈ لے گا۔ وہ ٹریک سے گزرنے والے ہر چہان کو کھور کر دیکھتے تھی۔ ان سب کے طے ان سب کی شکلیں ایک جیسی تھیں۔

چڑوں کے غول کو دیکھتی تو ہوش سوچتی تھی۔ یہ سب چڑیا چڑے ایک دوسرے کو کیسے بچاتے ہیں۔

پلیٹ فارم پر وہی ہی چڑیا تھی ایک جیسے کھیر وار شلوار اور ملاشتیا کرتے ملاشتیا رنگ کی ہاتھی پلاہ کی پگڑن سرخ و سفید رنگت پر وہی بڑا سوچیں۔ اب ہاتھ کیسے جاتے کہ ان میں سے خان گل کون ہے۔

”السلام علیکم۔“ کسی نے پٹ سے فالص پتہ لگے میں سلام بھاڑا اور ڈنگی۔ ہمارے یہاں کسی کو واقفیت کے بغیر سلام نہیں کرتے۔ وہ بیٹھے سے کھڑی ہو گئی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ اس نے غور سے اس شخص کی طرف دیکھا تھا وہ بھی بھان ہی نہیں شاید کوئی بڑھا لکھا بھان تھا۔ حلیہ بھی مختلف تھا اور چہرہ بھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ یہ تو کوئی اور ہے۔

”جی نہیں۔“ اس نے ہلکا سا ہنسی سے کہا۔

”وہاں معیت ہے۔“ وہ بڑا آکینٹ کی طرف چلا۔ گاڑی کی پتلیاں بھادی تھیں۔ پلیٹ فارم کی ٹرین میں داخل ہونے والی ٹاکانی روشنی میں ایک ایک کمر کی میں جھانک کر جیسے کس کو شدت سے دھونڈ رہا تھا۔

”بت سٹر۔“ کسی اچھوتے خیال کے تحت وہ تیزی سے سوٹ کیس سے اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔

”تو میں آپ کا نام خان گل تو نہیں۔“

وہ رک گیا۔ اس نے ایک مرتبہ غور سے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”سب میں نے پوچھا تھا آپ کا نام۔“

”لیکن میرا نام بھی آپ نہیں پڑا۔“

”مجھے تو بے بے کی خطا تھا۔“ وہ ہنست ہنستا بولا۔

”ہو سکتا ہے کہ آپ نے دھیان سے نہ سنا ہو۔“

”کیوں نہ سنا ہو۔ میں بے دھیانہ ہوں یا بالکل ہوں۔“ وہ اس ہانستہ بولا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”ظاہر ہے دوران سرتو میں نے اپنا نام نہیں بدلا ہو گا۔“ اس نے چلی پرس کی ذب کھول دی۔ جیسے یہ لفظ اسے موصول ہوا تھا۔ کتنی مرتبہ اسے پڑھ چکی تھی۔ اس نے جیب سے کھینچ کر نکال لیا۔

”یہ اٹاف۔“

”آہ۔ یہی اٹاف۔ بالکل کوہ۔ خدا کا عکر ہے کہ میری محنت رائیگاں نہیں جاتی۔“ اس نے رات سے

وہ بڑی ہنسی سے اس کے پرس میں سے مگر چپرس دیکھنے لگا۔
”آپ یہ لڑکوں کے پرس میں بھی کیا کیا مرسے دار چپرس ہوتی ہیں صرف وہی نہیں ہوتا چہرہ ہوتا ہے۔“

”بھئی مل جاتا ہے۔“ وہ از سر نو ایک ایک چیز پھرنے لگا۔
”چیکر صاحب بچکے۔“ خان گل نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھا کر ایک سبز رنگ کا ٹکٹ اس کی طرف بڑھا، چیکر نے لڑکی کے بے تحاشا چہرے پر دیکھے بغیر اپنی مائدہ ٹکٹوں کے ساتھ ملایا اور اپنی اسٹنگلنگ دائروں سے تھیں گئے۔

”یہ آپ کی اس کیسے پہنچ گیا۔“ وہ ٹکٹ سے رک کر وہیں کھڑی ہوئی۔
”آپ کے خیال میں میں جیب کتنا ہوں۔ اٹھائی دیکھو ہوں یہ آپ نے اس خط میں رک رکھا تھا۔ لیکن آپ نے لفظ پھر اس کے سامنے لہرایا۔“
”یہ آپ یاد دہرائی گئی۔“ لیکن کرتے ہیں۔ میرا نام بھی اسی اور یہ مذاق بھی اچھا نہیں۔“ وہ جھجکا کر تیز قدم اٹھانے لگی۔

”انہیں نے کوئی مذاق نہیں کیا۔“ لفظ آپ نے مجھے خود پکڑا تھا۔ اب ٹکٹ اس میں پڑا تھا تو میرا تصور ”اچھا“ نہ بن سکا۔ یہ سچی طرح معصوم لگنے لگا تھا۔ اس واقعہ کو بھول ہی گئی تھی جیسے اسٹیشن سے باہر سفر سوار ہوا تھا تمام روک تھام ہو گئی تھیں۔ چوک کی پتلیوں نے کم کرنا چھوڑ دیا تھا۔ سنیما ہاؤس کے باہر اکاؤنٹس کے علاقہ کچھ بھی نہ تھا۔ اپنا قیمتی پرس سنیما ہاؤس کی بڑی احتیاط سے چلتی فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی جیب کے کھلے دروازے کے پاس چاکری ہوئی۔
ڈرائیو واقعی ایسی تھی جیسا اس کے ذہن میں خان گل کا تصور کیا تھا۔ ملائیشیا کی جیکٹ ملائیشیا کے کپڑے کی سی پگڑی موال کی مخصوص جوتی اور منہ میں دوالی سے گھومتی نسوار کا لے سیاہو اٹھوں کو اندر کر کے اس نے سلیٹ مارا۔

”وہ علیکم السلام۔“ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ سلیٹ کے جواب میں کیا کہنے ہیں۔
”میں سے گزری جیسی لی تھی اور ہے۔“ اس نے اپنی سیٹ میں بیٹھنے سے پہلے خان گل کو ٹوکا۔
”میں سے صرف تو مجھے کے فاصلے پر ہے۔“ وہ اس نے موبہ ہو کر کہا۔
”اور ہو سکتا ہے جس بھی لگ جائیں رات کا وقت ہے کیوں کیا واپسی کا ارادہ ہے۔“
”اور تم شاید ہاتھ نہیں پر خور در میں اپنی کشتیاں ہلا آئی ہیں۔“ اس نے جیب کی پچھلی سیٹ پر اپنی جگہ بناتے باہر کے گھور اندھیرے میں بھانکا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح اپنی سیٹ کی کھلے دروازے کے پاس کھڑا کچھ سوچتا رہا، پھر اس کے پاس پچھنے کی طرف گیا۔

”کیہ ہم اسی وقت سفر شروع کریں۔“ میرا مطلب تھا کہ آپ ڈریں گی تو نہیں۔“
”کیا آپ ڈرائے والے لوگ ہیں۔“ اس نے اطمینان سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
”میں نے تو چٹانوں کی دی حریف سنی ہے۔“ وہ جیسپ گیا۔
”اصل میں بے بے نے کہا تھا۔ میں آپ سے پوچھ لوں کیا آپ رات بٹاؤ میں بسر کر کے سفر کرنا چاہیں گی یا نہیں۔“ اس کا لہجہ بڑا اچھا لگا تھا۔ وہ بڑی اچھی اندو بولتا تھا۔ لیکن اس کا لہجہ وطن کی چٹلی

کھا تھا سہاں انگریزی میں اس کو پکڑے مشکلی تھا۔

”میراوش میں کسی کو جاتی نہیں۔“ میرا مطلب ہے ہم ٹھہریں گے کہاں۔“
”ٹھہرنے کو ہم۔“ وہ کوئی تجویز سامنے رکھتے رکھتے جیسپ ہو گیا۔

”آپ جیسا مناسب سمجھتے ہیں ویسے کریں۔“ مجھے تو راستوں کا اندازہ ہے نہ سڑکوں کا۔“
پھر وہ ڈرائیو سے بیٹھو میں بائیں کرسی کے لگاوا ان دونوں کا مضمون سمجھنے سے قاصر تھا۔ لیکن بائیں ٹکٹ کی زبانون میں اس کو کم از کم اتنا تجربہ تو تھا۔ وہ یقیناً ”بھئی“ سفر کرنے اور اپنی سفر نہ کرنے کے فواریہ نقصانات پر بحث کر رہے تھے۔ ڈرائیو کی طرز سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنی جہانے جا رہا ہے کہ وہ ساری عمر ان ہی سڑکوں پر چتا رہا ہے۔ اسے کسی چیز کا خوف نہیں، خان گل اسے قائل کر رہا تھا۔ ہر گز ہمارے ساتھ ایک انجان مسافر ہے۔

اسے ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا۔ لیکن اس کے سوا اس وقت اور مونسو ہی بیا تھا۔ تکلیف کے اتنے اذیت ناک لیم لے اسے کم از کم ایک تجربہ تو کندن جیسا بے ہی دیا تھا وہ انسان کو پرستے کے قاتل ہو گئی تھی سچا اور جھوٹا قاتل اعتبار اور نا قاتل اعتبار۔
پہلی ملاقات میں مخالف کی آنکھوں سے اس کو وہ شعا نہیں نکلتی نظر آتی تھیں۔ جو سیدھی اس کے آئینے ایسے دل پر متکس ہو جائیں اور سارا پیغام اسے دے جائیں اس وقت اس شخص پر اعتبار کرنا مناسب ہے یا نامناسب۔

اور اس کے گمان میں یہ قاتل بھر سہ لگتے تھے۔ ان کے ذہن میں وہ ملازم نہیں تھی تو کر نہیں تھی۔
ذی الحال ان کی ممان تھی۔ جس کی حفاظت اور دیکھ بھال انہیں اپنی جان پر کھل کر کرنی پڑتی تھی۔ بہت دیر کے مہارے کے بعد وہ پھر اس کے پاس آیا۔

”میرا ایک اچھا ہو مل ہے۔“ لیٹ اریا میں وہاں اعزت اور شریف لوگ ٹھہرتے ہیں۔ آج رات آپ جیل بسر کریں۔ تو ہم تو کے کے سفر شروع کریں گے شام ہونے سے پہلے ہی جائیں گے اور اصل آپ کی آڑی ہمارے انداز سے سے کیس زیادہ لیٹ آئی ہے۔“
وہ اعتراض سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جانے وہ ان کا اعتبار جیسی عزت دیتی ہے یا شک کر کے ان کے غلوں کو مایوسی کو جی ہے۔ قبائلی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں باہر کے لوگوں کے نظریات کچھ ایسے ویسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ شبہ سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے بڑے یقین سے اس کا چہرہ دیکھا۔
”میں نے کہہ تو دیا ہے جیسا آپ کو مناسب لگے۔“
اس نے بر سکون گواہاں اس کا نام رکھا تھا تھا۔

یہ پرانی فاکر رنگ کی بیچوں جیسی نہیں تھی بالکل نئی طرز کی ایجاد کہہ سکتی تھی۔ جو خاص بنیادی ڈھولوں کو سر کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اسے ایک مرتبہ ہلانے گاڑوں کی تاریخ بتاتے ہوئے بتایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ راگایا بجاؤ خرید کر پھاڑی علاقے کی میر کو نکلیں گے اچھا اگر راگایا منگلی ہے تو بچلو ہی سی اور اگر وہ بھی منگلی ہے تو کوئی اور سی۔ تو گوشتی تھی جگہ کر کے پروگرام اپنا سیٹ کو دیا۔ اس کو استعمال کی فکر تھی۔ اگر فاصلہ اچھوتہ رہا تو کلاس فائوئس کر کر کی ہوگی۔ بڑی شہنشاہی تھی۔ لیکن ان دونوں

کو گھلتا تھا، ہنرہ پڑاؤ وغیرہ کو مٹا چاہتے تھے اور یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ لپا کے پروگرام کے عین مطابق ایسے ہی علاقے میں ان دونوں کے بغیر روانہ ہونے والی تھی۔

ساری رات ہوئی کے تھما کرے میں وہ ہوئی والوں کا ٹیپ ریکارڈ سننے پر ہی بدلیت اللہ الرحمن بابا کے حکمت پر سو آوازیں مگرا رہا تھا۔ اس نے سونے سے پہلے تک اپنے بڑے کامیڈزک ٹیپ آؤں رکھا اسے براہت اللہ کے گائے ہوئے آؤں کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

اس نے سربیز جیل کا ٹائٹل ٹیپ تک کیا کرے کی، جیلیاں بچائیں اور آؤں کے لاک چیک کیے اور نیم اندھیرے میں شیٹوں سے پرے خاموش رہی پر سکون اور فطری مزوک دیکھتی رہی۔ وہاں سے ذرا آگے، ٹی اے ایف ہیڈ کوارٹر کی بلیاں نظر آ رہی تھیں۔ دوسری طرف ان کا سنیما ہاؤس تھا۔ شاہین اپنا دریاں طرف اسے غشب کا اطمینان اور سکون دکھائی دیا، اتنا اطمینان اور سکون کہ اس کی روح تک سرشار ہو گئی۔

ہوئی کے سترے تھما کر سونے میں اسے زیادہ نہیں لگی۔

ایسے لگا بھی سونے شاید ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کسی نے دروازے پر زور سے دھک دی وہ ہڑبہ کراٹھ بیٹھی شدید تھکان اور نیند کی کمی کی وجہ سے اس کا سر بھاری بھاری تھا پھر بھی دستوں اور جوتوں سے سوئی تھی۔ دھک دیار، سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ مست پر خود اس کی سمجھ میں آیا وہ مانتے سفید کپڑوں میں کھڑا شخص دراصل ہوئی کا پیرا تھا وہ رات بھر اپنے گھر کی آرام نہ بستر نہیں بلکہ گھر سے بہت دور کسی ایسی جگہ کے نیچے تھی۔

پیرا پیرا پیغام رہا تھا جو اس نے نیند سے بندھوئی آنکھوں سے بخش سمجھا۔

”خان کل صاحب کا پیغام ہے آپ جلدی ہو کر پکڑیں۔“

”آہ۔۔۔“

اسے واقعی کہیں جانا تھا اس سے آگے اور آگے شاید اس کا سفر ختم ہو شدید کسی نہ ہو پھرے پر تاقہائی کے چیمینز نے اسے کچھ یاد دلایا۔ پیرا اس سے ناشتے کا پوچھ گیا تھا۔ پیرا اس قدر ساہ ناشتے کا آرڈر تھا کہ فوراً ہی واپس آیا اس نے ساہ جائے ہی تو منگوائی تھی۔

اس کا سامان بھی اسی طرح ایک کونے میں رکھا تھا۔ اس نے تو رات کے کپڑے تک نہیں بدلے حالانکہ وہ کپڑے بدلے بغیر سونے کی عادی نہیں تھی۔ سو اب اس کو جلدی تیار ہونے کے لیے اور کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ اس نے چائے کی پہلی منہ سے لگائی اور ختم کر دی۔ پھر اس نے دوسری پیالی پانی۔ اس طرح وہ پیرا میں منٹ میں بالکل تازہ دم تھی۔

اس نے منہ ہاتھ دھویا کپڑے بدلے، بالوں میں برس بھیرا اور جوگز کے تسمے کس لیے اب وہ سڑ کے لیے بالکل تیار تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا وہ کیوکر خان کل صاحب کو اطلاع دے گا کہ وہ ہر طرح کے سفر کے لیے تیار ہے۔ ہوئی اطلاع حق کا مٹن دیا اور مہمان قسمت کی طرح پیرا خان کل کی اطلاع کے ساتھ آیا۔

باہر راہداری میں بیچے خوش رگت کا سبب وہ تھکا اس کا انتظار کر رہا تھا وہ پلٹا تو پلاٹل میں مسکراؤں یہ عجیب بات ہے کہ کل اس نے اس کے ساتھ امیشیں سے ہوئی تک اسفر کیا تھا۔ لیکن اب

وہ اس کا چہرہ بالکل بھول چکی تھی۔

اس نے گریں ٹھکانی اور مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں ریتیں دیکھ کر وہ ہزبڑ ہو گیا۔

”کیا میں شکل سے تنہا لگا ہوں؟“

”ہرگز نہیں۔“ سوٹ کیس کا تھما پھول پر کھینچی وہ اس کے ساتھ چلی آئی۔

”برا صمیم صاحب کا سامان پکڑو۔“ اس نے میرے کو ٹوکا۔

”میرے پڑے اچھے نہیں ہیں۔ میں نے شیو نہیں کیا کیا بات ہے؟“ وہ دانت کاٹ کھانے کو رو رہا تھا۔

”شاید اس لیے نہیں پڑی کہ آپ کے کپڑے بھی اچھے ہیں، آپ نے شیو بھی کر رکھی ہے اور آپ شکل سے شریف آدمی بنی لگتے ہیں۔ دراصل ہمارے پاس چٹانوں کا ایک خاص تصور ہے یہ وہ کہ وہ نیچے پکڑے، قہنجی چھری تیز کرتے اور دلیاں چلا لیتے ہیں۔“

”ہاں ہم کو لیاں چلا لیتے ہیں، قہنجی چھری تیز کرتے ہیں اور بچوں کو بھی پکڑ لیتے ہیں، خاص طور پر بکڑے بچوں کو۔“ وہ سامان سے لڑا۔

”ہمارا گھر یہاں سے بہت دور ہے۔ آپ نے کلام کیا ہے۔“

”نہیں۔“

”چھ کلام سے ساڑھے تین گھنٹے کے فاصلے پر ایک چلی وادی میں رہتے ہیں۔ دراصل وادی وہاں خود رہتی ہے۔ ہم لوگ تو ادھر ادھر رہتے ہیں، بیسی خان صاحب ہمارے دادایا پتا نہیں پڑو دادا اچھے آپ دیکھیں ان کی تسمے تارے تارے سے ضرور محبت کریں گی۔“

”ہوں نہیں۔“ اس نے اس کے ساتھ نشستے تری شرات بھی فراخ دل سے کہا۔ ”میرے دل میں بہت وسعت ہے۔“

”لیکن آپ کلام تک بھی نہیں سنیں۔ بواہت کیا ہے۔“

”نہیں۔“

”آپ پہلے کبھی پشاور آئی ہیں۔“

”نہیں۔ میں تو لاہور سے چلی وادی پہنچی ہوں۔“

وہ اس کی طرف دیکھ کر ایک تخت چپ ہو گیا اس نے غالباً ”بھئی سوچا بھی نہیں تھا کہ روزگار کی تلاش میں انسان کتنی معیوب آجاتا ہے۔“

”معاف کرنا پتا نہیں میں نے بواہت کتنی میں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچاوی ہو۔“

”بے فکر رہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہاں اگر آپ کی وادی واقعی خوب صورت ہے تو آپ ولوی میں کیسا نہیں رہتے؟“

”وہ یہ لگی کہانی ہے۔“ وہ اس کے لیے جیب کے پچھلے حصے میں کشن جمانا ہوا بولا۔ ”اور زندگی مختصر۔“

وہ بے ساختہ فیس پڑی، گڑھی بیسی خان میں سنیما آؤس ہے۔ ”وہ وہ بدہ نتیجہ دیکھ۔“ میں اگلی بیٹ پڑو پڑو کے ساتھ ہوں کسی چیز کی ضرورت ہو تو شیشہ بجا دیں۔ اور کناہوں کی مہائی مانگ کر سڑگریں۔“

ہو سکتا ہے۔ آپ کی زندگی کا آخری سفر ہو۔“
ہر چند کہ وہ اس کی طبیعت کے مذاق کو اس مختصر سی ملاقات میں سمجھ چکی تھی۔ لیکن وہ دہشت زدہ ہو گئی۔

راکی جھٹکے سے چلی منبر کے شروع کرتی ہی اس کا ذہن تیزی سے سفر کرتا تھا۔
راکی والپس نو شہر تک آئی تو وہ اپنی زندگی کے کتنے ہی واقعات دہرا چکی تھی۔ حالانکہ اس نے خود کو کتنی مرتبہ تنبیہ کی تھی کہ وہ قبروں کی مجاور نہیں بنے گی۔ لیکن شاید جبریل پر ہماری کام آتی مضبوط نہیں ہوتی۔

ہوتی۔ سو وہ آٹھ گھنٹے پہلے ہی اس کے پاس پہنچ گئی۔
یہ عام سی سڑک تھی۔ سبھی شہر آ جاتے تھے۔ کچھ گاؤں، کہیں سوکھے سنگلاخ بھاڑتے تھے۔ کبھی بھلا بھلا سبز و نظر آنے لگتا تھا۔ نہیں کیوں وہ لڑکا خان گل اپنے علاقے کی اتنی تعریف کرتا تھا۔ شاید سبھی لوگوں کو اپنی رائے کی جگہ اتنی چھی لگتی ہے۔

رسالہ پور مردان، سکوٹ اس نے کتنے ہی شہر کا قول کے پور پور پور کر کر اور لے۔ وہ جغرافیہ سے نااہل نہیں تھی اور ماڈرن ایجادات کتنی ہی چیزوں کو بغیر جانے کھا دیتی ہیں۔ لیکن آنکھوں سے دیکھنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے پاس پہلوں کا تھملا اور بسکٹ کے ڈبے رکھے تھے جس سے ظاہر تھا کہ چھان بست مردان قوم ہے۔ یوں دیکھا جائے تو وہ ایک ایسی ملازمت کا انٹرویو دینے جا رہی تھی۔ بھلا اس میں اور ڈرامائیوں کی کیا فرق ہے۔ شاید تو ڈراما ہی تھا۔

جب ایک جھٹکے سے رکی اور خان گل چھلانگ مار کر کیے اتر گیا۔ وہ بہت سکون سے ٹکیوں سے ٹیک لگائے ساتھ ساتھ دوڑتی ریل کی لائن دیکھ رہی تھی۔
”آپ تو ابھرا کر رہی ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ ہم امن سیکس لے لیتے ہیں آپ رات کا کھانا کھائے بغیر سو گئی تھیں، صبح ناشتا نہیں کیا۔“
”توئی بہت بعد کوئی اس کا اتنی شدت سے دھیان رکھ رہا تھا وہ ممنوعیت سے مسکرا دی۔“
”صرف مسکرانے سے کام نہیں چلے گا، میرا خیال ہے میں آپ سے اتنا برا تو نہیں لیکن مجھے براہین کر دیکھنا پڑے گا۔“ وہ اس کو رعب تلے رکھ کر سرشار ہو گیا۔

وہ گاڑی سے اتاری نزدیک بننے والی منبر سے ہاتھ منہ دھو کر تین چار گھنٹوں کی مشقت اناری۔ نزدیکی ہوئی سے قہقہہ بپا، کیلے اور ماننے کھائے چند وہ بیس منٹ کے آرام کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھی تو ہشاش بشاش تھی۔

”ہاں۔“ وہ دروازے لاک کر تھک گیا۔ ”تھنڈ ڈیڑھ گھنٹہ بعد تھنڈا علاقہ شروع ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے آپ کے پاس گرم کپڑے ہوں گے ہی نہیں۔ یہاں اس باکس میں ایک کیل پڑا ہوا ہے۔ وہ نکال لیجئے گا۔“

اس نے باہر گرمی کی طرف دیکھا۔ سورج تھمنا رہا تھا وہ بار بار اپنے سینے میں مساجاتی۔ بھلا اسے کیل کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ گاڑی کا کسی ہی بند کرنا پڑے گا۔
لیکن شکر کو گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ راکی نے بار بار سرسوں پر مڑنا شروع کر دیا۔ انداز ہی دیر میں گاڑی

میں گرمی ختم ہو گئی اور جب وہ دوسرے کھانے کے لیے منگورو کے ایک ہوٹل میں رکنے تو قبل کے دلوں طرف بٹنے والے پہاڑی بالے نے فقنا کو خشک کر دیا تھا۔

نئی دھن کے ساتھ سوئی کپڑوں میں وہ ٹھہر رہی تھی، دائیں طرف مینگیور کا بازار تھا جہاں پر ساری دنیا کا سپورٹس سامان سپرو تفریح کے لیے آئی ہوئی خواتین و حضرات خرید رہی تھیں۔

اس کو اپنے گمان سے کہیں زیادہ سردی ملک رہی تھی۔ چھان لگن دار اپنی زبان میں مول قول کر رہے تھے اس نے ہچکچاتے ہچکچاتے خان گل کی طرف دیکھا۔
”میں ایک مثال خرید لوں۔“

خان گل خجل ہو گیا غالباً اس خیال سے کہ اسے یہ خیال خود کیوں نہ آیا، وہ پہلی دکان میں گھسے اور وقت ضائع کیے بغیر اپنی بولی بول کر ایک بیڑی سی سفید مثال خرید لی۔ جس پر فاسٹ سے سوائی کو سنا ہوا تھا، وہ اسے برس کی زپ کھول کر تیران پریشان اس سے سوال کرتی رہ گئی۔ کتنے پیسے، کتنے پیسے؟ کہ اس نے ادا کیا، کبھی کر دے۔ بھلا کو یہ سب اچھا نہیں لگا اس کے پاس اب بھی ضرورت پھرے تھے اس نے یہ یہ اچھا نہیں کیا۔ اور وہ اس کے تھکار کر کے ناراض ہو کر راکی میں جا بیٹھا۔

”کپ سہمان ہیں آپ سے پیسے لیتے اچھا لگے گا؟“ وہ سمجھ گئی اس کا مطلب تھا کہ آپ ہماری تنخواہ وار ملازم بننے جا رہی ہیں۔ اور شاید ان کی terms condition میں روٹی پڑا بھی شامل ہو۔ تاہم اس کی خود راہی پر غصہ کی پڑی۔

گاڑی میں بیٹھے سے پہلے وہ بھی مجیدہ ہو گیا۔ وہ برس کھول کر اصرار کیے جا رہی تھی۔ افسوس کہ اس نے خان گل کو ادا نہیں کرتے تھیں دیکھا تھا وہ اس وقت کھلی کے کاموں پر بیٹھے خوب صورت پرندوں کی طرف دیکھنے لگی۔

خان گل نے رخ سے پتلون میں سے رسید نکالی اور اس کے حوالے کر دی۔ ”ہمارے یہاں مہمان کا بہت احترام ہوتا ہے۔“ وہ ہنست چہکا کر رہی وہ اس کو کیا جواب دیتی یہ بھی اس نے باجہ بٹنے کی کوشش کی۔

”دیکھو بھی۔“ اس نے اپنا بیت سے کہا۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے۔ آپ مجھ سے بھولنے ہی ہوں گے اور ہمارے یہاں رواج ہے کہ چھوٹیوں سے چیز نہیں لیتے۔“
”ہیں۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”آپ اپنا شناختی کارڈ دکھا لے۔ میں اپنا نکالنا ہوں۔ جو چھوٹا ہو گا وہ ہمارے گا۔“

”ہوں۔“ اس نے جبکہ کر کارڈ نکالا اور پیش کر کر اچھل پڑا۔
”وہاں میں آپ سے پورے پچاس سال پہلے اب آرام سے بیٹھے۔“
”لیکن وہ آرام سے بیٹھے ہی نہیں سکی۔ بہت جلد ڈرامے والے راست شروع ہو گیا تھا، کھانسیں میں

ٹھٹھکیں مارتا رہا اور دوسری طرف آسمان سے باتیں کرتے رہا۔ ٹھٹھکیں کے تناؤ و درشت خدیاں اور بادام کے شگوفوں سے لدی ٹھٹھکیں۔ لیکن وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ سفر میں عزائم نہ لی سکی اور کارنگ کمپانیوں کی زمین ایسا مرغ اور خیا لا تھا اور وہ اس قدر غصے میں اٹل رہا تھا جیسے ساری دنیا سے ناراض ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چٹا دیو بیکل پہاڑ جیسے اس کے خوف اور غصے سے ملبور تھا۔ سڑک خشک اور سنگلاخ تھی۔ یہ بار بار جھٹکے بھی کھا رہی تھی اور راز اس لاپرواہی سے چپ بھٹکائے لے جا رہا تھا۔ جیسے

کوئی خاصاچہ اسنے گھر کے اینٹوں والے آگن میں تین پھول کی سائیکل دوڑائے پھرے۔
ان کو سڑک پر گرنے آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے اپنی زندگی میں اس نے بھی اتنا طویل سفر نہیں کیا تھا وہ
جیسے ان آٹھ گھنٹوں میں نئی دنیا میں آگئی تھی۔ یہاں تک بھی تھے تو بہاؤں پر چوٹی سے اس تک ایک
ترتیب سے بنے ہوئے اور شاہ بلوط کے آسمان سے باتیں کرتے تھے جنگل جنگلی اتنی بڑھ گئی تھی کہ مثال
اور نہ کرکیل میں لیٹ کر بھی وہ کھپکھپا رہی تھی۔

شام کو چھٹ پٹے سے ذرا پہلے اس کی جیب سے سڑک کے درمیان اور ایک اور چھوٹی سی نکلنے والی
سڑک کا راستہ لیا۔ یہاں دیویش پہاڑ کے پتھروں سے وسیع بنہ دار تھے۔ پھاڑوں سے اترتا آٹھاروں کا
شٹاف مانی ان کی سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے وہ پتھریں کمال جا رہے تھے اور کب تک چلیں
گے اس نے شب سے جھانکا وہ دونوں دکا مارا نہیں کر رہے تھے۔

جب سے اس چھوٹی سڑک پر موڑے تھے اچانک اس بستی میں کام کلن اور ترقی کے اثرات نظر آ رہے
تھے سڑک تو تقریباً "کسی ہی جی صاف تھی لیکن بہت تنگ۔ لیکن اتنی خطرناک نہیں تھی۔ یہ سارا
راستہ ڈھلوان کی طرف تھا چاروں طرف مرغزار تھے خوشا ہرے بھرے اور رشتوں سے لدے پھندے
پہاڑ سڑک کے کنارے کنارے بڑے پتھروں پر چوٹے سے سفیدی کی گئی تھی۔ دور دورے کے خاردار
بادوں کے بازوہ نظر آ رہی تھیں۔ اس کا اندازہ صحیح تھا وہ ان کی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔

بلند و بالا دو قامت اینٹوں کی قلعے جیسی دیوار کے درمیان لوہے کا بڑا سا چنگ لگا ہوا تھا "اور اس
آہنی سیاہ گھسی کی دوسری طرف انسانوں کی ایک اور دنیا آباد تھی۔ جیب کے ہارن کو وہ شاید اچھی طرح
پہچانتے تھے اچانک اندر بھٹک کر بیٹھ گئی۔

پہاڑ کا تھا تو سیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا سڑک اس جہانک کے بعد بھی کہیں سیدھی کہیں پھووار
چلی جا رہی تھی دونوں طرف آگے سبز و زاروں میں درخت پہلوں سے لدے ہوئے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر اس
ناہوار سے بارگ کے درمیان چلتے چلتے عمارت کے پورشن میں آکر رک گئی۔ راستے کے سارے آثار
قبائلی تھے لیکن یہ عمارت جدید اور پختہ طرز کا انتہائی کمونہ تھی۔

کسی شخص نے آگے بڑھ کر جیب کو پیچھے سے جھپٹ کھولا وہ خاموشی سے اتر گئی۔ سفید مثال کھدو حوال
پر اچھلا گئے۔

گھر کی عمارت کا لان باہر سے بارگ سے بالکل مختلف اور ترتیب سے سجا ہوا صاف ستھرا تھا اس نے
خاموشی سے ایک اچھتی سے نظر عمارت پر ڈالی سرخ رنگ کی باریک اینٹوں سے بنی عمارت پر قدم طرز کے
آرائشی لیمب آویزاں تھے عمارت کے خرابی طرز کے دروازوں کے دو قوں طرف ناگزیر گاہن اویزاں
تھیں۔ پورشن سے باہر لان میں قدم پلٹ فارموں پر تیل سے چنے والی لیمب کے طرز کے کچھ گڑھے
تھے۔

خان محل اعلیٰ سین سے اتر کر دروازہ کھولنے والی لڑکی سے علاقائی زبان میں کچھ بولتا اس کی طرف گھوم
گیا۔

"اس کا نام مریم ہے آپ کو بے بے کے پاس لے جائے گی۔"
مریم نے خان محل کی انگریزی زبان میں بولی جیسے ساری بات سمجھ گئی ہو اس نے سر ہلا کر پیچھے آئے کہ

کمال عمارت کے اندر وہی حصے میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹھک جی گئی۔ لمبی سی میزوں میں بیٹنے والی روشنیوں
اور اس کے ارد گرد نظر آنے والے کمروں کی ایک جگہ سی نظر نے اسے ڈرایا کچھ پورا کا پورا ایک سلیقہ
انتظام کا نہ بولتا ثبوت تھا انہیں مزید کسی منظم کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ سوائے چند ایک
چیمبر کے "مسلا" دروازہ پر پلٹنے کی کی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

یہیں وہ لوگ اس کی دل آزاری کا سبب بنے۔ مریم بار بار آگے نکل جاتی پھر وہ رک کر اس کو آگے
نکلنے کا موقع دے کر حتی المقدور اس کے پیچھے پیچھے آنے کی کوشش کرتی۔ اس دوران اس کی پھولی ہوئی
شلوار کا گلیز خوب سر سر کرنا آگے پیچھے ہوتا رہا۔

غالباً "خاتون خانہ" رعب اور دیدے کی مالک ہیں۔ حالانکہ وہ خط میں کتنی بیاری، کتنی مہربان لگ رہی
تھیں اس کے قدم چلتے چلتے انداز میں چلتے چلتے اس کھلے دروازے کے پیچھے رک گئے۔

آتش دان میں لڑکی کی آگ دیکھ رہی تھی۔ جس سے آتش دان کا اندر دینی تابیاب کر سمن ہو رہا تھا
وہ سوئی سے قشقری تھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا وہ ایک دن روٹی نائنے والوں کی طرح کاپٹی کر دیتی
لو کی کی تلاش میں ہی عورت کے در پر پہنچ جائے گی۔

آتش دان کے نزدیک بیٹھی لڑکی نے ایک مغور نظر اس آنے والی لڑکی پر ڈالی اپنی زبان میں دوسرے
صوفے پر کھلے دروازے کے خاتون سے کچھ کہا۔ مریم بھی ان سے کچھ بولی رہی۔

وہ کمرے کے صحت میں پاؤں فرش پر پیچھے پالین میں گاڑے اور نظریں اٹھائے "السلام علیکم" کہنے
کے بعد اسے اب تک خاموش کھڑی تھی۔

"و علیکم السلام میں تو تمہارا دست پر سے انتظار کر رہی تھی۔" خاتون کا لہجہ بہت شفیق تھا۔
"تم لوگ کچھ لیٹ ہو گئے۔" انہوں نے کمال اپنے گھٹنوں پر ٹھیک کیا۔

"راستے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔"
"جی نہیں۔" اس نے سکون سے گھر کران کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"تم بیٹھ جاؤ۔" تھکی ہوئی ہوئی۔ "شیریں۔" انہوں نے اپنی زبان میں اس مغور لڑکی سے کچھ کہا اس نے
ایک طائرانہ نظر اس پر ڈال کر کھوٹا دیا۔ اس نے اٹھتے اٹھتے مریم سے کچھ کہا "الحکامات کا لہجہ عمارت
کی فون۔"

"تم آگ کے پاس بیٹھو۔" وہ غالی کی ہوئی کر کر کر سکون سے بیٹھ گئی۔
واقعی اس وقت حرارت کی شدید ضرورت تھی۔

"تمہارا کمرہ سجایا گیا ہے۔ شیریں ایک نظر دیکھنے لگی ہے۔ تم چائے پی کر آرام کرو بہت لمبے سفر سے
آئی ہو۔" مریم نے خاموشی سے چائے اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔

"میں بنائی ہوں تم جاؤ۔" اس نے چائے والی کے اوپر سے فی کوزی اٹھاتے ہوئے کہا۔ مریم اس کی
زبان نہیں سمجھی اسے حیرت سے دیکھا اور واپس ہو گئی۔

"لاہور میں موسم کیسا تھا۔"
"یہاں کے مقابلے میں تو بہت گرم تھا۔ آپ کتنی چٹنی لیس کی؟"

"تو پیچھے ہر تو تم کوئی گرم کپڑا نہیں ملائی ہوگی۔"
39

اس نے حیرت سے اس مہمان خاتون کی طرف دیکھا جس کو اندازے لگائے میں کمال حاصل تھا اس نے بھی ایک لمحہ ہلکے بغیر سکون سے کہا۔
 ”جی ہاں کوئی گرم پڑا نہیں لائی تھی کہ یہ شمال بھی راستے میں خریدی تھی۔“
 وہیں دیکھ رہی ہوں۔ ”انہوں نے یقین سے کہا۔ ”یہ بیس کی مثال ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ سے چائے کے گھونٹ لے کر بصرے گئیں۔ وہ لوگ شاید یہاں ملے رنگ کی چائے پینے کے عادی ہیں اور وہ ان کی چھٹی ہوئی تھی کہ اس کا جی چاہا رہا تھا۔ وہ لاہور جیسی کوک چائے پی کر سر میں لٹ کر خوب کروٹیں لے کر تھکن انار سے لیکن اس نے سکون سے چائے پی ٹاؤک سی پانی خلی کر کے اس کے ساتھ کی حسین خوشی میں رکھ دی۔
 مرحلہ کوئی اطلاع لائی کہ شہر میں اس کے کمرے کو آخری نظر ڈال کر اڑے کر دیا۔ انہوں نے مرحلہ کو کچھ ٹھیکہ کیا۔ ”خالی“ یہی کہ اس کو اس کے کمرے میں چھوڑ آئی اس کے بعد وہ سکون سے چائے کے گھونٹ بھرے لگئیں۔
 وہ مرحلہ کے ساتھ ساتھ چلی اس کا کمرہ رہائش کمرے کے آخر میں برآمدوں کی طرف تھا اس نے کمرے میں داخل ہو کر چاروں طرف نظر کی۔ ایک کمرہ ایک ڈرنک روم اور اس کے ساتھ باقہ روم یہ اس کی کل جاگہ تھی۔
 مرحلہ اسے چھوڑ کر چاچکی تھی۔ وہ کمرے میں پرے فریج پر اس سے متعلق چیزیں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ سوکتا ہے کہ یہ لوگ اسے ملے ہوئے ملے ہوئے سوسے چھوٹے ہاں تک آگئی تھی۔ یہاں سے والوں کا کوئی راستہ نہیں تھا اس نے گھر کر کھڑکی کو دیکھا۔ آبی کی دھڑک سی تیل سامنے والے ستونوں سے لپٹی اس کی کھڑکی تک آگئی تھی۔ کمرے کے پیچھے پڑا کتبہ واساحہ نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے عین نیچے سارے خوش نیلے پھول لہرا رہے تھے۔ اس نے دوبارہ کھڑکی بند کر دی۔
 مرحلہ اس کے لیے کھینچی ہوئی ایک بیگ لائی اور اپنی زبان میں سست کہہ کر چلی گئی۔ وہ تشریف لے گیا۔ وہ جیسی رہی پتا نہیں اس کو یہاں کیا کرتا ہے۔ سوتا اسٹیکل کرنا ہو گا یا بیوٹن بیوٹن لکے لے جانی ہو گی۔ وہ پریشان ہوئی۔ وہ یہاں سے بھاگے بھاگے مرحلہ کی جانے کی دھڑک نہیں سکتی۔ اس نے اپنے کمرے اور لہجہ کی خاردار آوازوں سے بچ کر وہ کہاں جا سکتی ہے۔ اس نے سوچا کہ کس کاؤ مکن ڈرنک روم سے نکلے اور شرمندہ ہو کر کر ایا۔ اس میں مختلف رنگوں کے سونپڑ اور شالیں پڑی تھیں اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور فرصت سے چیر ڈال کر جانچ لیتے گئے۔
 یہ خراب لمبا چڑا کمرہ تھا۔ بہت اونچی چھت والا اس لیے کھڑکیوں کے پردے سارے کمرے میں پھیلے نظر آ رہے تھے۔ وسط میں ایک بند تھا اور اس کے نزدیک سائیڈ ٹیبل اس نے اپنا بیگ وارڈ روپ میں کھڑا کر دیا۔ ابھی تک اس کا شروہ نہیں ہوا تھا۔ ”انرو“ ہو چکے تو اس کی رہائش درم رہائش کا فیصلہ ہو گا گرم کپڑوں والا سوٹ کیس بھی اس نے سائیڈ پر کھڑا کر دیا۔ اوپر اس میں نصب ایک چھوٹا سا دی کی آبادی اور دنیا سے اپنی در اندہ سامان بغیر اور ایسا جدید رہن سن وہ سوچ میں پڑے تھے۔ پتا نہیں اس کو یہاں کیا کرنا ہو گا۔
 کئی دیر اس نے اپنی خواہش کے مطابق کوٹیں لے کر تھکن اتاری شاید اسی میں تھوڑی سی غیظ

بھی آئی۔ کئی ی او گئے نے ہی ساری تھکن اتاری۔ سامنے الائی کے درخت پر کو اپنی چھٹی ہوئی آواز میں کانیں کانیں کر رہا تھا۔
 باہر اندھیرا چل گیا تھا۔ اس نے اچھ بھا کر پی وی آن کیا۔ بیٹل غیروا وضع اور مہم سی قرابت کوئی دور دراز کا کشیشن رہے کر رہا تھا۔ اس نے پی وی آف کر دیا۔ اس نے کس کن لین بیٹل شدت سے بھوک لگی تھی۔ عین اسی وقت چراغ کے جن کی طرح سرخ اس کے سر پر چڑھی۔ وہ بیٹل شدت سے بھوک لگی تھی۔ اس نے پوری توجہ صرف کر کے بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن ایک لفظ بے نہیں پڑا۔
 ”کھانسی مریم! میں تمہاری زبان سمجھ سکتی۔“ اس نے سسٹرائٹ بے بی سے کہا۔ ”زبان یا رہن ترکی۔“ لیکن وہ ایسی طرح جی رہی۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں۔“ اس نے کئی دفعہ اثبات میں سر ہلایا۔
 ”وہم سے اچھی تو یہ رہی۔“ اس نے بے بے کے بھوکاٹے ہوئے سونپڑ میں سے ایک پڑھایا مثال کندھوں پر ڈالی اور باہر نکلی۔
 رہائش کمرے سے آگے مرحلہ اس لیے لے چلی اسے ابھی یہاں کا جغرافیہ اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ جس طرف مڑی تھی۔ غالباً کھانے کے لیے گئی تھی۔ جیسے بیس میں کھانے کے کمرے ہوتے ہیں۔ جھوٹی ٹیبل کے لیے نشستہ ایک چھوٹا اور لٹکیشن کے لیے ایک بڑا بال طویل و عریض تھا۔
 ”تمہاری تھکن کچھ کم ہوئی۔“
 ”کھانسی بہت بہت میں نے خوب آرام کیا ہے۔“ وہ اپنی کرسی گھنٹ کر ایک نظر حاضرین پر ڈال کر بیٹھ گئی۔
 ”کافی دیر ہم نے تمہارا انتظار کیا۔“ بے بے نے ایک معذرت کی تھوڑی سی ڈالی۔ وہ بے توجہی سے اپنا سوپا پی رہی تھی۔
 ”خان گل نے بتایا تھا کہ پنجاب میں رات کو لوگ چاول کھاتے ہیں۔ میں نے خاص طور پر اسی لیے خانہ سال سے کما چاول ملے کو۔“
 ”تھکے تک یہ۔“ اس نے ایک نظر خان گل پر ڈالی۔
 ”بہت بھوک لگی ہے بے بے۔“ اس نے بے بے کو روٹیں منگوا کر کہا۔
 ”تو ڈالونا جان بے بے مہمان کو روٹ چکے۔“ وہ چٹکڑی تھی یہاں مہمان کو صرف مہمان کے نام سے پکارا جا تا ہے۔ اس کا نام لیا جا تا ہے۔ اس کا کوئی رشتہ ہو تا ہے۔
 وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کھانا تم کے سنہری قندریا تو بال کے دروازے پر نمایاں نظر آنے والے کلاک میں اس وقت بونے سات بچے تھے وہ ایک اکیلی ان میں اجنبی تھی۔ لیکن اجنبیت کی یہ دیوار چاروں کے درمیان مائل ہو گئی۔ خانوٹھی سے کھانے کھانے اور تھوہ کے بعد بے بے نے اپنا کوشیہ سنبھال لیا۔ وہ پتا نہیں کس کے لیے کیا بن رہی تھی۔ اوئی ملائیوں کی نوکری سنبھال کر وہ آٹس وان کے پاس جا بیٹھیں۔
 ”مریم اپنی زبان میں معذرت کر کے چلی گئی تھی۔ خان گل وہیں کھانے کی میز پر بیٹے ہلے جہازی سائز آڈوٹوں کے کچھ جھلکا رہا ہے۔ بے بے نے ایک نظر پٹا پر ڈالی۔
 ”ہم کو ہا کا قاعدہ ہے ہم رات کا کھانا کھا کر کچھ دیر ساتھ باتیں کرتے ہیں تمہارا دل کر تا ہے تو تم بھی

بھی اسے لگتا وہ جڑا گھر میں سو گئی ہے یا ہر چنگی درندے کو سناڑتے پھر رہے تھے۔

رات کی بے آراہی کے باوجود اسے جلدی انتہا درجہ پر ابھی لوگ سحر خیز ہوتے ہیں بلکہ یہاں تک سنا ہے کہ آدھی رات سے اٹھ کر فرش و صحنہ شروع کر دیتے ہیں۔ فرش دھوئے کاروان تو یہاں اکمل ہو گا۔ ہاں البتہ صبح تو جلدی ہوگی سوکھے گوشت کا ناشا اس نے زندگی میں پہلی بار کیا وہ لمبے لمبے دہنے کے گوشت کے سکھائے پارے تھے جنہیں کچی میں تل لیا گیا تھا وہ انہوں میں ربڑ کی طرح پھینکتے تھے۔ ناشے میں دو قسم کی چائے تھی گلابی کچی اور کالی کچی، علاوہ انہیں وہی ذیل روٹی، مکھن اور پیڑیہ بھی شاید خان کل نے رکھوائی ہے۔

بہر حال دونوں کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ انھیں اسے میز پر اسے لوگوں کا انتظار کرنا کچھ کرے بے پناہ تھا، ہم ناشا شروع کر دیا اور کوئی نہیں آئے گا۔ شہر میں پتلو روپس پہلی گئی ہے۔ وہ بوئوروشی میں پڑھتی ہے جس کی چھٹی گزارنے میرے پاس آجاتی ہے خان کل اس کو بچھوڑنے گئے ہیں۔ وہ ذیل روٹی پر پیڑیہ کی ہلکی سی تہ جھاتی ایک دم رک گئی۔ بے بے اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"اگر وانیال آجائے تو تم سے بات چیت کر لینے میں چاہتی تھی وہ یہ مسئلہ خود حل کریں۔"

"آپ کے شوہر یہاں نہیں ہیں کیا؟" اس نے ذیل روٹی کا ٹکڑا اٹھتوں سے توڑا "شوہر" انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "اوہ دراصل وانیال اس گھر کے مالک ہیں۔" انہوں نے سکون سے کہا۔ "میں تو ان کی دور پار کی رشتہ دار ہوں کہ یہ تو ان کی محبت ہے کہ بیدگی کے بعد بھی وہ مجھے تنہا چھوڑنے کے بجائے یہاں لے آئے میں یہاں میں تھی۔" وہ اپنی کم عقلی پر ماتم کہیں چپ کی چپ رہ گئی۔

"تو آپ کے عزیز وانیال خان میرا اعز رو کریں گے۔"

"نہیں انہوں نے مجھے اختیار دیا ہے لیکن میں بونسی سوچ رہی تھی میں اتنا ہی ہے تمہاری۔"

اگر کوئی کے بقول اس نے جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا ہو تا اور دو ماہ، ٹھہر جاتی تو کن یقین سے ایم اے کہہ سکتی تھی۔ لیکن اس نے امتحان نہیں دیا تھا اور پے در پے ہنگاموں کی وجہ سے امتحان کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

"نئی اسے" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھ اپنے والدین کے بارے میں پتا؟"

"میری ماں بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔ والد کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔"

"بہن بھائی؟"

"کوئی نہیں ہے۔"

"عزیز! حجاب کر شے دار؟"

"نہیں۔"

"اوہ۔" دکھ سے ان کا چہرہ اتر گیا غالباً "ان کو یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ یہاں تک کیوں پہنچی ہے۔"

"مجھے تو بس یہی تشویش تھی اتنی سی عمر میں زندگی کیا کچھ کر ڈالتی ہے یہاں کام زیادہ نہیں۔ دراصل

یہ بھونچا۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر کوئی کیفیت میں تھی کہ پلیٹ میں پچا گلیں کی صورت میں کٹے سن و سفید آلو خان کل نے اس کے سامنے رکھ دیے۔

"یہ میں کی آپ۔"

"مہربانی۔" اس نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔

"مہربانی کا کیا مطلب۔ میں کی یا نہیں لیں گی۔"

"خان کل۔" بے بے نے تنہا ہی آواز نکالی اور ایک لمبا فقو بولا۔ وہ نہایت سادہ و معری سے بے کیا بات سن رہا۔

"میں نے کیا ہے آپ کو پریشان۔ واہ یہ اچھی رتی وہاں پشاور سے کانڈھوں پر لا کر یہاں تک لایا۔"

انہوں نے پھر کچھ کہا۔

"دیکھیں بھئی میرا بونا برا لگا۔"

"وہ نہیں کوئی برا نہیں لگا، میرا خیال ہے میں اسے کمرے میں چلتی ہوں یہاں پر کتابیں ہوں گی۔ میرا مطلب ہے مجھے رات کو نیند دیر سے آتی ہے۔" وہ کرسی میز کے نیچے کر کے کھڑی ہو گئی۔

"ہول۔" ہول کی تو کچھ لیکن شہر کی پچھا رہی ہو گئی۔

"اول۔" بے بے نے کرسی کی چین گتے گتے پچھا کر دوک لیا۔

"وہاں شہر میں لوگ در سے سونے کے عادی ہیں لیکن یہ دیر نہ ہے یہاں کو صبح گئے بعد آدھی رات کا سا ہو گا۔" اس میں اب کو آپ کے کمرے تک چھوڑ دیں۔ "وہ اتفاقیات برتتے اس کے ساتھ ساتھ

چلا سبے بے کو اللہ حافظ کہہ کر اس نے پلیٹ کو دکھا دیا۔ مخصوص بوڑھی عورتوں کی طرح کسی موقع میں غلٹی نہیں اون کا سراپا تھا میں پکڑے۔

"اور شہر کی پچھا رکھیں ہے۔" اس نے اس کے ساتھ برآمدے کا سراپا پور کرتے ہوئے پوچھا "وہ خوشی سے مسکرا دیا۔"

"آپ آتی ہیں تو شیر بھی پیرے سب دیو کیہ لیں گی فی الحال آپ آرام کیجئے، ٹی وی دیکھئے۔"

"وہ نظری میں آتا۔"

"آپ انٹر آئے گا، رات ہوتی ہے تو نشریات کچھ واضح ہو جاتی ہیں اصل میں یہ واوی ہے تا تو یہاں لوں سے راکٹ ہوتی ہے۔ سوشل نیچر لی اور ملنے خواب دیکھئے۔" وہ انگریزی میں دعائیں پڑھتا سیدھا چلا گیا وہ

خان۔ کسی کام سے نہیں جا رہا تھا۔ اس کے کمرے کی اس کو پھر کو بھی نہ رکھا اس نے خاموشی سے دروازہ بند کر کے ٹی وی کن کیا۔ نشریات اب بھی دیکھی تھیں، بس پھر زیادہ کالے ہو گئے تھے اور شہریت یقین

انہی آواز سے پہنچائی گئی۔ اس نے ٹی وی آف کر دیا۔

کوشش کوئی اخبار اٹھا لائی ہوئی۔ شاید اخبار یہاں آتے بھی نہ ہوں۔

دنیا سے بے خبر ہو کر یہ پہلا دن گزارا تھا، دنیا میں اس وقت تیسری عالمی جنگ چھڑ جاتی تھی اس کو بہتہ چلنا وقت سے یہ لاعلمی بھی بڑی نعمت ہے رات اسے بہت دیر سے نیند آئی۔ ابھی جگہ۔ ابھی چھت۔ پھر وہ

شام میں بے وقت سو گئی تھی، پہلی ہی نیند آتی بھی تو دور سے چنگی جانوروں کی آوازیں اسے سہا رہیں، کبھی

میں کوئی لڑکی نہیں ہے نا، انبیال چاہتے ہیں۔ ”میں نے رانی سے بولنا شروع کر دیا۔
”کہہ ان کا یہ گھر جنت کا نمونہ ہے۔ وہ یہاں بہت کم ٹھہرتے ہیں۔ ان کی مصروفیت اتنی ہے۔ لیکن
اس جگہ سے ان کو اتنی اہمیت ہے کہ اب یہ گھر کم کو دکھانے لگا۔ وہ یہاں آتا تو چاہتے ہیں لیکن اس لیے
نہیں آتے کہ ان کے مہمانوں کی بہتر کو بھگت نہیں ہو پاتی۔ وہ فطرتاً ”سمان نواز ہیں اور ان کے حلقہ
احباب میں غیر ملکی بھی ہوتے ہیں۔ ہم سب مل لوکی گا۔“

”میں دیکھوں گی سہیل کتنی ہوں یا نہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔
”جے نے بے باہ حیرت سے سرائیہ اس کی طرف دیکھا۔ ان کے خیال کے مطابق اس نے ذرا بھی شہی
نہیں ماری تھی اس سے پہلے جو لوگ آئے تھے انہماں کاران کو معذرت ہی کرنی پڑی تھی۔ وہ حتیٰ ذریعہ خاموش
رہیں۔ ”میں نے ان کو اجازت نہیں دینی لیکن کر لیتا جا سکتا۔“ تھیں اندازاً ”کتنے بیسویں کی ضرورت ہوگی۔“ وہ کہہ کر دیر
سوچتی رہی اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں سمیٹتے ہوئے سوچا ”دراصل مجھے
اندازہ نہیں لیکن مجھے پتا چاہیے کہ کوئی ایک جگہ جہاں میں سکون اور اپنا سہیت سے رہ سکوں۔“

”میں یہاں ہمیشہ تو رہوں گی نہیں۔“ آخر ایک دن کہیں اور چلی جائیگی۔
”جے نے ٹھوڑی سی ہنسی باندھ رکھے پھر فضاؤں میں گم ہو گئیں۔ یہ لڑکی کس انداز سے چاہتی ہے کہ پریشان کر
والی ہے۔ لیکن اس لڑکی نے انہیں زیادہ پریشان بھی نہیں ہونے دیا۔ کہہ کر ہی سچ کر کہیں ہو گئی۔
”جے نے یہاں کوئی لڑکی لے کر آئی ہے۔“ اس نے ایک لمحے سے سرائیہ کو دیکھا۔ کس کس
سے انہیں ہے کہ کہہ رہی تھی۔ جیسے وہ ان کی گویاں مل کر رہی ہوگی تھی اچانک یہ لڑکی ان کے دل میں اتر گئی۔
ایسی سادہ مگر ایسی معصوم ایسی براعت و لڑکیاں انہیں کبھی ملتی تھیں۔

”ہاں شاید یہی کوئی لڑکی بہت آئی ہے۔“ انہوں نے خیالی میں کہا۔ وہ نہ لڑکی ہے۔
”میں سمجھتی ہوں کہ یہ لڑکی ہے۔“ اس نے ان حقائق کی فوری ملاحظہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دوران ہدایت
میں اس لڑکی کے ہاتھ دیکھ کر ہی اس سے ہوا اس سے بہت خوف زدہ تھی یہاں ایسے ہی آسمان آتے تھے کہ گھر
والوں کو ڈر دیتے ہیں۔ لیکن وہ مہمان کو سچ میں مسکراتی تھی۔ اور مہم سے کہہ کر ہی جیسا اس کی سمجھ میں نہیں
آتا تھا۔

”یہ لڑکی بڑی بڑی آئی۔“ اس کے گمان میں اس سے مہمان کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی تھی۔
”کیا نام ہے تمہارا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔
”مری جی۔“ وہ بہت سادہ تھی۔
”تم نے یہ دادی دیکھی ہے ساری۔“
”ہاں جی۔“

”مجھے ذرا یہاں کی سیر کرادو۔“ اجازت ہے نا بلے۔“
”کہیں نہیں سوسم اللہ۔“ وہ انبیال آگے تو کام بڑھ جانے کا اس دوران اچھا ہے تم تو وہی سی تفریح کرو۔“ مہم
نے بھی شاید ساتھ جانے کی اجازت چاہی لیکن ”تاکا“ میں ملی وہ نہ ہوسکی وہاں چلی گئی۔
”آپ پہلے گھر دیکھو گے یا کونسی۔“ مری نے اس سے پوچھا۔
”جو بھی زیادہ خوب صورت ہو۔“ وہ غریبی طرز کے دروازے سے دلی سانسے در در تک گڑھی کا علاقہ نظر

آ رہا تھا۔ اور بہت دور غار دار کدوں کا جنگلا تھا۔ پتھروں کی دیوار سے اٹکا لوہے کا عقیم الشان پکا ٹک پائوں پاٹ کھلا
تھا۔

”وہ نے شان گل اتنی جلدی واپس آگئے۔“ اس نے حیرت سے سچا۔ ایک خوب صورت سی چپ تیزی سے
عمارت کی طرف آ رہی تھی۔

”مالک! مری نے بے ہوشاں ”چلا کر کہا۔“ مالک آگئے۔ وہ اس کو قطعاً بھول کر چلا گیا۔ مار کر اندر چلی گئی۔
وہ میریوں پر حیران پریشان کھڑی آفراتفری میں بھٹکتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

صرف وہ میریوں پر چپ آ کر کرکھی تھی۔ جس کا استقبال جنگل سے بنائے کسی چپے کی طرح کیا گیا
تھا اور پیچھے وہ چلی منتشر دروازہ تھا جہاں سے رنی چلاوے کی طرح غائب ہو گئی تھی۔ عمارت کے دائیں
پائوں سے عجیب عجیب نئی نئی شکلوں کے لوگ چپ کے گرد بیٹھ لائے۔ شہ سے والے نے اپنا
دروازہ خود کھولا تھا۔ وہ نئے اڑا تو لوگ مکھیوں کی طرح اس کے گرد بیٹھ لائے گئے تھے۔ وہ ان کی زبان
سمجھنے سے قاصر ہی تھی۔ لیکن یاد رہا تھا۔ ہاتھ لے جانے اور اونچی اونچا جلدی جلدی بولنے کا مطلب
یہی تھا کہ وہ اس کے کتے سے بہت خوش تھے۔ اور وہ خوشی کا پھر پورا اظہار بھی کرنا چاہتے تھے۔

وہ ان کے درمیان گھر ان کا بار و صول کر رہا تھا۔ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ سفر کی تھکان
کے باوجود اس کا چہرہ خوش باش اور تڑا تڑا تھا۔ ایک ایک کندھے پر ہاتھ رکھتا ان کی پیٹھ تھپکتا واضح
کر رہا تھا کہ وہی اس گھر کا مالک ہے اور اس کو گھر اور گھر کے مکینوں سے لگنا پڑا ہے۔ وہ دنی جو گھر زور سنی
جتنے چوتے کی جیکٹ کندھے پر لٹکائے وہ تیز جڑ قدموں سے انہی دو تین میریوں کو ہار کر کے عمارت
کے اندر غائب ہو گیا۔

یاد لوگ اس کی آمد کے سلسلے میں اتفاقات کے لیے خوشی کے پروگرام بنائے گئے۔ کاش وہ ان کی زبان
سمجھ سکتی۔ وہ بھی ان کی خوشیوں میں سے کچھ حصہ وصول کر سکتی۔ حالانکہ اس کو سننے ٹھنسن کے آنے کی
نہ خوشی نہ تھی۔ وہ جو ہوا کے ایک جھوٹے کی طرح اس کے نزدیک سے گزر کر چلا گیا تھا۔ اور جاتے جاتے
پری کل مہم اور دیگر واقفین کو بھی غائب کر گیا تھا۔

اندرونی عمارت زندہ ہو گئی۔ وہ سو یا سو یا سنا سنا ایسے خاموشی میں گانچ کا برتن گر کر چھٹا کے سے توڑ بیٹھا
تھا۔ نہیں یہ احترام تھا خوف۔

ہر شخص اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں لگتا تھا۔ حالانکہ وہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ اس
کے ذمہ بھی کچھ فرائض عائد تھے۔ لیکن ان فرائض کی شانہ ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ اس
جگہ جگہ لکھا تھا۔ وہ جب گھر آتے ہیں ان کے ساتھ ان کے مہمان ہوتے ہیں اور ان مہمانوں کے احترام
میں آپ کو دیکھ رہے۔

وہ اکیلا آیا تھا۔ اور ظاہر ہے اس کی خاطر ہدایت کرنا تو اس کی ذمہ داری نہیں۔ اس نے قد آور
اندر کے درخت پر لٹکے سبز سبز خمدوں کو دیکھ کر سچا۔ آج کا سارا دن برا ہو گیا۔ اور جتنے دن
یہ شخص یہاں رہے گا۔ وقت بڑا کر تارے گا گھر کی بھاگ دوڑے اس بات کا تو اس کا اندازہ ہو ہی گیا۔
وہ سانسے چلی طویل سڑک پر جو بہت آگے جا کر چار دیواری کے کھٹ سے مل جاتی تھی۔ کھٹ مری۔
لحہ بھر میں گھر میں آفراتفری مچ گئی۔ ہر شخص اپنی اپنی زبان میں مالک کے اچانک آجانے کا فسانہ گھڑ گھڑ کر

سنا رہا تھا وہ خوب صورت سی خاکی چپ چاک کے رات بیکار لے کھاتی اور آری تھی۔
 بہت دور سے غویانی کے شگوفوں کی مہک اس کو دھار میں لے تھی۔ جنت میں شاید ہواؤں میں ایسی ہی
 خوشبو ہو۔ ایسا ہی آہن ہو۔ ایسی ہی زمین اس نے نہایت شدت سے سوچا۔ ایسی ہی ویران جگہ پر انسان
 عمر بھر گزارے تو رائیگاں نہیں جائے گی۔ لیکن انیال خان تو ابھی تشریف لائے تھے۔ شاید بے بے کی
 سفارش پر اس کو رکھ لیا جائے۔ اور شاید اس کا منہ دل دکھائے والا انٹرویو کیا جائے۔
 وہ دونوں صورتوں کے لیے خود کو تیار رکھنے کی جدوجہد کرنے لگی۔ وہ سب آپس میں کسی نہ کسی رشتے
 سے بندھے تھے۔ توکر، مالک، آقا، بہمن، بھائی، عمر، رشتے دار، جنہی تھی تو ایک ویسی۔ برآمدوں کے ستون
 سے جہاں آنسو کی بلیں سارے گھر چھائی ہوئی تھیں۔ اس نے کمرنگاتے ہوئے سوچا وہ بچے سے
 بھاگ کر اپنے کمرے میں چھپ جائے۔ گھر سے جس اعتماد اور عزت نفس کو لے کر نکلی تھی وہ جانے کس
 کونے کھدرے میں جا چھپا تھا۔ بلان صرف ایک خوف، ہر خوف، ہر احساس پر چھایا کیا تھا۔ کہیں وہ رو نہ کر
 دی جائے کہیں وہ ٹھکانہ دی جائے آخر اس میں عام لوگوں کے مقابلے میں کوئی غیر معمولی بات بھی تو
 نہیں تھی۔
 ایک چکر اس نے سرسک سے بچا تھا اور چھانک سے مزک کا کانا۔ ہواؤں کے تیز چھٹکوں کو گھبرائے
 رہے رہے تھے۔ سارا لہجہ لگانے کے بجائے اس نے خاموشی سے تشنہ دروازہ آہستہ سے کھولا۔ بیسی
 گیلری خاموش اور پرسکون تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مالک کے کمرے کہاں ہوں گے۔ ابھی تک اس
 نے بے بے کے علاوہ کسی کا بھی کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اسے اتنا یقین تھا کہ وہ جہاں بھی ہوں گے سب
 وہیں ہوں گے۔ وہ قایلین پر بے آواز قدم دھرتی آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھی کہ اچانک
 کسی طرف سے پرچی دروازہ کھول کر اس کے سامنے آئی۔
 ”آگ لگا رہی ہے۔“
 ”مجھے؟“ وہ ٹھیک لگی۔ پچھلے ایک کھٹے سے وہ جس درباب سے بچنے کے لیے پریشن کر چکی تھی وہ
 اس کے سامنے آئی گیا۔
 ”کہاں بھاگ رہے؟“ اس نے بونہی تسلی کے لیے پوچھ لیا۔
 ”وہ۔“ برنی نے پشت کی طرف اشارہ کیا۔ اس کو اردو آتی تھی لیکن اتنی نہیں کہ ہر بات مکمل اور
 واضح طور پر سمجھا سکے۔
 اس کے بعد وہ رہنما بن کر آگے آگے چل پڑی۔ طویل کو ریڈور سے وہ مختلف راہداریاں عبور
 کرتے ایک دروازے کے سامنے رک کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے کی چل پھل اور نیز آوازوں سے اندازہ
 ہو رہا تھا کہ اندر کوئی ہے۔ دروازے کے سامنے سے نیچے میڑھیاں تہ خانے کی طرف اتر رہی تھیں۔
 تہ خانے کے سامنے سی ڈی دروازہ تھا جس میں بری کے ختم کے بموجب اس کو داخل ہونا تھا۔
 ”کہاں گئی؟“ آخر؟“ اندر سے آئی جھلانی ہوئی آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔ کیا ہوا؟ اس نے
 حلق سے قہقہہ نکالا۔ اس کو ہر کیف اپنا اعتماد بحال کرنا ہو گا۔ ٹھیک سے اس نے کوئی بات چلائی ہیں، لیکن
 والہی کے تمام ٹھکانے تو یہ آتش نہیں کر دیے۔ وہ اس کو نہیں رکھے گا جس سے بدتمیزی کرے گا۔ وہ اس
 سے پہلے ایسی نوکری کو ٹھکانہ کر چکی تھی۔
 اس نے بولٹ پیچے کر کہ دروازہ کھولا۔ بڑے یقین اور اعتماد سے اندر قدم رکھا۔

انیال خان قد آور چھٹی الماریوں کے کھلے پٹ کے درمیان ہزاروں قاتلوں اور رجزوں کے درمیان
 گھرا جھنجھلا کر کافذات ایک طرف ڈھیر کر رہا تھا۔
 ”پلے رنگ کی تھی۔ ہزار شاخے والی۔ میں نے پچھلی مرتبہ اسی الماری میں رکھی تھی۔ میری غیر موجودگی
 میں آخر کون میری جینس چھینا ہے۔“
 وہ بارہا اسی الماری کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”تمہاری جینس کون چھینتا ہے؟“ انیال نے اعلیٰ کے طرف تو کوئی آتا بھی نہیں۔ ”وہ سکون سے نرم
 صوفے میں غرق سلائی کی سلائیوں میں الجھتا رہا۔
 ”پلے بے بے مجھے ڈرا“ چاہیے۔ سرت اہم فائل ہے۔“ اب اس کی آواز میں وہیسا پن تھا۔
 شکر ہے وہ اردو زبان میں مخاطب تھا۔ ورنہ اپنی زبان میں کی گئی ایسی گفتگو کا ایک لفظ اس کی سمجھ میں
 نہیں آتا۔ آواز وہ گونٹے بھروں کی طرح انجان کی ایک ایک کی شکل تھی ہوتی جیسی لگتی تھی۔
 ”ہینشو۔“ بے بے اس کو دیکھ کر شفقت سے مسکرا دیں۔ ”میں نے جینس اس لیے بلوایا ہے کہ تم
 وانیال سے ملیں؟“
 اس نے ایک نظر ہزاروں قاتلوں اور لایسید کافذوں میں گم اس شخص پر ڈالی۔ جو تھک چھپے ہوئے والی ہر
 گفتگو سے لافعل تھا۔
 ”اور اس کیبٹ کی چابی کہاں ہے؟“ اس نے اعلیٰ الماری کا دروازہ جھنجھلا پٹ بھری طاقت سے
 کھینچا۔ سری میز کی دروازہ کھلی۔ چابیوں کے گھنٹھے میں سے ٹول کر مطلوبہ چابی نکالی۔ کی ہول میں
 گھمائی ہی تھی کہ دروازہ ایک طرف سرک گیا۔
 ”یہ۔ یہ والی۔“ اس نے اطمینان کا ایک سانس لے کر فائل کھینچ لی۔
 ”وانیال یہ بیلا ہے میں تمہارا اس سے تعارف کرانا چاہتی تھی۔“
 ”ہوں۔“ اس نے تھیل لیمپ آن کر کے فائل کے کافذات پلٹے شروع کر دیے۔
 ”تمہارا تعارف ہوا؟“ اب کے انہوں نے نام ہو کر یہ کو مخاطب کیا۔
 ”ہاں۔“ اس نے دل میں سوچا۔ اگر بکولے کی طرح جاس سے گزرنے کا مطلب تعارف کرانا ہے تو
 ہو گیا ہو گا۔ اس نے خاموشی سے لٹی میں سر ہلادیا۔
 ”وانیال۔ اب بہت مصروف ہیں۔ مجھے احساس ہے۔ لیکن یہ بھی بہت ضروری ہے۔“
 ”ایا جی؟“ وہ کرسی کھینچ کر لیمپ کے بالکل نزدیک ہو گیا۔ اس نے ایک نظر اس بے تحاشا مصروف
 سے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ لافعل ساقا۔ بے ہوا۔ بے فکر۔
 اس نے ایک مرتبہ بھی بے بے کی بات دھیان سے نہیں سنی تھی۔ لیکن ان کی ہر بات کا جواب ضرور
 دیتا تھا۔ یونہی جیسے کوئی شخص بچہ کی باتوں کی طرف دیکھے۔
 ”یہ بیلا ہیں۔ تم گھر کے لیے کسی سررست کی بات کی تھی۔ اسی سلسلے میں آئی ہیں۔“
 ”وہ؟“ اس نے پہلی مرتبہ لمحہ بھر کے لیے ہاتھ نال میں رکھ کر تسلسل جھکا ہوا سراٹھایا۔ ”میں تو بالکل
 ہی بھول گیا تھا۔ آپ نے رکھ لیا کی کو؟“
 ”رکھ تو لیا ہے۔ لیکن اگر تم۔“

”آپ نے اپنی تسلی کر لی؟“ وہ وہیں غافل میں ڈوبا ہوا۔

”ہاں میں نے تو تسلی کر لی۔“ ٹھیک ہے۔ اس نے سکون کا گہرا سانس لے کر مطالبہ صفحہ کھولا۔ وہ اب وہیں پھر بات ختم ہو گئی۔ ٹھیک ہے۔ اس نے سکون کا گہرا سانس لے کر مطالبہ صفحہ کھولا۔ وہ اب شاید غافل سے مخاطب تھا۔ بات غافل کی ختم ہوئی تھی۔ اس نے نشان دہی کے لیے ہلکا سا قلم چمکایا۔ غافل بند کی۔ اور اپنی جگہ سے اٹھ کر مڑ گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ دروازے کے نزدیک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بے کے سامنے جب تک کروڑوں سے مسکرایا۔

”میں ہمیشہ آپ کو پیشان کرنے آتا ہوں۔“
 بلا نے لمحہ بھر کے لیے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ جب سے اس کو روتی رہی تھی وہ ہنسپا رہا تھا۔ اس طرح ٹھیک ٹھیک کر رہا تھا۔ لیکن یہ بھی کچھ کام تھا۔
 انسانی ہمدردی اور انسانی تعلقات سے متعلق اس نے یہ پہلا فقرہ دیا تھا۔ اس کے بال ہاتھ پر کھڑے ہوئے تھے اور ٹھکان اس کے پیرے کی ایک ایک رگ میں تھی۔ اس کے ہاتھ ہی سے وہ مسکراتا ہوا چہرہ نکلتی کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ ٹرے میں رکھی لبالب ہاتھ سے بھری پیالی پر ایک پلن سے بھلی آگئی تھی۔

”دیکھو! انہوں نے ہلا کی طرف شکایت سے دیکھا۔“ یہ اس طرح کرتے ہیں۔ نہ کچھ کھانا نہ پینا۔
 ٹرے کو چھو ابھی نہیں۔
 پھر اردو میں ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکلتی ہے زبان پشتوہ کسی سے مخاطب ہو کر سخت ناراضگی کا اظہار کرتی تھیں۔ وہ اندر بیٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کیا ہے بے کے پیچھے خاموشی سے باہر آگئی۔ بہت جلدی کو ریڈور ٹالی ہو گیا۔ انیال خان غالباً ۱۳ بجے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اور بے اپنے کمرے میں۔
 وہ پیر کے کھانے کا اہتمام کس کو کرنا ہو گا؟ اور یوں بھی اب لہجہ کا وقت بہت تنگ ہو چکا تھا۔

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی پر چوٹ کھول دی۔ یہ نظارہ اسے بہت پسند آیا تھا۔ آسمان اس نے کہیں اتنا نیلا نہیں دیکھا تھا۔ بادل شفاف ہوتے اور درختوں کے پتے زمردی طرح شفاف اور چمکے۔ اس نے لگے جیسے سفید بادلوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر سوچا کہ اس کا بلا اور آیا تو وہ کسی بھی کام کے لیے تیار ہو جائے گی۔ فی الحال اسے بادلوں کی آنکھ بھولی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ آسمان آہستہ آہستہ بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ کسی بھی دم میں شاید بارش شروع ہو جائے۔ اس نے خان کی دلائی ہوئی مثال کندھوں پر ڈال۔ جو کام ہری مکمل نہیں کر سکتی تھی اس نے خود ہی کر کے کی تھی۔

میں کیسے سے باہر دیا بادل جاتی تھی۔ سامنے جو بیل کھاتی تاہم واری سڑک چمک سے جاملتی تھی۔ وہ پھر اس پر نکل گئی۔ آخر وہ لوں کے جھنڈے پر بے غالباً ملازمت کے گھر تھے۔ ایک چوڑی سی پگھلڑی اس راہ پر بھی جا رہی تھی۔ معلوم نہیں ملازمت کے کہاں جانے کی اجازت ہوتی ہے یا نہیں۔ اور وہ ان اجازتوں اور غیر اجازتوں کی پابندی کیا پابندی ہے؟ آزاد؟ کپڑوں کی بیچی پھتوں والے تین کے سے بے گھر اسے دور سے بہت دلچسپ لگ رہے تھے۔ کسی دن وہ فرصت سے سب کے گھر جائے گی۔ باری باری تاہم فی الحال وہ چلی

48

چلتی اتنی دور نکل نہیں جانا چاہتی تھی کہ اسے آواز بھی دی جائے تو بچہ حاضر تصور کیا جائے۔
 اور خدا معلوم جو دانیال خان کی آواز سے ڈالیں۔ انہوں نے کس کوئی کام کہہ دیں۔ اسے اس قسم کے درنگ سے بچنے سے بہت ڈر لگا۔ اس کے پیلا بھی بہت کام کرتے تھے۔ لیکن جب کام ختم ہو جاتا تو وہ فرصت سے گھر کی باتیں کرتے لیکن اس شخص کو سوائے کام کے اور کوئی کام نہیں تھا۔
 سب سے پہلے درمیان والے کمرے میں اسی تہری سے اوان کے گولوں میں الجھی ہوئی بار بار گھر گن رہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر ان کی جھکن چپے اترتی تھی۔

”میں نے دیکھا تھا تمہیں سڑک کی طرف جاتے ہوئے میں نے سوچا اچھا ہے تاکہ وہ الگ الگ۔“
 ”کوئی کام تو نہیں ہے؟“ اس نے حتی الامکان بہت مہربان لہجے میں پوچھنے کی کوشش کی۔ اس نظم کی اس کو عادت نہیں تھی۔ اور اس کی آنکھیں اس تباہی داری کے خلاف چٹکی کھاتی رہتی تھیں۔
 ”کام۔ ارے کام ایسا کون سا ہے۔ دیکھو تم خود ہی سمجھ دو یہ کیا کرو۔ جو کچھ گھر میں مناسب لگے۔ رو۔ بدل کرو۔ جس کی ضرورت ہو کر لو۔“ وہ سمجھ گئی۔
 ان کا مطلب تھا اپنے ہونے کا مقصد نہیں خودی پورا کرنا ہے۔ یہ کام زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اس کے ثابت کر تھا۔

وہ کتنی دیر خاموش رہی۔ ”رات کے کھانے کے لیے کوئی خاص انتظام؟“
 ”کوئی خاص نہیں۔“ انہوں نے بے لکڑی سے کہا۔ ”مخانا ساں روز مو کا بنا لیتا ہے۔ مجھے تو صرف دانیال کی فکر رہتی ہے۔ تمہیں شاید علم نہ ہو۔ یہ سال سے واپس چلے گئے ہیں۔“
 اوہ۔ ایسے سیما جاہد مالک کی ماں تھی میں کام شاید اتنی سہولت سے نہ ہو سکے جیسے اس نے تیار دیکھ کر سمجھ لیا تھا۔ وہ پچھرا رہی تھی۔
 ”چلے گئے۔ اب کب آئیں گے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
 ”خدا جانے یا وہ خود جانیں۔“ انہوں نے اوان کا اٹھا ہوا پچھلا سلاخیوں میں پرو کر میز پر رکھ دیا۔
 ”تم نے کھانا نہیں کھایا۔“

”دل نہیں چاہا تھا۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ دراصل اس کو علم ہی نہیں ہو سکا کھانا کس وقت لگا۔
 میں کھانے کے وقت تو وہ برتنوں اور درختوں سے بھر اکرات کرتی پھر رہی تھی۔ اس کو تھوڑا سا ملال ہوا۔ شاید ان کو احمقانہ لگا ہو۔ مالک کے ہوتے وہ ان کی ماتحت کو بھی کھانے کی میز پر بلا میں بے بے اوان سلاخیوں چھوڑ کر بڑے وسیان سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کی آنکھوں کی چمک آہستگی سے مائد ہو کر ایک حلال سا پھیلنے دیکھا تھا۔

”تم ان کے روئے سے برا نہ منانا بیلا۔ وہ یہ سلوک سب ہی کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ وہ کام میں اتنے مصروف رہتے ہیں، ایک مشین ہی بن گئے ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر تم کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ ان کی عادت بن چکی ہے۔“ بیلا بچل دی ہو گئی۔ وہ ہر گز یہاں ملازمت نہ کر سکتی تھی۔ اس کی ساری اپنی تک ہماروں اور پہاڑوں کے مڑے بوت رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں ملازمت قبول کر لیتے کے باوجود کوئی اس کے اندر اس کا سر پلندر رکھتا تھا۔ اس کے وقار کو چھکا نہیں دیتے۔ تاہم یہ کافی نہیں۔

”اور یوں بھی ان کی زندگی ایک بہت ہی مزیدار ہے بیلا۔ تم اس گھر کا نوین رہی ہو۔ اگر تم انیال خان

کے ماضی سے انکار نہیں ہوگی تو کبھی ان کا احرام نہیں کر سکو گی۔ تم نے دیکھا ہو کہ کتنے اکلڑے رہتے ہیں۔ کتنی بد سرائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم سب ان سے پیار کرتے ہیں۔ تم ہم سچا جانو کہ انہیں جانتیں۔ ان کی کوئی ایسی بات نہیں کہ تمہیں ان سے نفرت ہو۔ ہم اپنی روایتوں کے لیے کیا کچھ قربان کر رہے ہیں۔ ان کی آواز زندہ ہو گئی تھی۔ اسی لیے شایدا وہ پسند ہو گئیں۔

انہوں نے دونوں باتوں کی تجلیلوں سے آنسو خشک کیے۔ تعنی دیر ویر و خاموشی جیسی خوب تر لہجہ باتی

وہ انہیں بلانے لگا کہ آئے چلے گئے تو میری دل نہیں چاہا۔ تم نے بھی نہیں کہا۔
میں ابھی کھانا کھا رہی ہوں۔ ہم یہیں کھائیں گے۔ بیکار کی جگہ میں نہیں آیا کہ وہ ان کو کیسے تھقی
دے دو پوچھی سی عورت، جو اسے دور کے رشتہ دار کسی کے انجانے دکھ پر آنسو بہا رہی تھی، وہ ان کو کیسے
چپ کروانے کہ تمہاری اس بات نے خود قطرہ قطرہ کر کے بہا ہے۔
وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں کھانا کھا رہی ہوں۔"

وہ ان کے صبح کرنے اور تکلیف نہ کرنے کی ہدایت کے باوجود ٹٹا کر لے آئے۔ یہاں پہنچنا یا نہیں کر کے ان کا دل بہلائی اور ان کی آنکھوں میں دیکھ کر ہنسی دیا تو ان کے دل میں اترا رہی تھی، اس لیے شاید وہ انہیں ان کی ہدایت کے باوجود اس کا سخت مانگ رہی تھی کہ وہ ان کے پاس نہ آئے۔ لیکن مکتور خیر نہیں تھی۔

وہ معمولی سی ملازمت کے لیے بہت دور کا سفر کر کے خود کو بہت زیر بار کر کے آئی تھی لیکن اپنا اور

دوسروں کا احترام اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

کھانے کے بعد اس نے ان کو بچوں کی طرح اصرار کر کے قہر نہ پایا اور جو لے لے بھی اس موضوع کو چھوڑ کر ان کو روک دیا۔

[illegible]

ان کو اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شرارت چھپی گئی۔ جیسے وہ ان کی بچیپن کی دوست ان کے رازوں کی شریک تھی۔

”بہتر ہے تو پہلے ہی واضح کر دیا۔ جب تم کو کھو گیا ملو گی تو۔“

ان کی بازگشت کی امید میں بے تحاشہ دعا تو یہ ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے بڑے غور سے اس کی شکل دیکھی۔
 ”سچا قسم سچ ہی ہے۔ تمہارا واقعی یہاں تک لگ گیا ہے باظاہر کر رہی ہو؟“
 ”میرا قسمت بدل لگا ہے۔ بے میں ہے۔ یہی ایسا خوشیوار کھلا کھلا ماحول نہیں دیکھا تھا۔ میرا ہر سڑک پر
 ٹکڑا تو ایسی صورت کر دیتا ہے تو ایسی خوشیوار طرف سے آتی ہے“

”ہاں“ کہہ رہے تھے اس لئے کہ بہت سے لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ”ابوہادام“ کے غلو فوں کی خوشبو آتی ہے تمہارے باغ کے بادام چکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ یہاں ایک سے ایک اعلیٰ نسل کامیو دریا نیال سے بڑی محنت سے لگایا ہے یہ سارا علاقہ دانیال کے نام پر بنایا گیا ہے جو یہاں تک دور درگاہ تھی کہ وہ سب ”بیلا خواشوشی“ سے ٹوٹ کر دھڑے اُتھو کہ کوئی مٹی کی دیوار بنو، یہ پتھر کی بات دانیال پر لے آئی تھی۔ مچھلا اس کو کیا دیکھی ہے، وہ کہتی تھی کہ دانیال کے علاقے کی زمین کہاں تک مٹی کی ہے؟ اور دوسرے جاگیر دار کی کمالات شروع ہوئی ہے۔

اس نے اپنی زندگی تقریباً ایک عیسائی راہ پر بیسی گزار دی تھی۔ اس کے ماضی میں بہت سے لوگ
میں تھے۔ بہت دوست تھے۔ بہت دشمن۔ ہاں بس کئی ایسی کتابیں تھیں۔ یہ کتابیں کے حوالے سے اس
کا نظریہ ان جاگیرداروں کے بارے میں بہت تک تھا۔ لیکن وہ اس نظریہ کا اہتمام کر کے ان کو بھیجی
میں کرنا چاہتی تھی۔ یوں بھی ایک نچلے درمیانے درجے کے پریس کرنے والے گھرانے میں جاگیردار کا
جو فہرست آئینہ سرور ہو جائے۔ وہ اس سے نجات پا سکتی تھی۔

”اگر میری بات ٹھیک لگتی ہو تو میں خود بخود خبر کر سارا کر دے گا۔ لیکن سارا طرزِ تعمیر دانیال کے والد کے ذہن کی اختراع ہے۔ سب چیزیں انہوں نے ہی مختلف بیہوشوں سے پتہ کرنا کبھی کی تھیں۔ وہ ان سب چیزوں کی قدر بھی جانتے تھے۔ وہ دانیال سے بالکل مختلف تھے۔ جو عالمِ ان میں تھیں وہ دانیال میں نہیں ہیں۔ اور جو پتہ دانیال کے وہ نہیں ہوتے تھے۔“

وہ جیسے سوئے میں خواب سے بیدار ہو گئیں۔

اس گھر کو کسی طرح ترتیب دیا ہوگا۔ سوچ بوجھ کے سلیقے سے اس طرح کہ درانیال خان نے کیا کیا تو فیضان
 پر ہوا اور ترکے، ذرا تنگ روم اور گیلی، تو انہیں نے خود ہی، خوب خوب ستوار رکھی ہے کیونکہ ان کے
 ممکن تمام طور پر یہیں آتے ہیں۔ پانی کھول کر کھینا ہوگا۔ چیزیں کھاؤ کی طرح کھول میں دفنسی ہیں،
 سارے بڑی کمرہ ہوا سے بہت بہتہ کرتے والا کام ہے۔ ظاہر ہے وقت کے مکہ۔

وہ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے کمرے کے کڑاخانہ پر پلٹ کر نظر پڑے گا۔ پھر چیرس، چمنی، ہول گل۔ وہ ان کے کمرے سے نکل کر گلی میں آئی اور پرکی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔

پڑی اتنی باتوں کو تو میں بھی سمجھ رہی تھا، سارا دل اس کاچند کمرؤں کی بند ہو گیا۔
 ڈراما نگار روم اور لکھری بے بے کے بقول یعقوب نہیں جیسا تھا۔ ان ڈراموں کی کہانیوں نے بھی
 جھجھکیا تھا، واپس ملان کے کمرؤں سے پرے مہمنوں کے کمرے تھے۔ جن میں بری کے بقول شادیوں کوئی
 اگر خیر نہ آتا۔ وہیں ہال تھے کاغذ بری تھی۔ عمارت کے پچھلی طرف نوکروں کے کوارٹر تھے۔ ان کے
 ساتھ ایک مصلیٰ تھا، معطوم ہو تا ہے، واپس مل کے والدہ کافی وقتیں حجاز تھے پیسے کی فراط انسان میں فرق بھی
 پیدا کر دیتی ہے۔ اور شوق بھی۔

اندرونی طرف تہا ہوا ایک بڑا سا پتھر کے بجائے کا سر اس کی توجہ ہمیشہ کھینچتا تھا۔ وہ کوئی جاندار زندہ سر لگا تھا۔ کسی سنگ تراش نے اس شخص کا کندھوں سے اوپر کا جسم بنایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سخت مزاحی تھی۔ اور ہونٹ ایک دوسرے کے اوپر تھے جیسے طہری اور اپنے اراوے میں اگل ہنسن لپکتا دیکھتے تھے۔

وہ کتنی مرتبہ دن میں گزرتے اس جیسے کو دیکھتی۔ وہ مجھ سے سنگ تراشی کے اعتبار سے بلاشبہ ایک فن پار تھا۔ دروازے کے عین سامنے وہ ایسی جگہ رکھا تھا کہ گھر میں داخل ہونے ہی سب سے پہلے اس پر نظر پڑتی تھی۔ اس نے ایک کورنگ کے فن پر پڑتے ہوئے برساتا تھا۔ کمرے میں کوئی چیز کسی ایسی جگہ نہیں ہوتی جابجہ۔ جمال سے کمرے کی باقی چیزوں سے دیکھنے والے کی نگاہ ہٹاوتے۔

اس نے مجھے کواہر لگایا تھا کہ جیسے کمرے میں کڑھ دو ڈیبا مارا کے لیے آئی ہو۔ قیاسی نے پری گل کی میت میں چھپ چھپ ماروں سوائے "مردہ کرو" کے کچھ بھی مجھ سے قاصر رہی۔ آخر اس شخصے میں ایسی کون سی افلاطونی شے پوشیدہ تھی۔ کسی وقت بے بے سے فرمت میں وہ اس گھر کی میت سی تانت پر بحث کرے گی۔ وہ خاموشی۔۔۔ سو سرے کلاوں کی طرف متوجہ رہی۔

کام کا سامان بہت مصروف گزرا۔ اس نے دایم طرف کے کچلے ہو کمروں کو تقریباً "ری سیٹ کر لیا تھا" یہ مسافروں کے کمرے تھے۔ اسے چھ چھڑوں کے جاوے لے آئے تھے۔ لیکن ان کی تبدیلی اور اکاؤنٹ داری آرائش کے بہت زیادہ کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ کمانے کے وقتے میں اس نے تھوڑی دیر کے لیے کمانے کو وقت دیا تھا۔ پھر چرت لگی تھی۔

البتہ شام کا وقت اس نے نماد کو کراخوٹوں کے درمیان ٹیلے گزارا۔ سارے دن کام سے اچھا وقت اس میں ہی رہتا تھا۔ بے چارہ خوشیوں کی مگارس حد تک بھلا آسان اور ادنیٰ اس نے صبح سے دو گرا ہمار کا تھا۔ سپر کی ہر حسین شام آتی ہوا اور پھولوں کی نذر کر کے گی کی جنگل میں جو مزے ہیں وہ شہر کی سامری زندگی میں نہیں لوٹ سکتی تھی۔ لیکن معیشت یہ تھی کہ ذرا شام بننے سے پہلے وہ در حد نگاہ تک نظر آنے والے ٹیلے رنگ کے پہاڑوں کے پیچھے ڈوبے سورج کو دیکھ سکتی تھی۔

اس سلسلے میں اس کے ساتھ دو دن ہر رات رہا رہی تھی۔ کل بھی اور آج بھی۔ حالانکہ یہ کوئی چلتی سرک نہیں تھی۔ اور یہاں بے پروگی جتنی چیزوں کے امکان بھی نہیں تھے اس کے باوجود کہیں سے بھی کوئی شخص غمناک رہا۔ وہ جاتا اور اس کو لائی زبان میں اس وقت تک کسی آنے والے خوف سے دھمکا تا رہتا جب تک کہ گھر کے اندر نہ چلی جاتی۔

تلیشا کے سے رنگ کے کپڑوں میں وہ شخص لمبی چھڑی ہاتھ میں لیے آخریوں کے جھنڈ میں بہت دور اس کے پیچھے گیا۔ اچھا اچھا پس آتی ہوں۔ اور راہی کے ہر قسم کے اشارے کا تعین دلانے کے بل بوتے پر آگاہ نہیں ہوا۔ وہ چھڑی لے کر اس کے پیچھے پیچھے جیسے اسے اکٹھا ہوا سرک پر لے آیا۔ آسمان کے قیام سفید باطل ڈوبے سورج کی شعاعوں سے تاری ہو چلے تھے۔ اپنے درختوں کی جو نیال سنہری مزید صوب میں سونے کی طرح چمکتی اس کے قدم روک دیتے تھے۔

کاش وہ کوئی کیڑا لائی ہوئی۔ حالانکہ وہ یہاں کسی خوش وقتی کے لیے تو نہیں آئی۔ ایک نئی اور سنگین زندگی کے آغاز کے لیے اس نے اس راستے کو چن لیا تھا۔

بے بے نے اسے چند دنوں کی مملت ضروری تھی لیکن صرف اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے مانوس کر لے اس ماحول کا عادی بنالے۔ لیکن عادی بننے اور مانوس ہونے کے لیے عرس دور کار نہیں تھیں۔ یہ تو بے بے نے اپنی تمام تر محبت اور شفقت میں لپیٹ کر یہ سمجھا شروع کر دیا تھا کہ اگر اس کو یہاں سے کوئی توقع وابستہ ہے تو اس کے لیے کچھ ثابت کرنا ہوگا۔

اس نے دو تین کمرے دیکھے تھے۔ کام کلا وقت لے گا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ ان ادویوں میں گھومتے گھومتے عمر گزار دے۔ اس کو ہٹا کر سرک پر لانے والا شخص بہت دور نکل گیا تھا، لیکن جانتے بھی مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کو اس سے کس قسم کا خطرہ تھا۔ عمارت سے دایمیں طرف کی اینٹوں جیسی سرک سے دور تک جا رہی تھی۔

یہ سرک غالباً "گروالوں اور ملازمین کی رہائش کو آپس میں ملائی تھی۔ بہت دور بہت دور گائے بھینسیں تازے چار کھادی تھیں۔ وہ تمام کو بہت دور تک بھوتے کی جگال کر کے سوتی تھیں۔ سناٹے اس طرح دور بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اتنی دور بند تھی کہ یہاں سے وہ مناسب طور پر نظر بھی نہیں آ رہی تھیں۔ وہ اکڑ سا بادل غائب گائے بھینسیوں کا گھوٹا تھا۔ اور اس کے خلاف شاید اس لیے بول رہا تھا کہ ان لوگوں کے گمان میں دودھ دینے والے جانوروں کو بھینسی کی نظر کھا جاتی ہے۔ رستم چاچا کی ہستی میں اس مسئلے پر بہت جھگڑا ہوا تھا۔ لوگ اپنی بھینسیوں کے کھن پر غلاف چڑھا چکا تھا۔ تھے اور باہر سے آنے والے مہمان کو نمشکین نگاہوں سے گھورتے۔ وہ خود قابل معافی تھی البتہ کیونکہ ان لوگوں کے خیال میں وہ مظلوم تھی جس کی نظر نہیں لگتی۔ وہ کہتی ہے۔

رنگ والا دھنڈلی سی تاریکی میں عمارت کے پیچھے میں غائب ہو گیا تھا۔ گویہ بہت جلد ہی کی بات تھی لیکن وہ اس کو بہت دور تک گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے تعاقب میں خواب کی سی کیفیت میں چند لمحوں قدم چلتی اچھل پڑی۔

کئی سہ اپنی سواری اس کے بالکل نزدیک آکر اس شدت سے روکی کہ وہ خود کو بچاتے بچاتے کانٹے دار بھناڑوں کی باڑ میں الجھ کر گر پڑی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خوف زدہ ہوئی۔ ذوق شام کے ایسے وقت میں جب وہ رکھو الے کی جاموسی کر رہی تھی وہ کئی دیر تک سمجھتی نہ تھی کہ اچانک اس پر کون سی افتاد آ رہی تھی۔ کون ہو سکتا ہے یہ بد تعبیر اس نے بھنوں کی دگر سے اچھل کر زخمی ہو جانے والی ہتھیلیوں کی طرف دیکھا۔ وہ زخمی کرنے والا خود بھی چاروں شالے جت اپنی گری ہوئی موٹر سائیکل میں پھنسا ہوا اس سا آسمان کی طرف منہ اٹھائے تھا۔

"تو یہ آپ تھے۔ آپ اتنی ہو سکتے تھے" اس نے فائسول کی ایک خشک بھاری میں الجھا دیا۔ گھسیٹ کر کھینچا اور اس کے سر پر چاٹھڑی ہوئی۔

"ہمارے ہاں اس کو بد تعبیر کہتے ہیں مذاق نہیں۔" اس نے جھٹکوں کے بل جھک کر مڑ سائیکل سے اٹھتے اس لڑکے سے کہا تھا۔ "اور یہ مذاق یقیناً" آپ کو مت مہنگا رہا۔"

"ان چور کو تو ال کووانٹ" اس نے سوٹر سائیکل کو جھٹکاتے کر مٹھ کر کیا۔ "تمہاں سے مسائل ہمارا بھاگ آ رہا ہوں۔ آپ ہمیں کوئی مدد کی طرح کسی شے کی تلاش میں تھیں۔"

"سوری۔" وہ خوش ملی سے ہنس دی۔ "میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔"

کوئی بھی کلب موثر سائیکل اسٹارٹ نہ کر سکی۔ شاید اس میں کچھ اٹھس گیمیا تھا۔ ہوائیک گھسٹنا اور ساتھ ساتھ بھاکا پائندہ انہیں اپنی زبان میں کسی کیچھ دیات تھانمارت کے پیچھے غائب ہو گیا۔

دو تین سڑیاں پیار کرتے ہوئے سوچا اور یہاں گھلوں کے بجائے اونچے سٹلے ہوئے چائیس۔ اس نے کھلے روایت کے ساتھ رکے گئے کوڑکے کو سوچا۔ گویا وہ اپنی زوہنی پر آج بھی حاکمیت معابد ٹپے ہوا تھا۔ کسی قسم کی شرائط پر بحث ہوتی تھی۔ لیکن وہ خود بخود یہ غلط فہمی میں تصور کر رہی تھی۔ رات کے کھانے کی اطلاع اس کو مبہم زبان میں ملی تھی۔ لیکن اب وہ اس مبہم زبان کو ہاتھوں کے اشارے اور وقت کی مناسبت سے سمجھنے لگی تھی۔ اس وقت رات کے سات بج رہے تھے۔ اس نے جیکہ باؤر پر خانے کے نزدیک سے گزرتے اس نے چاؤلوں کی اشتہا سیر خوشبو بھی سونگھ لی تھی۔ پروردگار نے اس کو خدا اور کیا کہہ رہی ہو گی۔

”اچھا پورے۔ تم چلو، میں ذرا منہ دھو کر آتی ہوں۔“ اس نے اشارے سے ننگے کوٹے اور منہ پر تھہر گئے کی اینٹنگ کی گئی۔

وہ بلاشبہ اچلے چلے گئے۔ ڈاکٹرنگھل سے ملحقہ کھانے والے کمرے میں داخل ہوئے تو یہ بے گونہ
 اہلی کرپا پر اسی اجڑی سی سامنے والے دیوار سے داخل ہوئے وہاں کی منتظر تھیں۔ روشن پیشانی
 والا وہ مختلف چروان کی دیوب کی افروغی ملاوٹ تھا۔ ایک عرصے بعد اہلی کرپا نے فحش گریں داخل ہوا تھا
 ان سے منکر کیا تھا۔ جوان کی آنکھوں میں وہ کرپا کی فحش دیکھتا تھا۔ ان کی خوشبودی سے
 کوئی دلچسپی نہیں تھی، یہ وہ ان کے کھڑے ہونے کے کمر لگائی تھی۔

”آپ ٹھیک ہیں بے ہے۔“
”شکر ہے اللہ کا کہ تم سب کو یہاں تک محفوظ رکھا۔“

”مشکل یہ نہیں بلکہ بہت مزہ آتا ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جن کو میں نے کبھی شریں بھی استعمال نہیں کیا۔ ان کو ہاتھ لگا کر زیادہ مزہ آتا ہے۔“

ہے۔ نے جیت سے اس خوف ناک سچ بولنے والی لڑکی کی شکل دیکھی۔ اطمینان کے ایک گہرے
 آئیں کے ساتھ انہوں نے خستہ خان کو روٹی لانے کا حکم کیا۔ خستہ خان تھوہرے خود غریب روٹی لگانا تھا جس
 کی شکل لیوٹر سے اٹھنے جیسی ہوتی تھی۔ انہی اس روٹی کا ایک ٹکڑہ ہے۔ بے غمہ میں گئی یہی تھا کہ وہ
 لڑکی۔

۴) رے تم کب آئے خان گل؟ مجھے اطلاع ہی نہیں ہوئی۔
۵) آپ کو ہماری اطلاع کہاں ہوئی ہے؟ اس نے شکایت سے ایک کوہنہ برقعہ کرتے ہوئے

ہاں اس کی شکایت کا منصوبہ بنی اس چھت کے نیچے کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔
 ”تمہارا آتے ہی مجھ سے ملنے آگئے تھے۔“

۱۲) اسلام علیکم! بشیرِ رانجے! خستہ خان نے روپ اور میٹیس اس کے آگے کرتے ہوئے کہا: کثرتِ شعل سے یہ اس لفظ کا مقصد اور مفہوم سمجھنے لگی تھی۔

”غیرت سے پہنچ ہی شیریں گوئی مسئلہ تو نہیں اٹھا۔“

”مجھے تو خبر جو بھی تکلیف ہوئی۔“ اس نے اپنے کپڑوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی تکلیفوں کا آج خاتمہ ہو جاتا۔“ اس نے ہنس کر غصے والی لڑکی کو راز دیا۔

”اگر آپ اس بانیک کے نیچے آکر ختم ہو جائیں تو یہیں کہیں پہاڑ سے ہم آپ کو لڑھکا کر دوں گے اور اگر راستے ہمارے ہاں لاشوں کا خاتمہ باغی ای طرح ہوتا ہے۔“

”تو وارثوں پر منحصر ہے۔ آئیے آپ کی ڈسٹنکٹ کریں۔“ اس نے دکھایا کی ہتھیاریوں سے خون

”کون کون بات نہیں۔ معمولی جوتے“ یا ڈیڑھ انگلیوں کی۔“

۱۳ اور آپ شاید بڑی بڑی چیزیں کھانے کی بناوی ہیں۔
خان مغل کے لہجہ کی معنی فیزی اس نے سمجھ لی تھی اس نے ہر بات ہر کلمے جواب دینے کے بجائے

خاموشی اختیار کرنا پسند کیا۔ سامنے کوئی عظیم الشان عمارت کے پیشوں سے روشنیوں کی جگہ نہ تھی۔
جو اس بات کی دلیل تھیں کہ عمارت کے جزئیات پر کام شروع کر دیا جائے۔

”بائی داوے علی بی بی انیسا آپ اہور کی سڑکوں پر بھی اسی طرح چلتی تھیں۔ آنکھیں اور کان بند کر کے“

”یہ جگہ بہت خوب صورت ہے۔ شاید یہ احوال کا اثر ہے۔“ اس نے تیزی سے قدم اٹھا کر اندر گھر میں دوڑتے چلنے سے روک دیا۔

”جلے مٹکر ہوا آپ کو یہ جگہ پسند آئی۔ ابھی آپ کا سامنا میر شیر سے نہیں ہوا۔ جنگل میں بھی انسان اتنا نہیں کاٹتا جتنا یہ میر شیر“

”میشیرازہ کون ہے؟“ دامیال خان؟ اس کو شبہ نہ رہا وہ ہنک کر کہہ گئی۔
 ”افسوس! آپ لوگوں کی بھی بات عقل مند ہو گئی ہیں کہ اشارے سے بات لے اڑتی ہیں۔“

وہ افسردہ سی کھڑی رہ گئی۔ اس کا تو خیال تھا، اس کا انشویہ ہو گیا تو انور کی بیوی کی سین ٹھالید میں ہوگی۔ اسے اس قسم کے مالک سے خوف آتا تھا جو بے سبب رعب بچھاڑتے ہوں۔ رعب سستے رہنا اس کی

ناوت نہیں تھی۔ اور شاید اس کے بغیر چارہ نہیں۔
 ”آئیے۔ میں آپ کو وہاں کمریوں، ”وہ بچوں کی طرح جنگل کے شیر سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔“

”شکریہ میں خود علی جاوڑی کی کہ فریادیں نہیں ہے۔“
 ”شکریہ آپ نے یہ نہیں کہہ دیا کہ میں مال میں نہیں ہے۔“

کس کام کا اور اس کو تو بزدل نسب نہیں دیتا۔

”کیوں نہیں لڑیں علی کو ہم بہت کھٹکتے رہے وہ کھائی دیتے ہیں۔“

ایک کمری سانس لے کر اس نے موڑ یا ٹیک لو لہسادی۔
ایک تین

”وہ ہوں اور مسئلہ انہیں سرک خراب تھی۔ سارے رستے ہکا بکا لگتے تھے۔ سفر کی وجہ سے محلی آتی رہی۔ سینڈویچز پر پورے رجب تھے۔ میدو شریف میں کھانا ان کے معیار کا نہیں تھا۔“

انہوں نے کبیرا کیڑا کی طرف دیکھا وہ ایک انجینیئر کی بیوی تھی اور اس کے سامنے گھر کی اردو کی کمزوری عیاں نہیں ہوتی چاہے تھیں۔ لیکن وہ ان کی گفتگو سے بے نیاز بیٹھا پلاؤ جس میں بے حساب میوہ تھا بدلی وچکی سے کھا رہی تھی۔

بڑے بڑے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں سے اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور خان کل پر وہ داری کے قائل نہ تھے۔

”ڈاکٹر ہاٹل مگر کسی سے بڑا دوزخ ہے۔ ہاٹل کا باورچی خانہ خستہ خان سے ایک تو بھگے آگے ہی ہے۔ پتہ دے دیں کوئی کام کیو تو تک نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ پاکستان بھی کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔“

”تم بہت بولتے ہو خان کل! اہل وہ حساس ہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو محسوس کرتی ہیں لیکن تم حد سے زیادہ سادہ کرتے ہو۔“

خان کل نے جواب میں کچھ کرنا چاہا لیکن نا سمجھی میں آئے والی زبان کا ایک طویل سلسلہ دونوں طرف سے چل نکلا تھا۔ اور اس نے منہ اٹھا کر دونوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اس شہر میں پلاؤ کے اجراء کر رکھی سوئے میں زیادہ کچھ بھی ظاہر ہے وہ اس زبان میں گفتگو اس سے پوشیدہ رکھنے کے لیے ہی کر رہے تھے۔ اسے کیا پڑی تھی وہ ان کی نظروں میں دلچسپ کران کو حرمہ کر کے پلاؤ کے کنارے پر بیٹھی کا جیریا تھیں۔ اور چاروں طرف درمیان مٹی۔ چاروں طرف کوئی نوالہ دیکھنا لگا تھا کوئی کھین۔

ان کی گفتگو اب بڑھ چکی تھی۔ اور خان کل نے بڑھتی ہوئی شہر کی کوشت افشاہی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی گفتگو میں ناراضی کا عنصر شہر کو مہذرت کا انداز آ گیا۔ مہذرت کے ساتھ ہی گفتگو اردو کے مرحلے میں داخل ہوئی۔

”میری بات کا کیا برامتنا۔ آپ کو پتا ہے میں بہت زیادہ بولتا ہوں اور زیادہ بولنا نقصان دہ ہے۔ آپ کو یہ سوائی پلاؤ کب پتا آیا؟ ہماری خاص دشمنی ہے۔“ وہ گفتگو کے آدھے حصے سے پہلے سے مخاطب ہو گیا۔

”بہت۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”زرا اوسان کو بولیں۔ میرا کمزور دیکھ لے۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور مجھے صبح ستر کرنا ہے۔ اس نے بے لگہ کو مخاطب کیا تھا۔

”میں دیکھ لیتی ہوں۔“ پہلا جواب دیا تھا۔

”اے میرے۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔ ”اس میں دیکھنے والی اسٹیشن چکر لگائے؟ ایک ایسی تین کروٹا ہے۔“

وہ دوبارہ بغیر سوبے جا گیا۔ اس کو گفت میں جھٹکا کر کے۔ اگر وہ اس کا کمزور چیک کرے یعنی تو کم از کم ہرقی تو حلال کرے گی۔

بے سب نے راجت نہیں کی۔ وہ کھانا ختم کر کے آتش دان کے پاس چلی۔ مٹی پر جان بھی تھیں۔ اب وہ یقیناً شہر کے کسی زنجیر اور دھڑوں میں الجھ کر اسے بھول بیٹھیں گی۔ اس نے مادہ نامی پردہ کی برتن سمیٹنے میں مدد کی۔ ٹھوڑی دیر کے ہوئے تین تینے نشان اس کی خوب مصوری کو جہاں کر گئے۔ ان کے گمان میں تو شاید یہ کوئی شگون ہی ہو گا۔ کسی خوش بختی کی دلیل یا نظر کا ٹوٹنا۔ یہ اس مدد کی پیشکش پر مکرادی۔ نظروں

میں دوستی کا جالہ اور رازہ گہرا ہے۔ بے سب نے پلاؤ کو آواز دے لی تھی۔

”خند آ رہی ہے۔ نہیں تو اوجھڑا کر بیٹھو۔“

وہ ان کی خواہش پر ادھر ہی چلی آئی۔ اور یوں ہی اس کو خیر کر ہی آتی تھی۔

”مہربان۔“ وہ اس کے سیٹ سے اٹھ کر بیٹھنے پر مہمان ہو گئیں۔ آتش دان میں شعلہ بھڑک بھڑک کر گرم کر کے ہوئے تھے۔ کو کرے کو آبی گرمی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن بے سب نے عمر کی مجبوری میں غصہ کرتی رہتی تھیں۔

”ایک وقت تھا جب کھانے کے لیے بلایا جاتا تو یہ کہہ لوگوں سے بھر جاتا تھا۔“ وہ کبھی سی لگ رہی تھیں۔ ”آج کھانے پر بیٹھتی ہوں تو در تک دروازہ دیکھتی رہتی ہوں۔ لگتا ہے ابھی کوئی آئے گا ابھی کوئی آئے گا۔ بعض اوقات تو کوئی بھی نہیں ہوتا سوائے میرے۔ جب میں ہوں تو آتش دان میں گل گھٹنوں کے بل جتا تھا۔ میں نے خود ہی سر چھار کھا ہے۔ تب ہی تو اتنی باتیں کرتا ہے اور میں سن بھی لیتی ہوں۔ اور اس بھی اس کو اپنی حق تلفی کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔ دانیال خان کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتے۔ اس کل خان ہی ان پر بخیر نہ نہیں کرتے ان کے گمان میں دانیال خان ظالم ہیں۔ حالانکہ وہ ظالم نہیں ہیں ذرا لیے دیے رہتے ہیں۔ لیکن ان کو ایک ایک کی فکر ہے۔ ایک ایک کا دھیان ہے۔ اتنی دور بیٹھ کر بھی وہ ہم سے غافل نہیں۔ خان گل کے ذہن میں ابھی ایک ہی بات بیٹھ گئی ہے۔“

پتا میں وہ خود سے مخاطب تھیں یا اس سے۔ اس کو بھی اظہار رائے کا حق ہے یا وہ خاموش نماں نہ۔

جس نے بڑے دھیان سے ان کی آنکھوں میں چمکتی پانی کی طرف دیکھا۔

”دانیال پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ جاگیز چھوڑ دی۔ خان کی جو دانیال کے والد تھے وہ تو بیدار نہیں ہوئے۔ بیس مرض الموت میں چلا ہوئے۔ آخری کئی سال ان کو خوش پیش رہی۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئے۔ بے ہوشی کی حالت میں ان کو ریڈنگ لے گئے۔ ہوش و حواس میں وہ یہ علاقہ بھی نہ چھوڑے۔ جتنا ان کو اس جگہ سے پیار تھا۔ اور یوں دیکھا جائے تو دانیال بس آتے ہیں اور جلتے ہیں۔ لیکن اس علاقے سے بھی محبت ان کو ہے۔ مگر کی ہو سکتی ہے۔ خان گل تو ابھی کلنڈر رہے ہیں۔ ان کا بچپن نہیں گیا ابھی۔ آہستہ آہستہ ان کی شکایتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔“

وہ دل گرفتہ سی بیٹھی اپنے ذہن پر رہی تھیں۔ مٹی پر انہوں نے آتش دان میں دیکھتے خطوں پر نظریں گاڑے رکھیں۔ جیسے وہ خطوں کی اسکرین پر ماضی کی چٹکی ماری فلم دیکھ رہی ہوں۔

”دانیال ابھی کیا کریں۔ مٹی نہ کریں تو آخری بڑی جاگیز کی چٹکی ماری فلم دیکھ رہی ہوں۔“

”طرح کی ہوتی ہے۔ ہم محبت کی بویا لیتے ہیں۔ لیکن ہم ٹھوڑے ٹھوڑے عرصے کے بعد جنگ نہ کریں۔“

”کولیاں نہ چلائیں۔ خون نہ بہائیں تو ہم سب سے بڑے لگتے ہیں۔ ہم میں اور باقی قوموں میں بہت فرق ہے۔ ہم اسلحہ کو ذہن پر طرہ جہن پر سجائے پھرتے ہیں۔ ہم لوگوں پر جان بیٹے ہیں۔ اتنی محبت کرتے ہیں کہ اپنا خون بہا دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہماری حیثیت پر زرا سی ضرب پڑے تو گل کرنے میں ہم ایک لڑکا بھی تال نہ کریں۔“

”میرا ایک ٹھیکہ بڑا تھا۔ وہ اسے ڈی گھنٹوں میں کر سکتی تھی اور سولات کی بھرمار کر کے دیکھنے پان کا پلاؤ بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”ان کو خان گل سے کوئی بغض نہیں۔ وہ تو شیریں کا بھی برابر خیال رکھتے ہیں۔ اور میں کیا کہوں میری

تمہاری باتوں کو اتنا احساس ہے کہ انہوں نے یہ نوکری دراصل میرے لیے ہی نکالوائی تھی۔ ان کو خوف تھا۔ تمہاری جیسے باطل کر دے گی۔ حالانکہ اسے چار کھانوں کے بیچ میں تمہاری کاکیا تصور۔ اسی لیے تو میں نے انہوں کو کیا تمہارا۔ میں نے ہی تمہیں پسند کیا۔ ورنہ کلاسے کی نوکری، کون کی ذمہ داری؟

انہوں نے ایک دم زبان دانتوں کے بیچ بھجھکی۔ وہ کسی کو کہہ رہی تھیں اور کیا؟ روائی میں ان کو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ بے ساختہ ہنس دی۔ اور کتنی دیر ہنستی رہی۔ اس کے ہنسنے سے ان کا خوف بھی رائل ہو گیا۔ تو زوی در پہلے کی نوعیت ایک دم رفع ہو گئی۔ وہ جینچپ کر مسکراتی رہیں۔

میرے اصل میں کل خان نے پریشان کر دیا تھا۔ اور میں نے تمہیں کرایا۔ پتا نہیں کیوں وانیل کی مخالفت مجھ سے، اشت نہیں ہوئی۔ وہ پہلے ہی اتنے پریشان ہیں۔ ہمیں چاہیے ان کی پریشانی دور کر سہ کہ ان کے لیے مسائل کھڑے کر دیں۔ ان کے دل پر دست بوجھ ہے۔ ان سے ایک دست سنی ہو کر کوئی ہے۔ وہ دراصل ایک لڑکی ہے۔ ہم نے جیسے ایک دم انکشاف کیا۔ ”کسی غلط قسمی پر انہوں نے اسے گنوا دیا ہے۔ اور دن رات اس کی تلاش میں سرگرداں اپنے آپ سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔“

وہ خاموشی سے ان کی شکل دیکھتی رہی۔ وہ وانیل کو سر ٹھیک پر سر ٹھیک دیکھ رہی تھی۔ ان کے پاس ان کی بر غلطی کا واضح سبب ہے۔ معافی ہے، غلطی ہے، غلطی صرف وہ سبوں کی ہے اور اس کا کوئی توتو جی نہیں۔

اس نے اپنے ستر پر لیٹ کر کتنی دیر ہر موضوع پر تفصیل سے سوچا تھا۔ بے بے وانیل خان، شیریں خان، گل بے گھر عجیب و غریب کرداروں سے بھر پورا ہے۔

چند کرداروں سے پر نہ ہو چکا ہے۔ کچھ سے انشائیاتی ہے۔ بے اختیار چند کھوں میں سب انہوں نے اپنے اور بے اختیار کو دیا تو انہوں نے اسے بے ساختگی میں پتا دیا تھا اس گھر کو کسی منظم کی ضرورت نہیں۔ وہ دراصل اس کی گولی کے طور پر لائی گئی ہے۔ اور اس بات کا اسے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ ہم زندگی میں شادی کسی کا درد دور کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

یہ رات، دست مختلف رات تھی۔ باہر برف کے اگلے عمارت پر سخن سخن برس رہے تھے اور اس نے ایک عورت کو بچوں کی طرح روئے سرے سے دیکھا تھا۔ شاید اسی لیے اس کا سکون عطا ہو گیا۔ بے میں اور اس میں کم از کم ایک بات تو مشترک تھی۔ وہ دونوں اس گھر میں بناہ کی تلاش میں آئی تھیں۔ کچھ شہزادہ ان لوگوں کی بات ترسے پڑی تو آواز سے خوف زدہ کرتی رہی۔ اس نے یونی ریڈیو کی موٹی لگائی۔ کبھی شہزادہ

کبھی اردو کتب سنی وہ سوئی گئی۔ رات اس پر انکشاف ہوا تھا اور صبح اس کو گھر کی ترتیب کا باقی ماندہ کام بھٹا تھا۔ اب معلوم نہیں اس کو کام کاج کی طرف توجہ کرنی چاہیے یا فرائض کی ادائیگی کے لیے ہے۔ بے کے سامنے جانیے جن کے سامنے اس کا مرتبہ ایک قادر کا تھا۔ وہ وقت ”خوف“ اپنے گناہوں کو تباہوں اور غلیبوں کا اعتراف کرتی رہی۔

تسلیم سمجھتی ہے۔ بے نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔ ”وہیں اسٹورس کچھ کام کی چیزیں پڑی ہیں۔ دیکھو کیا ہر مکان چاہو نکال لے۔ جو تبدیل کرنا چاہو تبدیل کر لو۔ انہوں نے کچھ چیزیں شے سے چن کر ایک پرانی سی جالی

نکالی اور اس کے حوالے کر دی۔

”ہری کو لے لو۔ ہوسٹ کو بلا لیتے۔ مل کر بننا لو۔“

اسٹور بھی سننے سے انکشافات میں سے ایک تھا۔

اس نے روانہ کھولا اور ایس کی طرح ایک ہونڈر لینڈ میں بچھ گئی۔

وہاں جیسی آرائشی چیزیں، کمرشل عمارتیں، ٹیکسٹائزیشن جیسی چیزیں تو تھیں ہی لیکن جس سبب سے وہاں سنگتراش کے مجسمے رکھے تھے اس نے اسے دنگ کر دیا۔ شہادت میں الماریوں میں رکھی ہوئی بیڑوں پر سونہ کون لوگ تھے جن کے مجسمے بنائے گئے۔ اور یہ سنگتراش کون ہو گا۔ اس کو مصوری سے اتنی رغبت بھی نہیں تھی کہ وہ بچان سکتی کہ یہ کسی ایک مہور کے بنائے ہوئے شہ پارے ہیں یا مختلف لوگوں کے پری اور ہوسٹ خان سے اس قسم کے سوالات وقت کا زیاں ہی تھے۔ اردو مشہور و معروف منظر جس میں کوئی خان خارجہ چچا بہن کی کمر کے گوشے میں دلت گاڑے اس کا دل پی رہا تھا۔ یہ مجسمہ ابھی اور راقیہ جیسے مصوری منظر مکمل کرنے سے پہلے رہا ہی نہیں۔ اس منظر کا خاتمہ اس سے برداشت نہیں ہوا۔

ایک اور بڑی میز، خط شدہ جانور پر، تھے خوفناک چمکتے دانستوں والے سیاہ پیچھے کامر پیچھے کا خطوط شدہ بچہ عقاب، بہن باہر ہنسنے لگی۔

لایسٹ خان اس کی بدلت کے مطابق چند چیزیں باہر نکال لیا تھا۔ چند اس نے باہر سے اندر ڈال دیں۔ وہ جو چیزیں لگوائی اور رکھوائی رہی ہوسٹ خان اور بڑی ویلہ ای کرتے رہے۔ گھر کی نئی شکل تھی تو اس کو بڑی خوش گوار فرحت کا احساس ہوا۔ اپنے ہاتھ سے رکھی چیزیں اپنے گھر کا حصہ لگتی ہے۔

اور گویا اس نے آہستہ آہستہ اس گھر پر اپنا حق بھی تسلیم کر لیا تھا۔ اور یہ بڑی سرت کی بات تھی وہ سابقہ گھر سے صرف اپنے بھتیجی ہی نہیں روہتی روایا بھی منتقل کرنا چاہتی تھی۔

”یہ مجسمے کس کے بنائے ہوئے ہیں؟“ اس نے کھانے کی میز پر بڑی بے وہیلی میں سالن کا ڈونچہ اٹھاتے ہوئے پوچھا تھا۔ بے کے ہاتھ میں تندور کی نمیری روٹی کر ڈال گئی۔ ان کی حرکت زور ہوئی۔ پھر انہوں نے سب آہستہ آہستہ قابو پایا۔

”خدا کی بناہ۔“ انہوں نے خود سے بچتو میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے یہ کہنا بھول گئی تھی بیلا۔ ان مجسموں کو وانیل پسند نہیں کرتے۔ اگر تمہیں ناگوار نہ گزرتے تو ان کو باہر نہ نکالتا۔“

”چچا جی۔“ اس نے تابداری سے کہا۔ ”میں نے ایک دو ٹکڑے تھے۔ واپس رکھوا دوں گی۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر مجھے ان کو پسند نہیں تو انہوں نے اسٹور میں جمع کر کے کیوں رکھے ہوئے ہیں؟“ وہ تو بہت سچی ہیں اور۔“

”بیلا بیلا۔۔۔ انہوں نے جلدی سے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ ”خان محل سے میں نے کہا ہے۔ وہ تمہیں یہ علاقہ دکھادیں گے۔ تم کو جی کی سرک تو جیران رہ جائیگی۔ اس سے خوب صورت علاقہ روئے زمین پر کوئی نہ ہو گا۔“

بے نے بات چلتی تھی لیکن شاید وہ اتنی فائدہ ساز عورت نہ تھیں کہ ہمارت سے پلٹ سکتیں۔ اسی لیے ان کی کمزوری صاف پکڑی تھی۔

وہ جب تک اسطبل پر پہنچی سویرج لگا سا اوپر آگیا تھا۔ اس کی مری مری تار بجی ششائیں بیڑوں کے بارہ بجے بھی گئے نہیں ہوئی تھیں۔ وہ خوش گوار سی خشک سی صبح کا طائف لیتی گھوڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہ خوب پلے ہوئے پتھے گھوڑے تھے ان میں سے زیادہ تر کارلٹ مٹلی تھا ان سب کے آگے سینٹ کے سینہ نامہ میں سوکے چوں اور گھاس کا ڈھیر تھا کچھ ادھ کچے کچے کھجور کی پھل کی رکھی تھی اس نے گھوڑے کے سامنے سے ایک پیلا کھجور کا پٹا ہاتھ میں لے کر دیکھا ہے ساخ اس کا جی تپا ہوا ہے کہ کسوں پر مسخ کر کے جبا جائے لیکن یہ اس کی قسمت میں نہیں گھوڑے کے مندر میں تھا۔ اس نے اچھی طرح جھٹول کا جائزہ لے کر گھوڑے کی خوراک اس کو واپس کر دی۔

وہ جب سے اسٹبل میں داخل ہوتی تھی، یہاں موجود ملازمین ایک قطار میں صوبہ کھڑے ہو کر اس کے کسی اعلیٰ حکم کے انتظار میں رہتے تھے۔

”یہ جو چیلنڈر اور ہرپ لوگ کھاتے ہیں، یہ اور ہر نام جوڑوں کو کھاتے ہیں۔ وہ شخص وائس طرف سے نمودار ہوا تھا اور اسے اس کو یہ چاہئے تھی کہ وہ کبھی کامرانا نہیں کر پڑا یہ وہ متحدہ مزاج شخص تھا جو خود کو دل کے بیغ سے اس کو روکتی تھی۔ وہ کھیل کر یا ہرے لیا تھا۔

اس کے مزاج میں جاگیدارانہ غور تھا اور وہ بول سکتا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر اس کے ساتھ اردو نہیں بولے۔ وہ اس دن بھی اس کو اپنی زبان میں بچھا رکھا تھا۔ وہ آج بھی اس سے مالکات غور سے بات کرتا تھا۔

اس کو اس کے اندر میں گستاخی کی بڑی سونگھا لڑی۔ وہ اس کو خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ غالباً اسے اس کو
 بلا بے مہار پتھر پاندہ نہ ہو۔ وہ کہہ کر اندر لنگھ پانی تھی۔
 "اندازاً" کتنے گھوڑے ہوں گے تمہارے پاس؟ وہ اس کے سامنے جم کر اس کی آنکھوں میں سنجیدگی
 سے دیکھ کر بولی تھی۔ شاید اس کا گمان تھا کہ اس کو خوف زدہ کر کے بھگادے گا۔
 وہ لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا گیا۔ اس کا دل بھی بہن ہو گیا۔

"اگے۔ آگے۔ اس نے چاروں طرف کو نزل کو دکھائیے گنتی کر رہا ہو۔
 "کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے خوش سے پوچھا۔ حالانکہ یہ کیسی اُسے اچھی نہیں لگی۔ لیکن یہ ایک
 نر تھا جس میں وہی زندہ رہ سکتا ہے جو طاقتور ہو۔

اب اس کی مجھ میں بات نہیں مگنی تھی کہ جب تک آپ روم میں ہیں وہ کریں جو دینی کرتے ہیں۔
 "نہایت خالص" اس نے اوجھڑا کر کہا اب کے ساتھ اس کو سونگھ کر لیا تھا۔
 "اودھ تو جیسے سرو سامان ہوئے تھے۔"
 "کی ہال۔"

یہ خاموشی سے جس طرف سے آیا تھا اس طرف چلا گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ اس کے مزید سوالوں سے بچ گیا۔

یہ باہر کی لڑکی تھی اور اندرونی باتیں کرتی تھی۔
لیکن وہ اتنا سوجھ بوجھ نہ تھا کہ وہ لڑکی کے کھانا

وہ کئی دراصل بل ویکھتی رہی۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا قیمت خان بالکل ہی چلا نہیں گیا۔ وہ

”جہاں کہیں میں خود گھوم لوں۔ تمہارا؟“
 ”بھول کر بھی ایسا غضب نہ کرنا۔“ وہ ہنس کر کہتا۔ ”یہ شہر میں جنگل ہے۔ یہاں ایسے ایسے خوفناک
 درندے پھرتے ہیں۔ قیمت خان اور خان خانم ایک ٹانے میں شکار کے شوقین تھے۔ انے انہاں کو اس
 حساب میں بادل ہی سمجھتے تھے کہ وہ خوش کو مارنے کا پتہ جانتے ہیں۔“ وہ تصویر ہی تصور میں سمجھو دیکھ کر ہنسی
 تمہیں۔ خوش دلی سے کھل کر۔

”قیمت خان کون ہے؟“
 ”قیمت خان؟ تم قیمت خان کو نہیں جانتیں؟ وہ رکھوالا ہے اس علاقے کا مرنے والے چیتے سدا عاتا

”جسے؟“ وہ پکارا کر رہ گئی۔ ”لیکن یہاں جیسے کیوں سہا جائے جاتے ہیں؟“

انہوں نے اس کی حیرت اور خوف پر مطلق توجہ نہیں دی۔
 ”ہم جاگہ داروں کا ایک انداز ہے۔ کون کتنا طاقتور ہے، اس کا اندازہ صرف زمین کی لمبائی

چوڑائی سے ہی نہیں ہوتا۔ ہمارا اسلحہ، ٹکڑے، چپے ملازمین۔ ایسی ایسی ہر نسل پھولی پھولی ہیں جو ہمارے قارئین راضی و کامعش ہوتی ہیں۔“

آدا! تف ہے بیلا جی تم ہر کہ تم بھی محض ان لوگوں کے وقار میں اضافے کا ایک اپنی سامہو ہو۔ اس کا

نہیں۔ وہی حالت کہ جو ہم سمجھتے ہیں، منفی علم البصیر خوراک دیتے ہیں۔ وہ جو چوکیداری کے جیتے ہیں

رات فہرہ بھوک سے اتنے پیٹاب ہوتے ہیں کہ کسی کو بھی کھا سکتے ہیں۔ ہم لوگ خود کسی کورات کو اس

خونخوار سے خونخوار جانور کو مات کرے۔ لیکن قیمت خان کے قدموں میں ایسے تصویر کشی و رنگ و تاب جیسے

پاؤں لگا۔
 ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سرد لہر نے گزر کر اس کے سارے وجود کو جھکایا تھا یہ کیسے لوگ ہیں
 جو اللہ کے رسول کے سامنے سر جھکا کر اللہ کے رسول کے سامنے سرفرازاں ہیں۔

بہانے سے دریغ نہیں کرتے خون میں نشترے کئے ہوئے انسانی اعضا اس کو خواب میں آ کر گزارتے

ساری رات اس نے خواب میں دیکھا اور راستہ بھول کر گڑھی کی اونچی نیچی واڈیوں میں بھٹک رہی ہے۔

چاروں طرف خوشخوار و درندے ایسی بھیانک آوازوں میں اس کو دبا رہے ہیں۔ اس کا صیقل ایک ناموزن جگہ

جو کرز کے شمال کدھول پر ڈال اور خرمال خرمال گھوڑوں کی طرف بانٹ دے۔ راتے پر چل نکلی۔

کی سڑک سے بنایا ہوا یہ کھوڑاں کاڑھک رات بھر میں جو بد مزہ اس پر جاری رہی ہے اسے سمجھنا
جس شخص اور مقصود جانوری ہو سکتا تھا۔

60

مجھے سمجھیں کہ خراشیں آگئیں۔ لیکن بتائیں اس کپڑے کو کس طرح ہٹا دیا گیا۔
 باپوس تو وہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی زندگی ایک جیسے کی جیسے تھی۔ پچھلے پچھلے
 میں فریڈکچر کر کے لیا جب کے ساتھ نیچے سے کھڑکیوں میں کھائیں میں کھینچا ہوا تھا۔

اچانک ہی میری طرح اس کے دل میں خیال آ گیا۔
 اس نے فل یوٹس کے لئے کھول کر اور کھینچ کر اچھے کر دیے۔ اس کام کے لئے اسے تقریباً
 گڑبڑ کے نیچے کیلئے نئی طرح کا بار بار موبل آئل اور کر لیس نے اس کی صورت کا نشانہ بنایا۔
 لیکن باوجود یہ کسی جیت کیلئے نہ تھی کہ اس کا کپڑا سہولت سے باہر آ گیا۔

اس نے دروست بھی ہوئی ایک کروٹ لی اور سیدھا ہو گیا۔ اس کی شدید چٹون داخل مٹی میں خاک
 ہو رہی تھی۔ درد کی شدت سے وہ اپنے سفید پڑتے ہونٹوں کو دانتوں سے بار بار دبا رہا تھا۔ اس نے اپنے
 زخمی پاؤں کی طرف جھٹکتے کی لاکھین مرتبہ کو خوش کی لیکن درد سے بڑھال ہو کر بھڑکی۔ اس کے پاؤں
 میں شاید موج آتی تھی یا کوئی زخم کیا تھا یا معلوم نہیں اس نے جھگیوں کی طرح تھکیت تھکیت کر اس
 کپڑوں میں موج ڈال دی تھی۔

”تو آج آپ تکلیف کر کے یہ جراب اتاریں گی؟“ اس کی ساری توجہ اپنی زخمی ہانگ کی طرف تھی۔
 اس نے کہتے کہتے کہ اس کی جراب بھیجی۔ جراب کھینچنے کا یہ مرحلہ بھی بہت وقت سے اور بہت
 اذیت سے طویل ہوا۔ اس کے پاؤں کا رنگ سرخ ہو رہا تھا اور پٹا گولا آہستہ آہستہ سوجن بڑھ رہی تھی۔
 اس نے سیدھا ہو کر پریشانی سے پٹاؤں کی طرف دیکھا۔ ”میرا اندازہ صحیح تھا۔“
 معلوم نہیں اس نے کیا انداز لگایا تھا۔ پیلا کی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ پوچھ سکے وہ سکون سے گھاس
 اور پتھروں کے نیچے لیٹا جسے تخت شاہی سے قیمتوں کے فیصلے کر رہا تھا۔
 ”کیا کہا تھا آپ نے کوئی جاننے کے لئے؟“ اس تمام صبح میں اس نے پہلی مرتبہ اس پر نگاہ کی۔
 ”معلوم ہے آپ کو کڑی مہال سے سختی دور ہے؟“

”معلوم ہے میں وہاں رہتی ہوں۔“
 ”آپ وہاں رہتی ہیں۔“ اس نے اوپر سے نیچے تک اس کے پیٹے کی طرف دیکھا وہاں کس حیثیت
 سے رہتی ہوگی۔ وہ بتا لیا۔ ”میرا اندازہ لگاتے سے قاصر تھا۔“
 ”آپ کھانا سیدھا کر کے رکھیں کہیں فریڈکچر نہ ہو۔“
 ”آپ علاوہ جادو کر کے سکیم بھی ہیں؟ اگر فریڈکچر ہوا تو؟“ اس نے مہر کی سنجیدگی سے سامنے
 اوندھی زخمی پڑی جیب کی طرف دیکھتے کہا۔
 ”کیا آپ اب جائیں گی مڑھی تک دوڑتی ہوئی اسی اسپتال سے جس سے آپ ان وقت دوڑتی آ رہی
 تھیں؟“

”لیکن سر میں تو ڈیڑھ تک پیٹے آجائیں گے میں یہاں آپ کو اکیلا چھوڑ کر۔“
 ”پیٹے؟ کون سے پیٹے؟“ اس نے اچھائی حیرت سے اس بے وقوف لڑکی کی طرف دیکھا جس نے ابھی
 ابھی ایک عقل مند کی گامٹا ہو بھی کیا تھا۔
 ”وقت اتنا زیادہ نہیں ہے۔“ اس نے اسی سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا۔ ”میں یہاں شیر اور چیتوں کو

منیجمنٹ ہاؤس۔ آپ کو مڑھی سے کسی سواری کو لاؤں۔“
 اس کا چہرہ بڑھتا رہا تھا۔ اس کی تکلیف میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اور وہ اس اضافے میں کسی بھی کی کا باعث نہیں بن سک رہی تھی۔
 ”اگر کسی طرح آپ جیب کو سیدھی کر لیں آ۔۔۔ توہ رات کے کر چل ہی ہو گئی۔ اسے معلوم تھا وہ جب
 سے اس سے رخصتی حالت میں ملی تھی اس کا منہ بڑھتا رہا تھا۔
 ”آپ جیب چلا لیں گی؟ آپ نے پہلے چلائی ہے؟“
 ”پہلے تو کبھی نہیں چلائی۔“ اس نے صداقت سے بتایا۔
 ”تو یہ سب سے نہیں چلتی۔“

ڈوبے سورج کا کس اس کے پاؤں سے لپٹ کر اس کے چہرے کو سر کر رہا تھا۔ درختوں کی چوٹیوں
 سے سرخائی ہوئی دھوپ اب بالکل ہی ختم تھی۔ معلوم نہیں یہ شخص چیتوں کے سلسلے میں اپنا امتحان
 کیسا بن رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس و سطرائی راستے سے چلتی واپس اور سرنگ پر آگئی۔ یہ اس کا حکم تھا۔
 درختوں کو بھر کے لیے بھی کسی انسانی جان کو چیتوں کا قلعہ بننے کے لیے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ قلعے جیسی
 دوارا تھی اور بھی کہ یہاں سے اس کا نشان بھی اھٹلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر نیچے کھائی میں بڑے
 فحش کی طرف دیکھا۔ اس کی ہانگ میں سخت تکلیف تھی۔ درد کی شدت سے وہ بار بار دہرا ہو رہا تھا اور
 سیدھا ہو رہا تھا۔ جانے کہاں سے اس کے دل میں ساتویں جماعت کی منزل مانتیں نے بلے بول دیا۔
 وہ تیزی سے واپس آگئی۔

تیر تیر قدم اٹھاتی کھائی سے اترتی۔ سیدھی جیب کی طرف گئی۔
 وہ اس کی واپسی کے انتظار میں جیت لیٹا ہوا تھا۔ پہلے اندر سے کو آسمان سے اترتا دیکھ رہا تھا۔ اس
 خندہ کی لڑکی کی خندے سے اچھلا دیا۔ وہی واحد ذریعہ تھی جس کو وہ کام میں لاسکتا تھا۔ ”وہ بار بار جاتی
 تھی بار بار آ جاتی تھی۔ اس پر اس کا کوئی بس بھی نہیں تھا۔ وہ جیب کے پاس کسی چیز کو تلاش کرتی پھر رہی
 تھی؟“ اس نے اس سے پھر کو وہ تھکیت کر کیا کر کے کی؟ وہ یہ برا سا لڑکی کا عجزانہ شیب سے کیوں اٹھا کر لاتی
 ہے؟

اس کے خیال میں غور نہیں ہوتی ہیں۔ کم از کم اس کی زندگی میں ایسی ہی غور نہیں آئی تھیں۔ وہ آنکھ
 مٹا کر، ہانگ اور جسم سہانے کے۔ اس کی چیز کو باقی نہیں جو کم عقل کی کھم مٹھدی اور کچ بکھی ہوئی ہیں۔
 یہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔
 لیکن وہ زخمی پاؤں کے باوجود بھلا کر اٹھ بیٹھا۔

گرنے کو تیار جیب اچانک سیدھی ہو گئی تھی۔ اس نے یور کا ساہو سا استعمال کیا تھا۔ جتا نہیں جیب
 ایسی حالت میں تھی کہ اچانک سیدھی ہو گئی۔ یا یور ہی ٹھیک لگا تھا۔ سخت سے یا تجربے کی کامیابی ہے یا
 خواہ مخواہ ہی تھی۔
 لیکن تجربے کی یہ کامیابی اسے بھلا کیا بردے گی؟

وہ بار بار اس سے زخمی ہر کوئی کھینچے لگا۔ دھوپ پڑاؤں کی چٹوں سے بھی غائب ہو گئی تھی۔ ذرا ہی دیر میں
 یہ کھائی ایک مہیب اور خوف ناک عمارت بن جائے گی۔ دور جنگل میں راولیوں سے پرے گھبراہٹوں کے

چالنے کی صاف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گو وہ یہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ علاوہ چیتوں کے گھبراہٹ بھی کسی مویش پر خوشخوار ہو جاتے ہیں۔
”سر! آپ کو شل کیجئے کسی طرح بیت تک آئیے۔“ وہ آسمان کی طرف مسلسل دیکھتا نہیں اور اس کی تلاش میں لگتا تھا۔
”سر!“

اس کے دوبارہ اصرار پر ایک اچھٹی سی نگاہ اس پر ڈال کر اس نے سیدھی کٹری چپ کو دیکھا۔
”اچھا فرض کیا، کچھ گھبراہٹ؟“
وہ خاموش ہو گئی۔ وہ گڑھی بھٹی تان کا لالک تھا اور غالباً ہر وقت حکم دیتے رہنے کی وجہ سے حکمائے کی بات نہیں دیتی تھی۔

اس خاموشی سے وہ اس کی شکل دیکھتی جھنجھلا گئی۔
”اور آپ کو اٹھانے کے لیے کریں تو آئے گی نہیں۔“ اس نے لہر کا ڈنڈا اٹھائے میں اٹھایا اور تھمتی ہوئی اس کے پاس لے آئی۔ ”آپ اس کی رو سے اٹھنے کی کوشش کیجئے۔“
”اچھا، نہیں۔“ اس نے سیدھی سے اٹھنے کا گمراہ ساں لیا۔

”میں نے سوچا تھا نہیں آپ کے کیا ارادے ہیں؟“
(ان کا چہرہ پیش رو قسم کے اٹھ رہا تھا۔ ان کی آنکھیں مسکراتی ہیں مگر جو فلم کی حد تک سنگین اور نتیجہ)

”معاذ کیجئے گا۔“ اس نے ایک ہاتھ سے لاشی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے کندھے کا سہارا لیا۔ وہ اپنے میں جھٹکا چہرہ سارے کی تلاش میں اس کے بالکل نزدیک تھا کہیں سے اڑا ہوا بے بے کا فٹو اس کے کانوں میں گونجا۔

پاؤں پر لگا سا زور ڈال کر اٹھانے میں بھی اس کا چہرہ ٹپکا ہو گیا تھا۔
”آپ پاؤں اٹھا لیجئے اور میرے کندھے کے سہارے ملے۔“
شاید تکلیف کی شدت کی وجہ سے اس نے اس کے کچھ کے حکم کا برا نہیں مانا۔ اور اس کو اس کے سارے چلا بھی کتا تھا۔
وہ قدیم تین قدم۔

پھر ان قدموں سے اس نے دنیا کے گرد پھرتے پھرتے پکڑا لیا۔
کبھی کبھی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ جاتا۔ کبھی تیز ہواؤں کے جھکڑے اڑتے اس کے منظر پر۔ وہ بہت دبی تھا۔ مجبوراً ”جی“ اس نے اپنے سارے بوجھ اس پر لا دیا تھا۔ وہ پٹ پر بیٹھا تو اس کا ہندو عاؤن سے ٹوٹا لگ رہا تھا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور اپنی اذیت کی شدت کو دیکھتا ہیٹھ سے ہوا کیا تھا۔
”نہیں، کچھ اٹھانے کی کوشش نہ کیجئے۔“ صرف ایک سے گزارا کرنا چاہئے گا۔“
”میں کو شش کروں گی۔“ اس نے خاموشی سے ڈرا تو تک سہل۔ گاڑی اٹ جانے کے بارے جو چاہی اٹھتے ہیں میرا ہی تھی۔ کچھ اور بیک سہل کر اس نے سیدھی سے شیشے سے پار اس طرف دیکھا۔

”ہرگز نہیں۔“ اس نے اس کے اسٹیرنگ گھماتے ہوئے ہاتھ روک دیا۔ ”میں اپنی جان بچانے کے لیے آپ کی جان سے نہیں کیل سکتا۔“

وہ لہر کو روک سی گئی۔ وہ اذیت میں اڑ رہا تھا۔ ترخ میں رہا رہا تھا۔ حکم نہیں چلا رہا تھا۔ لیکن اس معمولاتے فقرے میں ایک اجنبی لڑکی کے لیے جوا تھا۔ ہر دی اور احساس تھا اس کی آنکھیں تر کر رہیں۔
”میں گاڑی چلا رہی ہوں۔“ اس کے مضبوط ہاتھوں کے نیچے ابھی تک وہ اچھے اس طرح دے تھے جنہوں نے اس کی جان بچائی تھی۔ وہ شیلو احسان فراموش بھی نہیں تھا۔
”بے شک چلا رہی ہوں گی۔ کھائی سے سوک تک آنا ذرا نہیں۔“

”اس کے رہا ہمارے پاس چڑا کر بھی تو نہیں۔ اگر ہم رات بھر نہیں پرے رہے تو شاید جنگی جانوروں کا لقمہ بن جائیں۔ یا سڑی سے کھٹھ کر مر جائیں گے۔ تو کوئی سارے میں کیا حرج ہے؟“
اس نے گردن کھٹا کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اندھیری رات میں اس ہمدردی لڑکی کا گریں اور مٹی میں لٹھلا چہرہ دیکھنے سے نظر بھی تو نہیں اڑا تھا۔

”بالکل نہیں۔“ اس نے قسط سے بغیر اٹھائے کہا۔ ”اور میں آپ کو پہلے بھی اجازت دے چکا ہوں۔ آپ خود سکتی ہیں کہ آگ کر گرنے لگا ہے۔“
”اور آپ نہیں جانتے کہ میں اس طرح بالکل نہیں جاؤں گی۔ اور رات بھر گئی تو میں کھائی سے سوک پر بھی نہیں آسکوں گی۔ پلیز آپ میرے۔“

وہ اپنے ارادے میں غیر متزلزل تھی۔ اس نے خاموشی سے اپنے ہاتھ طرہ کر لیے۔ بائیں طرف گری کھائی کی مٹی سارا سارے ہو جانے کا مطلب بتائوں فٹ کرے کھڑے تھکے کی طرح دھڑکتے چلے جا رہا تھا اور دائیں طرف وہ سوک تھی جو چائے کی طرف جاتی تھی۔

وہ سیٹ پر ایسے مضبوطی سے جم کر بیٹھی جیسے ساری عمر کی بیوی بڑے ٹرک چلائی آئی ہو۔ ہاتھ اسٹیرنگ پر جما کر اس نے کن آنکھوں سے دھجکی کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے تھے لیکن غالباً اس کو اس گریٹر اور مٹی میں لٹھلا لڑکی پر ذرا بھی غور نہ تھا کہ وہ گاڑی کو ایک انچ ہلانے پر بھی قاصر ہوگی۔ لیکن اس کے دیکھتے دیکھتے جب نے توجہ سے ہو کر دائیں طرف کاموز لیا۔ اور آہستہ آہستہ نشی راستے سے اڑنے لگی۔ کبھی وہ حیرت سے اس کے مشاق ہاتھوں کو دیکھتا تھا کبھی سوک کی طرف۔

لہر بھر کے لیے اس کو لگا جب سب ہوئی ہے لیکن وہ ایک بڑے سے چمچے سے روک لگا کر سوک پر اٹھئی۔ ایک دبا دبا سا گمراہ اس نے اٹھانے کی کوشش کی۔ جتنی بھی سوک تھی۔ اس نے اپنے ارادوں کو آج ہی تھے مقام پر کامیاب ہونے کا محاسبہ اس کا ہوا۔ سی سر می سوک پر فوراً ہل ڈرا۔ یہ ہو گئے۔ لیے جارہی تھی جیسے اپر پورٹ روڈ پر وہ برائے ناؤں کی فوکی لے کر دوڑی تھی۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ یہ اس کی مہارت میں اس کا باپ نہیں ایک اجنبی شخص تھا۔ لیکن وہ تو وہی ہی تھی۔ شواہن فرمال خوش باش و آزاد۔

دوبارہ زندگی مل جانے پر دنیا بھری گئی ہے۔ اس نے گردن گھما کر شیشے سے باہر کی طرف دیکھا۔ زندگی تو دوبارہ اس کو کبھی ملی تھی۔ حیرتی حیرت سے گردن ڈرا۔ یہی اٹھائے سوک پر پھٹکے لے کھائی دوڑی تھی لیکن زندگی دوبارہ پانے کے تصور سے سرشار نہیں رہے نیاز تھی۔

اے صاحب کی مالک نہیں تھی۔ وہ بھی ہوئے ہوئے کاپی رہی تھی۔ وہ فوری طور پر سوجانے کی شاید خواہش لے کر تیز کر رہی تھی۔ لیکن کتنی دیر آنکھیں بھاڑے پھرت کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ جب بھی آنکھیں میچ کر سونے کی کوشش کرتی آہستہ آہستہ نشیب کی طرف لڑھکتی چپ اور چپ کے پیسے میں پھنساوا نیل خان کا پاؤں اسے ڈراوتا۔ وہ خوف زدہ ہو کر آنکھیں کھل دیتی۔

یہ ایک دلہ گزرنے والا عمل اس پر سے باہر گزر رہا تھا۔ اس نے اسے جو رکھ لیا اور دوسرے کے نیچے خانے میں ڈالے۔ سوزے لائڈری کی پانٹ میں پیچھے داخل گرم ہو گیا تھا۔ اسے آج زیادہ ہی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ خرگوش ایسے نرم گرم کیل میں اسے بند نہیں آ رہی تھی۔ جانے کہاں سے اتنی بہت ساری سویاں سی جسم میں بھی باری تھیں۔ اور باوجود کمرے کا دروازہ بند کر لینے کے باہر کاشو روغل وہ ہمارے ایک صاف محمدس کر رہی تھی۔

باہر اچھری تھی۔ ہر شخص جاگ رہا تھا۔ اور کتنی مرتبہ اس نے ہندو رازوں کے باہر قالینوں پر ابھرتے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ کتنی مرتبہ اسے لوگوں کی بلند سرگوشیاں سنائی دیں۔ معلوم نہیں رانیاں خان کسے زخمی ہوئے تھے۔ فرسٹ ایئر گئی۔ گرمی میں کوئی ڈاکٹر موجود بھی تھا۔ جیسے وہ اس کا جی چاہا ان سوالوں کے جواب کے لیے وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ لیکن پھر اسے مناسب نہیں لگا۔ ان کا مالک زخمی ہو کر کھڑا تھا۔ وہ سب اپنی محبتوں کا اظہار اپنے اپنے انداز میں تشویش سے کر رہے تھے۔ وہ کس حالت میں کمرے درمیان جانے ان کی بابت سوال کرے؟ ان پر تو اس کا کچھ کوئی حق تھا۔ رشتہ۔

رات میں بتا نہیں کس وقت وہ سوئی۔ اور اڑھائی کو کھڑے ہوئے۔ کھانسی ہو رہی۔ حالانکہ اتنی بے نیاز وہ کبھی نہیں رہی تھی کہ دروازے کا لوٹ چڑھنے پر پھر سوجانے جاگی تو اس کی کھانسی پر دروازہ دستک دینے والی ہوتی چڑھا جیسے اس سے مایوس کی ہو گئی تھی۔ سو رہا چہ نہ کیا تھا اور مریم اس کے سر پر کھڑی ایک تواتر سے اسے جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھلیں تو مریم باوجود آداب کے منہ چپا کر نہ رہی۔

کتنی طور پر اس کو بے بے باری تھیں۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دن چڑھ آیا تھا۔ پتہ تھا۔ اگر سورج نکلا تو کھودو صوبے سے بھر جائے گا۔

وہ مشکل سے آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھی۔ مہم جا چکی تھی لیکن اس کا جسم اس طرح ٹوٹ رہا تھا کہ اس سے لڑا بھی نہیں جاسکا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر شیشے میں جھانکا۔ لہجہ بھر کے بے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ رات بھر میں اس کے چہرے پر کالے پیلے دھبے کہاں سے آگئے ہیں۔ اوہ جیسے بیس منظر کی فلم کی طرح رات کا ڈراؤنا خواب اسے پھر ڈرائے لگا۔ اس نے سستی سے نیچے پاؤں میں ڈالے غسل خانے میں خستہ وہ مین کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنی ہیبت کڈانی اسے خود بھی ہنسائی۔ کتنی مرتبہ صابن رگڑا تو وہ گریس کے دھبے پھڑاسکی۔ اور کتنی دیر کمرہ میں کی پھواریں بیٹھ کر اس کا دل ہو سکی کہ لوگوں کے سامنے جاسکے۔

اس نے دروازے کھول کر باہر جھانکا۔ رات ابلا ہوا تھا۔ اب ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اچانک سر پر افتد آ پڑنے

اس نے ابھی تک دانیال کے زخم نہیں دیکھے تھے۔ بلکہ اس کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس کی اب پہلی کوشش تو یہی تھی کہ کسی طرح اس کو فوراً سے پشتر اس کے گھر تک پہنچا دے۔ حالانکہ اصولاً اس کو دوسری طرف ہسپتال کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس کا خیال بھی اس کو آدھا راستہ عبور کرنے کے بعد آیا۔ اور شاید گرمی میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر موجود ہی ہو۔ اس نے سوچا بھی کہ اس سلسلے میں اس سے کوئی سوال کرے یا اس کی رائے معلوم کرے۔ لیکن سڑک پر اندر میرا پھیل چکا تھا۔ اور جا بجا بل کھاتے ہوڑوں پر بھاگتی جیپ سے سرائی کر وہ کوئی رسک لینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ راستہ بڑا افسردہ تھا۔ وہ ملی اسپڈ میں تیز دوڑتی چھوڑے ہوئے مختار قدر اٹھارہ سی سی۔ اس لیے اس نے ساتھ بیٹھے شخص کی طرف ایک لمحہ کو بھی نہ دیکھا۔ جیسے وہاں کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں گرمی کا پتھر کھا رہا ہو۔

اور مجھ ہی تھا کہ وہ رات کے بہت زیادہ تاریک ہونے سے پہلے بلند فصیلوں والے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔ گھٹ پر متعین گاڑو نے کٹھن پر کھلی بندو قلی نیچے کر کے پھاٹک بائیں بائیں کھول دیا۔ وہ جیپ کو پچھتاہٹا مالک کو بھی۔ گاڑو نے بندو قلی کے بٹ پر قبضہ سے ہاتھ مار کر فرمایا "سلوٹ کیا۔ آٹھریز یہاں تک آیا تو نہیں لیکن اسے اثرات کہاں کہاں پھوڑ کر نہیں گیا۔

"وہ ٹیکہ اسلام آباد دانیال کے سر کے اشارے سے اس کا سلام قبول کیا۔

جیپ کے اندر داخل ہوتے ہی طبعی غما فصیلوں والا دروازہ پیچھے سے بند ہو گیا۔ اوپر چوکی پر کھڑے سپاہیوں نے بندو قلی نیچے کر لیں۔

گویا جیپ زمانہ جنگ سے زمانہ امن میں داخل ہو چکی تھی۔

خوابوں اور باداموں کے طویل بارگ کے ٹھکانے سے موٹا کما کر جیپ پھروں کی بیلوں سے لپٹے ستونوں والے پورچ میں آکر گر گئی۔

اس نے آنکھیں میں چالی تھمائی ایک بلڈ سے پاؤں اٹھایا۔ جیپ کی آواز سن کر چہار طرف سے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ فائدے کے مطابق اس وقت ملازمین رات کے کھانے میں مصروف ہوتے تھے۔ لیکن شاید انہوں نے الگ الگ جیپ کی آواز پہچان لی تھی۔ کسی نے پیچھے سے جیپ میں بڑے جیپ دیکھے، کسی نے آواز پچھڑ کے نشین عموں نے دور سے سو گھر کر ہی خطرہ بھانپ لیا تھا۔ وہ اچھی آواز میں خطرے سے دوسروں کو آگاہ کرتے جیپ کی طرف دوڑے ملے آ رہے تھے۔

اس نے جیپ سے نیچے چھلانگ لگائی۔ ہڈ کے لیے دوڑ کر آنے والے لوگوں سے پہلے اس نے اعتراف کی دو تین بیڑیاں عبور کیں اور کھلے مرکزی دروازے سے چھپا کر سے اندر ہو گئی۔ طویل راہداری میں اس نے بے بے کو جس باختہ نیچے پاؤں باہر کی طرف دوڑنے دیکھا۔ غالباً کسی نے اس حادثے کی خبر ان تک بھی پہنچا دی تھی۔ وہ اتنی بے کھلائی ہوئی تھیں کہ ان کی نظر شکستہ شکستہ مرے مرے قدم اٹھاتی ہوئی میں بھری بیڑا پر بھی نہیں پڑی۔ جو کچھ بھرے قدموں سے راہداری کا قیمتی تالین چاہ کر وہ غیاس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ اس لیے دوڑنے والے لوگوں کے رخ میں سے دوڑتی وہ بھی اپنے کمرے تک چلی گئی۔

وہ بہت تھک گئی تھی۔ زندگی اور بہت دور میان ایسی رسم کشی نے اس کو سہارا دیا تھا جیسے تیسے گاڑی گھسیٹ کر یہاں تک تو لے آئی تھی لیکن یہاں اترنے کے بعد اس کو اندازہ ہوا کہ وہ بھی اپنے مضبوط

سے جیسے لوگ پہلے تو کھلائی جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ جیسے وہ معمولات کی طرف پلٹ گئے۔ وہ تیز قدم اٹھائی کھانے والے کمرے میں پہنچی۔ ناشتے پر خلاف معمول لیٹ ہوئی تھی۔ بڑی روانی اور تیزی میں اس نے اندر قدم رکھا لیکن وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔ اس نے بڑے افسوس سے سوچا غالباً ناشتا سرو کیا جا چکا تھا۔ اس پر وہ خستہ خان یا پروسٹر کے ساتھ کیا مفریجی کرے۔ اور انہیں کیونکر کھانا پائے کہ اسے ناشتا چاہیے۔ اس نے ناشتے کا ارادہ منسوخ کر کے بے بس کے کمرے کی راہ لی۔ اور اس قسم کے حالات میں انسان کسی قسم کی بھی زیادہ انتظامی کی توقع کر سکتا ہے۔ یہ تو ایک معمول بات تھی۔ وہ بے بس کے کمرے میں پہنچی تو بھونک سی گئی۔ ٹرالی پر چائے سجائے اس کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی رہ جیسے سو گئی تھیں۔ شاید وہ بھی ساری رات جاگی ہوں۔ اسے اپنے آپ پر ندامت محسوس ہوئی، اس نے پریشان شاہنشاہ سب سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

”السلام علیکم۔ سواری رات میں دیر سے سوئی تھی۔“
”میں تو انٹائم سے معذرت کرنے لگی تھی۔“ بے بس نے شکست سے نرالی اس کی طرف دیکھ کر دی۔ ”مہم لوگ رات کو پریشان ہو گئے تھے کہ کھانے والے کمرے میں یا بیچے نہیں ہوئے۔ اور تم نے بھی اتنا تکلف کیا کہ بھوکے سو گئیں۔ اب میں صبح سے بیٹھی خود کو کوس رہی تھی۔“
وہ دل کھول کر غصہ دی۔ واقعی اس نے رات تو کھانا ہی نہیں کھایا۔ اور کھانے کی کمی کا احساس داسے رات میں ہوا نہ سچ کہ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”اتفاق سے رات مجھے بھوک نہیں تھی۔ ورنہ کھانا میں خود بھی بھل کر کھا سکتی تھی۔“ وہ بڑے سلیف سے ان کا فرائی انڈا ان کی پلیٹ میں اندیشہ سے ڈال دی۔ ”اب کے سلاکس پر کچھ لگاؤں؟“
”نہیں۔“ وہ اپنے دھیان میں غرق بہت دیر منتظر رہیں۔ ان کا خیال تھا وہ ان کی پریشانی دیرانت کرے گی۔ لیکن اس نے شاید ان کے اچھتے سے فخر سے کوئی مٹنی نکالے ہی نہیں۔

”رات بھر ہم بہت پریشان رہے۔“ انہوں نے پھر کنا شروع کیا۔
”وہ رات رات دانیال آئے تو ان کا ایک کمرہ لٹہ ہو گیا تھا۔ ان کی ٹانگہ زخمی ہو گئی۔ قیمت خزان اور خان کل اسی وقت سہو شرفب جانا چاہتے تھے۔ لیکن دانیال نے ہی منع کر دیا۔ یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ اتنی دیر سے ڈاکٹر بلایا جاتا۔ رات ہو جاتی اور باہر دشمن ہر وقت موقع کی تاک میں رہتا ہے۔ یہاں تو لوگ برسے برسے وقت میں بھی دشمنی کا نلے سے باز نہیں رہتے۔“

اس کے چہرے پر ایک سا گھبراہٹ کا رنگ آیا۔ پھر وہ اپنی فحش چھپانے کے لیے پالی پر جھٹک گئی۔
”سب لوگ کوٹھس کرتے رہے کہ وہ پچیس ہند حوائیس۔ لیکن وہ کسی طور آگاہ نہیں ہوئے مگر روتی باندھنے سے بھی بہت آرام ملتا ہے۔ لیکن دانیال چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ہم سب کو ان کی حکم عدولی کی عادت نہیں۔“

”تو ڈاکٹر کا کیا ہوا؟“ اس نے سنبھلے سا رنگ میں پالی پر چڑھ کر پوچھا۔
”یہاں پر ہمارا ایک گزرمی کا اپنا ڈاکٹر ہے۔ کوئی زیادہ قابل نہیں۔ لیکن وقت طور پر گزارا ہے اس نے پاؤں باندھ دیا۔ پھر صبح کی نماز کے بعد خان گل دینو سیدو شریف ڈاکٹر کو لینے چلے گئے۔ وہ ان کا دوست بھی ہے۔ مگر اس دوران میرے کہنے سے دانیال پچیس ہند حوائیس۔“

بے بس نے لی اذیت بھری۔ بے بسی نے اس کو محرومی کے شدید احساس سے دوچار کر دیا۔ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں ایسے لوگ جن کو بے بسا محبت ملتی ہے۔ اور وہ محبت کے لیے سرگرداں نہیں ناراض ہوتے ہیں بہت مطمئن اور پرسکون۔

بے بسے ناشتا کرنے کرتے اپنے خیال میں ڈوب گئیں۔ انہوں نے پاؤں پلندہ سب کو حکم سنایا تھا کہ دانیال خان اس وقت سوتے ہوں گے۔ گھر میں کسی قسم کا شور نہ ہوا اور سرجن کے آنے سے پہلے کوئی ان کے کمرے میں قدم نہ رکھے۔

وہ خاموشی سے قد آدم آتش دان پر بجی شیشے کی ننھی مٹی چڑوں کو ایک ترتیب سے جمائے لگی۔ بجے پریشان تھیں۔ اس لیے خاموش ہو گئیں۔ پلا کو علم تھا آج لمبی چوڑی کپ شپ کا کوئی پروگرام نہیں۔ پری بھی فارغ تھی۔ وہ بے کار وقت میں کمرے کے کام پر لگ گئی۔ وہ جس کمرے میں کام کر رہی ہوئی ہے اس کے آس پاس کریشیا سنبھال کر آجاتیں۔ کبھی وہ بے سناکتلی میں کریشیا ہاتھ سے کرا کر اس صحنہ میں اٹھ کر دوڑتیں تھیں کسی نے انہیں بلکا رہا ہو۔

پھر وہ اسی ایمنیٹ سے واپس آتیں جیسے انہیں کبھی کسی نے نہیں بلکا رہا۔
اس کو بے بسے کا یہ بے بسی سے اٹھ کر دوڑنا پریشان کر دیا تھا۔ یہ ان کی عمر کا تقاضا بھی نہیں تھا۔ لیکن اسے کیا حق قانون محبت کرنے والوں کے جیسے ناقص نہیں کر کیا جاسکتی تھی۔

گیاں بیچے کے قریب بڑھتا میں پھر شور مچا ہوا اہمیت سی گاڑیاں رہیں بہت سے قدم دوڑے۔ جن میں بے بسے پر دوڑنے پر ہی ہمیشہ سب سے شامل تھے۔ وہ کوئی آدھی کا روٹنی جسم ہاتھ میں پکڑے حیران پریشان گھڑی تھی کہ دنیا پھر خالی ہوئی۔ وہ بڑے اہتمام سے لکڑی کا نیمہ دارش سے چکار ہی تھی کہ کسی نے دھڑ سے دوڑا نہ کھل دیا۔

”السلام علیکم۔ بے بسے کہاں چلی گئی ہیں؟“
”چنانچہ۔“ اس نے آنسو لے کر کچھ اور انداز سے پچھانا تھا۔
”آپ بے کار ہی اس گھر پر اپنا بار غریب کر رہی ہیں؟“ وہ ہنس کر آہوا اس کے پاس آیا۔
”کیوں؟“ اس کے دماغ نے پریشانی میں بہت دور تک جلا بن لیا۔
”دانیال خان جھٹک تو ہیں۔“

”جھٹک؟“ وہ جاتا جاتا ہیڑیوں پر پلٹا۔ ”جھٹک تھاک پڑے۔ ان کو کیا ہوا؟“ وہ پچھلے میں معمولی سی موقع ہی تو آئی ہے۔ وہ تو جانتے دوڑتے کسی بچے کے بھی آجاتی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے وہ دو تین دن میں پھر سے ہمارے دوڑنے کے قتل ہو جائیں گے۔“

”اوہ۔“ اس کو خان گل کی لاپرواہی پر حیرت سی ہوئی۔ سارا گھر ہر اسماں ہو تو خان گل کا ضبط کمال کا ہو سکتا ہے۔ گویا وہ بھی دانیال خان سے اپنی دشمنی میں انسانیت فراموش کر دیتا ہے۔
”بے بسے ہیں تو اپنی دور سے سرجن کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟“

اس کے لیے کسی کی کو اس نے ذرا حیران ہو کر سنا۔ چند کھوں کے لیے اس نے اس کا چہرہ دکھا۔
”سرجن کو بلانے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ وہ ان کے عزیز دوست ہیں۔ اب ان کو چند دن کے لیے بلانا جانا منع ہے۔ تو سرجن ہمارا نہیں کچنی دینے گزرمی آئے ہیں اور آپ کا خیال ہے کہ وہ ان کی ٹانگ

کتنی دیر سے وہ اس ظالم چرسے والے مجسمے کے ساتھ مجسمہ بنی کھڑی رہی۔ لیکن اس طرح تو بات نہیں
سے گی۔ خان گل اور سرجن رات سے بھوکے ہیں اور ان میں برواشت بھی نہیں ہے اس کو برکٹ
ناشتا ملے تک پہنچانا ہے۔

اختیار "اسے خود ہی باورچی خانے کا رخ کرنا پڑا۔ گوہا چھٹی طرف پہنچائی بھی نہیں تھی کہ باورچی خانہ
کس جگہ ہو گا۔ اسے ایک تک باورچی خانے سے سناٹہ نہیں بڑا تھا۔ یہاں اس کا باورچی خانے میں داخلہ
کس گنتی شکار میں آئے وہ انداز سے چلتی کھانے والے کمروں کی سیدھے میں گئی وہاں سے دھوؤں کر
پینٹری میں پہنچی اور پینٹری میں موجود کسی شخص کی ہر سے وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔
خستہ خان تیش اور پریشانی کے عالم میں جو کی پر بیٹھے غمشوں میں مریے غالباً ہانک کی صحت کی
طرف سے فکر مند تھے اس کو یوں بے بہا باورچی خانے میں گھس کر کھٹک گئے۔
"ناشتا تیار کرنا ہے۔ وہ خود لکڑی صاحب آئے ہیں نا مان کے لیے۔"

خستہ خان نے ساری بات تو بے کسی سے خال خاک کے سر بھی ہلا دیا۔ لیکن ایک لفظ سمجھنے بغیر ہی اس طرح
اسے نکر کر دیکھ گئے تھے چھ منٹ اس نے خستہ خان کے ارادوں کا انتظار کیا۔ پھر بے تحاشہ اس نے
کیونٹ کولی کر برتن اٹھائے۔ اسنو کے قریب میں گھس کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رک گئی۔
وہ سدا ناشتا تیار کر سکتی تھی۔ جو وہ خود کھاتی ہے۔ لیکن وہ سدا ناشتا تیار ایک مدت تک نہ بنا پاتی جو
سرجن شکر بند کریں۔ اس نے پہلے مشروب اور سوکے گوشت کے ٹکٹے اٹھائے پھر اپس رکھ دیے۔ وہ
کبھی تیش سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہی کیونٹ ڈن روٹی والا ناشتا تھا ہے۔ ساتھ ہی اور ناقابل اعتراض
تھی۔ وہ ہانڈوں میں مسروٹے، ہولی تو خستہ خان پر گئے وہ اپنی بیٹائی زبان میں اسے کیا سمجھانے کی کوشش
کر رہے تھے تو ایک لفظ سمجھنے کی اہل نہیں تھی۔
"مہمان۔ مہمان۔" انہوں نے کچھ کہا تھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ مہمان کے لیے ہی ناشتا تیار کر رہی ہوں۔"

وہ اسی طرح خفا رہے۔ اور یہ اس کو بڑی مشکل سے سمجھ میں آیا کہ ان کو مہمان کا کام میں جتا رہا ہے۔
نہیں۔ مہمان مہمان کا مطلب یہ کہ ہر آدمی کو اپنے مقام پر ہونا چاہیے۔ اس نے ناشتے کی بڑے سجادی
تھی۔ وہ ہنسی مسکراتی باہر نکل آئی۔ خستہ خان خدا و سب میں لکھ بڑھاتے اسے روک بھی نہ سکے۔
ناشتا تیار تھا اس نے دونوں ہاتھوں میں بڑے اٹھائی بڑی تیزی میں وہ وہاں سے راستے پر چلتی پینٹری
بال اور راہاروں سے گزرتے وہ لمبی کیلری کے راستے پر گزرتی۔ وہاں سے دائیں طرف راستہ دانیال
خان کے کمروں کی طرف جاتا تھا۔

وہ بڑے ہاتھوں میں بکڑے بکڑے رک گئی۔ وہ یوں بے دست و پا ان کے کمروں کی طرف تو جیس جا سکتی
تھی۔ وہاں کوئی آجائے نظر آئے؟
اور یہ قسمت ہی تھی کہ خان گل نے اس کا سارا مسئلہ حل کر دیا۔

خان گل نے اسے بولے۔ بتا رہے تھے جہاں سے کچھ شے ہاتھ میں لیے کمرے دیکھا تھا۔ وقت نہیں
ملاقاتوں کے حال میں جگڑا رہتا ہے۔ خوش فہمیاں بھی دراصل باریک ریشم کے ٹپے ہیں جن میں الجھ کر
پھنس کر انسان تنگ ہوتا جاتا ہے۔

کائے آئے ہیں؟
وہ خاموش ہو گئی۔ اس کو کیا پڑی تھی ان کے گھر کے اندرونی معاملوں میں دخل دیتی۔
"مذہب یہ کہانی کا ڈرامائی حصہ آپ کو بے بے نے سنایا ہے۔ رائی کا کیا ڈیٹا ہے میں انہیں کمال حاصل
ہے اور اب میں ڈرامے کے ڈرامے میں پروہ نہیں کمال غائب ہو گئیں۔"

وہ جواب کے لیے اس کا منتظر تھا۔
"معلوم نہیں۔ باہر کی طرف گئی تھیں۔"
"اور آپ کو پھر کاٹنا نہیں۔" وہ چلتے جاتے پھر رکے۔ کیا۔ "ایک زمت دیتی تھی۔ بے بے پتا نہیں
کہاں ہوں گی۔"

"کیا بات ہے؟" اس نے اپنی مخصوص نرم روی سے پوچھا۔
"سرجن شکر کی اور میں دونوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ حتیٰ کے پائے کی ایک پیالی بھی نہیں
پی۔ میں تو جیسے جیسے بھوک بڑھتی رہتی ہوں لیکن سرجن شکر دوست ہیں دانیال خان کے۔ اور مزاج
میں عین میں انہی پر گئے ہیں۔"

"نہیں بھولا گئی ہوں نا۔" وہ غصہ دینی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اسے دونوں کے مڑھوں سے آگاہی
نہیں مل سکتی۔
"بہت مدت شکر۔ میں سب زیادہ بے جا چل تو نہیں ہو رہا؟"

"جیس۔" کیونکہ کچھ کرنا ہی کیا ہے۔ جو آپ نے کامیابی سے کہہ دیں گی۔ پری بخشہ خان سے کہہ
دیں گی۔ اور یہ کہ۔"

"ڈاکٹر۔" وہ مجرم کر پٹ گیا۔
کتنی دیر وہ پری کی آمد کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن آخر وہ کتنی دیر بیٹھ کر انتظار کر سکتی تھی۔ اس گھر میں
جائے کون سا ایسا عقیدہ راستہ تھا کہ سب کسی دم اس راستے سے غائب ہو جاسکتے۔ راہدار یوں میں
دھوڑتی چلتی رہیں نہ سکتے۔

وہ آہستہ سے چلتی اندرونی کیلری کی طرف آئی۔ وہاں زندگی کے کچھ آثار تھے۔ کوئی شخص گرم پانی کی
پوتل لے کر دوڑ رہا تھا کسی نے ابلتا پانی تمام رکھا تھا۔ اور کسی نے روٹی کا بھل چھپے اندر کوئی آپریشن
تھیر کا تھا۔

وہ ان دونوں سے بھاگنے لگی۔ پری کو کون بنے گی۔ اگر وہ پیٹام کسی اور کے ذریعے بھیجتی تو ان کاں تھا
زبان کی تبدیلی کی وجہ سے پیٹام ہی بدل جائے۔ سرجن شکر نے کیا نہیں کیا تھا۔
روا پر کھڑی تو یہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ کون زبان صاحب راستے ہے۔ بے باخان گل؟

جو اندر جا جا کر باہر آ رہے تھے وہ اپنی زبان میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ کر دائیں سے بائیں دوڑ
جاتے۔ کتنی دیر کو روڑور میں کھڑی مالک کے کمروں کی طرف لوگوں کی روانی دیکھتی رہی۔ وہاں اگر بے بے
باہر نکلیں تو اسے ضرور تیشیل سے آگاہ کریں گی۔ لیکن وہ تو کہیں دور کہیں ہی تھیں۔ یعنی وہ اس نے
سوچا۔ نام پڑی کی پہلی اٹھائے۔ نئے والے شخص سے کچھ پوچھنا۔ اتنے وارا دے پاتی۔ ہتھیں باندھتی
"نئے والا شخص کوئی دوسری چیز تھا کہ غائب ہو جاگ۔"

خان کل باغی ذات کے طلسم میں گرفتار کھڑے تھے۔ خوش گمانیوں کی بظاہر میں ڈوب گئے۔
"شکر بہت شکر بہت بہت بہت۔" اتنی عتائیں کے سامنے الفاظ کے چمکتے دھندلے بھی خیر
ہو گئے تھے انہوں نے اس کے ہاتھ سے تمام کر بھی کتنی دیر نظر میں اس کے شہزادہ ہاتھوں پر
لگا کر رکھیں۔

اس نے بڑے مات سے حکم دیا تھا۔ بڑے جاؤ سے فرمائش کی تھی۔
لیکن اس کے تاؤ وقف سرور مردیہ نے اس کے سارے جڑوں پر اس ڈال دی تھی۔ "آپ نے
تکلیف کی آپ کو رحمت ہوئی۔" اس نے کئی فقرے ترتیب دینے کی کوشش کی۔ وہ فقرے تو اس کے
ہاتھ سے ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ رہے تھے۔
بلا شکتی سے مسکرا دی۔

"آپ معلوم نہیں آپ کے سرجن کس قسم کا شہزادہ ہیں۔ مجھے تو جو سمجھ میں آیا ہوا۔"
"ہمارے سرجن تو آپ ہی کے علاقے کے آوی ہیں۔" اس نے پلیٹ اٹھا کر ایلٹ کے سہری بن سے
لکھا یا۔

"اور میرے لیے بہترین ہا شہزادہ ہے جو آپ نے تیار کیا۔"
وہ بے ساختگی میں نور سے ہنس دی۔ "چلو اتنی منت اکارت نہیں گئی۔"
وہ بڑے خرد آٹھا کر انبال خان کے کمرے کی طرف نکل گیا۔
گھر میں اچانک خاموشی چھا گئی تھی۔ "مہر مہی کا افراتفری کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ چاک
ہی کسی کو نہ سے بے ہوشی نمودار ہو گئی تھیں۔ کچھ کچھ پر مہر مہی چال۔ اس کے نزدیک اگر انہوں
نے غیر شعوری طور پر اس کا سارا لے لیا۔
"ایک تو انبال خان کی یہ بات بہت بری ہے۔ کسی کا احسان نہیں لیتے پس زیر بار نہیں ہونا
چاہیے۔" وہ اس کے کندھوں پر اپنے ہلکے جود کے ساتھ چکھوڑ کر کہیں پھر سیدھی ہو گئیں۔
"شکر خدا کا تکلیف زیادہ نہیں ہوئی۔ کوئی ہڈی ڈھکی نہیں ہوئی۔ سوچ لئی ہے چند روز میں چلے پھرے
لیں گے۔" اس کا سارا چھوڑ کر خان کل کی تلاش میں نکل گئیں۔
"وہ کچھ خان کل کہیں سے کالے لے کرے کا ہندوستان۔" وہ ان پر سچ راستوں میں کہیں پھر گئیں۔

وہ خاموشی سے اپنی یہ جدید اپارٹ بر آئی تھی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کا یہ کوٹا اس کی ایک جنت تھا۔ جہاں
سے دنیا اس کے قدموں میں بکھری رہ گئی نظر آتی تھی۔ خوبائیں اور اخروں کے کتنے جنگلوں اور
سائنس کے نئے نئے پھولوں سے ڈھکا یہ مہکا ہوا قدرتی قمارہ کل اس عمارت میں ایک خوفناک باب رہا
ہوئے ہوئے نہ گیا۔ ورنہ حالت مختلف بھی ہو سکتے تھے۔ اسے یہ جگہ چھوٹی تھی۔ اور اس جگہ میں کچھ
عجیب و غریب مقناطیہ ست تھیں۔ کوئی کھرا طلسم تھا جو اس کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اپنا سیر کرنا تھا وہ اس
علاقے کے سمجھیں گے اگر شاید آسانی سے یہاں سے نکل نہیں سکتی تھی۔
کھڑکی سے سر نکال کر اس نے حد تک جھانک کر اگاہوں کا جائزہ لیا۔ خوبائیں کے جنگل میں تیز تیز قدم اٹھا کر
دوڑتے تھے خان کا۔ آسمان پر دھل کر کھڑے بادلوں کا نور آندوم چست کھوڑاں کا۔

74

پری اس کے لیے چائے ہالائی تھی۔ وہ سائینڈ ٹیبل پر میٹ پر کپ وھری ابھی تک اس سے شرابی
شرابی تھی۔ پری بھی ان ہی خوب صورت نظاروں کا حصہ تھی۔ یہ سب سے اڑے ہوئے خوف زدہ چہرے
اس کا اپنے اوپر سے اعتبار اٹھا رہے تھے وہ ظالم نہیں پر قدرت کے مغلوں نے اسے آقاؤں کا ایک
حصہ سمجھ لیا تھا۔ وہ پری کو دیکھ کر حقیقت سے مسکرا دی۔ گھری ہوئی بے ریا مسکراہٹ، دو سنی کی طرف
ایک قدم۔ لیکن اس کو مسکرانے کا اذان نہیں تھا شاید اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چکی ہو اس نے
دانتوں میں چل کر توڑ ڈالی۔

"بہت بہت شکر بہت بہت۔" اس نے چائے کا با سا گونڈ حلق میں اتار دیا۔ "آپ ہمارے مالک کیسے
ہیں پری؟" اس نے اس کو پوچھ کھولنے کے لیے سوال بڑا تھا شاید اسی طرح ان لوگوں کے دل میں اس کا
خوف کچھ کم ہو۔

"بہا بیاتہ ہیں اب اتھتے ہیں۔"
بیلا مسکرا دی، بیلا نا تلا جواب تھا گیارہ بارہ سال کی اتنی ہی کم عمر لڑکی کے اس سیاست دانی جواب پر وہ
ہنس دی۔ لیکن وہ اس کے سامنے اسی طرح کھڑی تھی سوب اور خاموش اس نے پھٹی مسکری اس کے
سامنے رکھتے ہوئے وہ سر پر کری خود سنبھال لیا۔

"بہت جلد پری۔" وہ ہنسنے لگی لیکن کالین پر۔
"یہ بتاؤ ہر وادی میں کھولے کیوں نکالے جا رہے ہیں؟ کیا یہاں گھروں میں ہوتی ہے۔"
"مالک لوگ سواری پر جا رہے ہیں۔" بیلا نے بتایا تھا۔
"لیکن پری مالک گھوڑے پر تو نہیں بیٹھ سکتے۔"
"خان کل کی اور میاں ڈالنا صاحب جان سے گئے۔ آپ کی بیالی خالی ہو گئی۔"
"نہیں۔" وہ جان بوجھ کر بیالی اور سوری پھوڑ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔
"تمہارے علاقے کے گھوڑے بہت خوب صورت ہیں۔"
"ہاں جی۔" اس نے توفیق سے کہا۔
"اور لوگ بھی؟"
"ہاں جی۔"

اس نے دور تک چھپے سبز زاروں میں خوبائیں اور باداموں کے درختوں کے اندر اندر کسی شخص کو
دوست دیکھا وہ بہت عجیب آدمی تھا۔ اس نے حیرت سے سوچا۔ وہ ہمیشہ انہی سبز زاروں میں منڈا آ رہا تھا
تھا۔ لیکن اس کو اجازت نہیں دیا کہ وہ یہاں کوئی جھوٹی مولی تفریح سنا سکے۔ شاید خوبائیں کے بارگ کے
اس طرف کسی دوسرے مردار کی زمین شروع ہوتی ہو۔
"یہ آدمی کہاں جا رہا ہے پری؟" اس نے بر سیکل تنہا کر پوچھا تھا پری مودوب اٹھ کر آئی۔ بیلا کے
کانہ سے پیچھے سے اچک کر جھانکا اور ایک دم پیچھے ہوئی۔
"اگن سا آدمی ہے۔" بیلا کو احساس ہوا وہ کم عمر بوسے کے باوجود بےوقوف نہیں تھی۔
"اچھی تو تم نے دیکھا ہے اس شخص کو۔ بری بات پری، سہانوں کے ساتھ جھوٹ بولنے سے گناہ ہوتا
ہے۔" پری کا منہ رنگا گیا۔ کچھ بھی ہو وہ اس عمر میں گناہ دار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

75

"نوع" الفاظ اس کے حلق میں جھپٹے اس نے تھوکر نکالا۔
 "وہ بڑی خطرناک جگہ ہے وہاں جیتے ہیں۔" کوم خور چیتے سو ہماری جان کو کے چیتے ہیں ہم نے پالے ہیں۔ بڑے خوشخوار ہیں وہاں پانا پرایا کچھ نہیں دیکھتے۔"

"سب جانتے ہیں جی۔"
 "تو وہ وہاں کیوں جا رہا ہے پری۔ چیتے اس کو نہیں کھاتے۔"
 "اس کو نہیں کھاتے جی۔" وہ اس کی ہنسی آخر "وہ تو ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ان کو کھالا ہے۔"

"اے وی تو میرا بابا ہے جی۔ سو بتاتا ہے چیتا بڑا ظالم و رند ہے۔ وہ بھوکا ہوتا ہے سامنے بڑے سے بڑے درندے کو بچے بھاڑ دیتا ہے۔" تویت خان ہی پری کا بابا ہے۔ اس نے چائے ایک گھونٹ میں خالی کر دی۔

پری خالی ہال لے کر شکر کا کٹر برہتی نکلی۔ وہ خاموشی سے پھر باہر بھاگنے لگی۔ قیمت خان دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے پھنڈ میں کہیں نظر ہوں سے غائب ہو گیا تھا۔ جہاں تک اس اوچی جگہ سے وادی اور آبادی نظر آ رہی تھی جیسے چیتوں کا کھانے کا کچہ پتا نہیں چل رہا تھا۔ "ناگرا" سناتی اقدام کے تحت درندوں کو کہتی تھی۔ یہاں دور رسایا گیا تھا۔ لیکن رات میں تو اس کی کھلا پیٹوڑا جاتا ہے اور کیا سلوم جوڑ رات کو شلے شلے اس کو کڑی تک آجاتے ہیں اس سے بھر بھری آگنی ہے۔ اسی لیے سب بے کی ہدایت ہیں کہ کڑی کے دروازے رات تک اچھی طرح قفل ہونے چاہئیں۔

اس نے ایک نظر کڑی سے باہر بھاٹا۔ بڑے بڑے درختوں پر سفید چاق وچند گھوڑے مالک کے اشارے کے منتظر تھے۔ خان کئی گھوڑے پچا تھی۔ ساتھ میں دو مراغھس سرخ رنگارنگی ہو سکتے تھے۔ وہ خوش باش شے مسکراتے لوگ تھے۔ انہیں زندگی سے لطف اٹھاتا تھا۔ کیونکہ زندگی نے ان کو کوئی خاص دھنگ نہیں پہنچایا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے انہوں نے گھوڑوں کو ایزنگائی اور چاول کی مسکور کن آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوئی تھیں۔ قیمت خان کی طرح وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ حالانکہ جب تک وہ نظر آتے رہے وہ ان کی ساری خوشی ساری زندگی یہاں سے محسوس کرتی رہی تھی۔ کتنی شدت سے اس کا جی چاہا وہ بھی ان کے ساتھ گھوڑا دوڑاتی بھاگے۔ لیکن انہوں نے اس کے اب ناگھ نہیں تھا وہ یہاں صرف ملازم ہی تو تھی اور ابھی اس نے رات بنگ میں سمارت بھی کہاں حاصل کی تھی۔ ابھی تو کھوٹے پر بیٹھے (جس کو جاکلی ماسٹر منٹ بولتے تھے) اور ایزنگائی کے در پر تھی کہ سارے سبق اوجھلے رہ گئے۔

یہ بھی قیمت، وہ اکہ مریم کو بھیج کر بے نے اسے بلوالیا وہ بار بار باغی کی طرف دوڑ جاتی تھی۔ حالانکہ اب تو باغی بھی اس کا اپنا نہیں رہا تھا اور حال بھی کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ کھوٹے نہ جیتے۔

"تو پریشان ہو؟"
 "بھئی اوقات بے بے کے علم نجوم پر ہر سال ہوجاتی تھی۔ وہ اون سلاخیوں میں ابھی مختلف نمونوں

کے بار بار خانے گھنٹیں بار بار بھولتیں وہ غلطی کی طرف ٹکا کیے بغیر تیری طرح اس کے دل میں اتر جاتی تھیں۔

"تمہیں تو اس نے خجاست کہا۔
 انہوں نے تھوڑی دیر کام روک کر بڑے غور سے اس کی شکل دیکھی۔ پھر اٹے گھروں پر چلے گئے۔
 "تم حرام تو نہیں کر رہی تھیں۔ میں نے سوئی ڈالیا۔ میں نے کہا تم کہیں گھبرائے رہی ہو۔"
 "آرام ہی ہے ہر وقت۔" بے بے یہاں کا بھی کوئی سا ہے۔"

"سر جی، ڈار شتی کی تعریف کر رہے تھے تو ان گل نے بنایا یہ دشمنانے تیار کیا ہے وہ غالباً کوئی ملوہ یا کوئی ایسی ہی چیز تھی۔" وہ جانتی تھی ناشتے میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی لیکن خان گل نے اپنی منونیت میں مسلمان کو بھی شامل کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

"ہاں مجھے یاد آیا۔" بے بے چونکی۔ "وہ سوچی کے حلوے کی تعریف کر رہے تھے۔ پھر انیال خان نے بھی ان کی اجازت سے ایک کھانچے کھائے تھے۔" اس کا منہ رنگا گیا۔
 "سب لوگ مدت مصروف تھے۔ میں نے سوچا۔" اس نے شرمیلی سے کہا۔

"اچھا کیاں مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا تمہیں پکائے کا شوق ہے۔ تمہارا دل چاہے تو باورچی خانے میں جا کر کھالیا کر۔ میں خستہ خان کو سمجھا دوں گی۔" کونہ باورچی خانے میں کچا کی اور اعلت پسند نہیں کر سکتے۔ لیکن کچا ہرے تمہاری بات اور ہے۔" خستہ خان کو وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ بلکہ سے مسکرا دی۔
 "گھنٹوں پر زور دے کر اٹھائیں۔" کور سلائی ایک طرف بیٹھی۔ "اکہ تمہیں باورچی خانے لے چلوں۔"
 وہ معمول کی طرح ان کے پیچھے چل دی۔ اس کو ان کے احوال کی مسلسل بجا آوری کی عادت تھی۔

"کبھی کبھی باورچی خانے میں اچانک چلے جانا چاہیے۔" انہوں نے اس کو گری بات بتائی۔ "سب ہی باورچی خانہ صاف بھر رہا ہے۔"

خستہ خان کا دھو گارٹھے کے برتنوں کی صفائی میں تھا۔ وہاں تھا۔ خود خستہ خان جو لمبے بر کسی اہم کھانے کی تیاری میں مصروف لگتے تھے۔ بے نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ کھانے کو سٹک میں بھاٹکا۔ پھر وہ کتنی دیر خستہ خان سے مذاکرات کرتی رہیں۔ نمک مرچ ہلدی کی تفصیل، ڈانیال خان کی خاص خود اک اور یہ کہ یہ بھلا ہے۔ اس کا جب جی چاہے باورچی خانے میں آ سکتی ہے۔
 وہ ساری زبان بھینچتی تو نہیں تھی لیکن اس کے سوا بے نے زور کہا بھی کیا ہو گا۔
 خستہ خان اور بے بے ایک ساتھ بیڑا لے گئے۔

وہ ریاست باورچی خانہ کے زوال پر اور یہ ڈانیال خان کی خدمت دی۔
 "جانتی ہوں میں جو مرضی پکوا کر بھیج دوں۔ کھائیں گے وہی جوان کائی چاہے۔" یہ ہلدی کیا کھانہ رہی ہے پری کا کیا کھانہ؟"

انہوں نے بڑبڑا کر غالباً "ڈانیال خان کے کبھی کے کے الفاظ دہرائے ہوں۔
 "دیکھ کر کھانے پر باورچی خانہ خوب بارون تھا۔ اس نے اجازت ملنے کی خوشی میں پرمایہ دن جشن

منہ سے گزرا۔ جس کا جی چاہا تھا، اُکا کر کھلایا، کو اس کو پکانے کے معاملات میں اپنی دلچسپی نہ تھی۔ کی اس کو اپنے لیے تہہ امتیاز بنالے زندگی کے سارے خوش گوار لمحوں باورچی خانے کی ہڈر کو اپنے اچھی اس کا مورقہ جی کھل آتا تھا، اچھی تو کابوں سے سر مشعل اٹھاتا تھا کہ سنگ دار کی شروں ہوئی۔ اِن سبھی کبھی خوشی کے موقعوں پر وہ خوشی کے ساتھ جمل کہہ دیتی، خانے کا حسن، ایسا بیٹ کھلتی تھی۔

آج ایک ایسا ہی دن تھا۔ گارنچ کاؤڈلی کی بن اندول کے خولوں سے ہجر کی سنگ میں جھج کھانے پھولی پلٹ ہواؤں کی بڑی پلٹ چھوٹو بنگا ہر قسم کے برتنوں کا ڈھیر لگ گیا۔

[illegible]

ہے۔ اپنے نے چھٹی سے چالی کا دروازہ کھولا۔
 "ہو جا یہ خستہ خان اس کو جواز کر بھیج دیتے ہیں۔ معلوم نہیں کھانے میں کس طرح ہو رہا ہے۔"
 وہ میرا قصور ہے۔ میرے نے بھولائی ہے۔ کہا۔ "میں کچھ بچال کھانے ٹرائی کر رہی تھی۔"
 "ہاں" ہے۔ نے نے سنا ہے اسے کھانا لایا۔ "جب تک چوہہ مقررہ دانی ہو۔"
 ہے۔ کا ٹھکانہ اس پر اس دعا کی قبولیت کی کمرانی میں اس نے نہ چاہے ہوئے کبھی سمجھی ہے۔
 اس کو گھڑی تھی۔ وہ کسی بیکاری یا دوش غریزہ ہو جائیں۔ حالانکہ اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس کے
 خوش دلی سے کام کرتے باہر انہوں نے قابل است پر نے دیکھے اور اپنے آپ کو شینائی لیا۔
 "اے ہاں کیا میں نے خستہ خان سے کہا تھا کہ کبھی یہاں ہی کھانا کھائیں گے۔ ہمارے ساتھ۔
 وہ قابض دعا سے یہاں سے سوال کر رہی تھیں۔

”مجھے اور تمہیں بے بنیاد کیا ہو۔“
 ”اے خدا! ان کی بیعت بھی بگاڑ دینا۔ سارے کوئی بے بنیاد نہ ہو۔“
 ”اے خدا! ان کی بیعت بھی بگاڑ دینا۔ سارے کوئی بے بنیاد نہ ہو۔“

پھر کبھی اس نے خاموشی سے ان کا سینہ ان کی پلینٹ اور نہ یکن سما دیا۔
 بے چارے اہل بیت کے کوئے گھر گھر کی بزرگ خاتون کی طرح کھینچ کر بچوں کا انتظار کرنے لگیں۔ ہوش
 جاکسا اور کلاس لے جاتی پھر ہر سنی کھڑے کمرے کے باہر ایک مردان سچا سچا اہل طوائف کا کائنات ازل و کلا کے

کو شش ہی کر رہی تھی کہ بے بے نے جیسے کان لٹکا کر سنا۔

”اودخان گل آگئے، خستہ خانہ سے کہو روئی شہر آ کرے۔“

اس نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا وہ لوگ چڑے کے فلارٹ اور چڑے کی جھیکڑوں میں اپنی اندر آگے ہتھکڑی کے سہارے غرے لوٹ کر آئے تھے اس لیے گھڑبواہری کے لباس میں ہی دینا بتاتے پھر وہ سہ تھکے

”پانی ٹھنڈا اور میٹھا۔ بے بے۔“ میر جن شاد پرورش سے گلاس لے کر سارا پانی پیٹنے لگے۔

”اؤ، مہربان تو کہ میں جس نکلاتی ہوں۔ بے باتی رہ گئیں۔۔۔ لوگ تلاش پر گھاس چڑھا کر مار رہے ہیں۔“

”واکرم صاحب۔“ خان غم نے کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کھڑی بیڑا کو ایک نظر دیکھا۔ ”آپ کا بیڑا سے تعارف ہے؟“

والکفر صاحب ہے لہذا وہ روک کر ایک نظر اس کی طرف نہ کیا۔ "غائبانہ توجہ"

”آپ نے خود کھرا دیا تھا نا شے۔“

۱۰۔ جینتھ کر فیس دی۔ ہاتھ کا انچھا مذاق بناتا تھا، بے بے نہ پیار سے اس کی خجالت مٹائی۔

”اور تمہیں پتا ہے یہ کھانا بھی جیلا کا بنایا ہوا ہے۔ کھاؤ گے تو تانے کی کھول جاؤ گے۔“

۱۰ "تب تو مجھے نوری طور پر کھاتے پر پہنچنا چاہیے۔"

وہ واقعی چند ہی منٹ میں کپڑے بدل کر واپس آ گئے۔ خان گل بھوک کی بے چینی میں ساری رات کبھی سبزی جیٹ کر گئے تھے۔ آج صبح کبھی کبھار کھانا کھا کر آتے تھے۔

ہوئے اس کے کرسی پر بیٹھ جانے کے انتظار میں کچھ دیر کھڑے اور اس کے بدلنے پر اور اڑھائی گھنٹے

”لاؤ بھئی بسم اللہ۔“ مہسول نے آستینیں چڑھ کر غمیں دلو کوئی میں غالباً ”ان کو کمال حاصل ہے جیلانے جھینب کر سوجھا ایتا کہ ان کا کلک جھٹکے کہ جس کے کھانا پانی کے لئے گھر سے تیار ہے۔“

یہ سب سرسوجا مانا گیا۔ ایسی ہیڈلین پختون روزنامہ کی خاطر بدارت کے لیے کرہی آئی تھی۔ لیکن یہاں نے سوجا۔ معلوم نہیں وہ ان کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتا۔ سوہوڑوں ہاتھ بھرا دھاڑوں کے گیسٹ

رہے تھے اور زمین آسمان کے فاصلے طائر ہے تھے۔
 آنکھیں مٹ کر ہمت افزا کا رستہ قلعہ بند تھیں

اس نے بوجھ اپنے منائے کی طرف سے دوسرے چٹکشی کے طور پر یہ آئیٹم رکھے تھے لیکن وہ ایک

اسے امید نہیں تھی سب بے وقوفی سے مسکراتی فخر سے اس کی طرف دیکھتیں جیسے دیکھو یہ کارنامہ۔

وہاں محفل میں خوش بھی تھی لیکن خوفِ زہر بھی۔

مرکز بنیاد کی بنیاد ہوتی طبیعت سے خائف ہوگئے تھے وہی دیر ہونے کے بعد اس کے ماضی کی طرف

جیسے ہیں اور اللہ وہ سوال کر کرے اس کی خیریت جیسے سے بالکل ہی اچانک کر دیتے۔ لیکن شکر ہو
ست زیادہ بولنے کے باوجود انہوں نے اسے نشانہ مشق نہیں بنایا۔ وہ خان گل، پکا اوقار ہوتا ہے، اس کی

شواہد ملتے رہے۔

”ہمت بہت شکر یہ خاتون۔“ انہوں نے فہم کنی سے ہاتھ پونچھ کر اٹھتے ہوئے کہا ”بچپن کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں جب میں اسامیہ پارک کی گلیوں میں تھکے پاؤں لگا کر اٹھا ایک ہاتھ میں تختی دوسرے میں دستہ اور اپنی خوش رہیں۔ کوڑا اس تھلائی کو پونچھیں۔ وہ تو اکیلا بیٹھا بیٹھ کر رہا ہوا۔“
ڈاکٹر صاحب کے عاقب میں خان گل اٹھ بے بے پشت پر پڑے تو لیٹے ہاتھ رگڑے۔

”تھک رہی تھی آئی ہوں۔“
مرکزی کی دو دو حیا روختی میں مکتے ہوئے قیدی رتوں میں وہ ایک غیر محنت سی بیٹھی رہ گئی۔
ابھی وہ بالیاں سمیٹ رہی تھی۔ گھر کے آگے اور ضروری رکن کی طرح وارد واصل کر رہی تھی کہ دیکھتے دیکھتے وہ اکیلی رہ گئی۔ پردہ شہ کیوٹ خان رتن سمیٹے آئے تو وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔
واہ وا کہنے ڈاکٹر صاحب بے پناہ عزت دیتے خان گل اور گھر کرنے والی بی بی۔

باری باری سب سی اٹھ کر بیٹے تھے۔ اور وہ تھک رہی تھی۔
سبے شک اسے اپنی تھکنوں سے کھوٹا کر کے کاؤس لینا تھا۔
اور یوں بھی وہ ان میں سے ایک تو نہیں تھی۔ ان کا حصہ تو نہیں تھی۔
وہ خاموشی سے کام میں مصروف ہو گئی۔

اس کے کام کے اوقات تو ضرور میں تھے۔ سب نگاروں سے گہرا ماتی و کام کی طرف آجاتی۔ کام سے
تک پڑے لگتی تو چہرے سے ہمدردی کے آنے والے پانی میں پڑیں ڈال کر بھیجی رہتی۔ اس کے سوا کوئی بھی
مصرفیت ہی کیا تھی۔

وہ شام کی چائے میں شاؤن نہیں تھی کیونکہ وہ دو بار کوڑا ہرنگ میں مصروف تھی۔ اس نے کتنے فریم
بدلتے کتنے کھوسے رکائیں۔ نگارے جمائے۔ لیکن وہ دو بار اس رخ بھی کہ کھڑکی سے سورج کی روشنی
براہ راست دو بار چمک پیدا کرتی تھی۔ اس نے اسٹور میں ایک ریلیف ورک دیکھا تھا۔ ریلیف ورک
چونکہ اسپاٹ نہیں ہوتا اس لیے امکان ہے کہ روشنی اس جگہ سے منعکس ہو کر وہ جگہ نہیں پیدا ہونے
دے گی۔

چائیاں اس کو یاد آیا چائیاں تو اس نے بے لگے کو اسٹور کی تلاش کے بعد فوراً ”واہ واں“ کر دی تھیں۔ اور
اس وقت جب وہ شام کی چائے کی معذرت کر چکی ہے اور رات کا کھانا سوہونے میں کچھ منٹ باقی ہیں وہ
بے کاساس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور یوں بھی ہوم ورک مکمل ہو چکا تھا۔ اب جب تھمتا تا سورج نکلے
جگہ جب وہ ریلیف ورک کا شاہکار سمن اٹھا کر صحیح صورت حال سمجھ سکے گی۔ اس نے سارا کام سمیٹ
کر کونے میں جمع کر دیا۔ ”واہ واں“ کا یہ حصہ یا کشوں اور تپ کے بعد صبح ہی کو پالیہ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ
تھک جاتی تو اس کے ہڈی گار سکون کا ساس لیتے۔ انہیں تو کچھ اور نہیں کرنا پڑا تھا سوائے ”کپڑا نا“ اور
”رکھنا“ کے۔ وہ مسلسل ایک ہی آواز دینے والے کام سے گھبرا جاتے۔

وہ گھبراہٹ نہیں تھی۔ وہ بڑول بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ محفل سے کھٹا چاہتی تھی۔ شام کی
چائے پر اور پھر رات کے کھانے پر ایک محفل تھے گی۔ لوگ اس کو براہی کے درجے پر لا کر بھی گویا اس پر
رحم کھاتے تھے۔ وہ ان کے برابر تھی نہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ سب انسانوں کے برابر ہونے کے کہانی

قلعے کا مہر بھر چار کرتی آئی تھی۔

اس سے قبل کہ رات کے کھانے پر بلایا جا اس نے پری کو کھانا بھیجا تھا۔
”بے بے سے کہہ دینا میرے سر میں شہر در درو جے میں کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ میں جلدی سوؤں
گی۔“

پری چند قدم دور نکل گئی تو اسے خیال آیا اس نے اپنے پاؤں پر آپ کھڑکی ماری تھی۔ سرور کا حل
ن کر سرجن غار وضو آگے کے حالانکہ وہ ایسے احباب سے ہی تو محبت رہی تھی۔
لیکن یہ اس کی خوش قسمتی ہی ثابت ہوئی۔ پری کھینچی پری سرور کی گلیوں کے سوا کچھ بھی نہیں لائی۔
یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ وہ مایوس نہیں ہوئی۔ وہ لوگوں سے غلط تو قحط قائم کرنے کے
کامیاب کھس سے نکل آئی تھی۔

جب وہ ان جسی نہیں تھی تو ان کے درمیان ایک آؤٹ سائز کی حیثیت سے محفل کو بد مزہ کرنے
سے حاصل۔ اس نے ہسٹریٹ کر خاموشی سے اپنی کتاب اٹھالی۔ یہ کتاب مریم نے کہیں سے حاصل کی
تھی۔ اور اس کو کھنے میں ہمیشہ کے لیے بخش دی تھی۔ یہ کسی عورت کا کھانا ہوا کچا سا روٹا ہوا ناول تھا وہ عام
زندگی میں ایسی کتابوں کو سانب پھوٹوں کی طرح کھانا پنی۔ جتنی تھی لیکن اب جب سے یہ کتاب اس کے
ہاتھ لگی تھی وہ روزانہ اس کے چند کتبے پڑھ کر سوتی تھی۔ باقاعدہ پڑھنے کی قوت تو اب تک آئی نہیں ہاں
ان آنکھوں کو اس مشکل کی جو عمر بھر کی عاقبت تھی اس کی تسکین ہو جاتی۔ نیند بھی سہولت سے آجاتی۔
ہاں البتہ صبح کا ناشادہ کوئل نہیں کر سکتی تھی۔ بے بے نہاتے پر اس کی ایسے عادی ہو گئی تھیں جیسے لوگ
صبح کے اخبار کے۔

وہ معمول سے لیٹ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کھانے کا کمرہ سونا ہوا تھا۔
وہ تیزی میں لیٹ کر بے بے کے کمرے میں آگئی۔ بے بے آتش دان کے سامنے ماضی میں گم اپنے
پسینہ بوز سے چومیں۔

”تم کچھ ٹھیک ہوئی ہو۔ تم نے تو مجھے ریشہ ہی کر دیا۔ کسی ہوا بے۔“
”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی ”یوں ہی سرور تھا۔“

”میں تو سوچتی رہی۔ کیا کوئل تمہارے پاس آؤں۔ پھر میں نے سوچا تم تک ہوگی۔ سرجن تو تھے
نہیں۔ میرے پر میں ان کی گولیاں پڑا تیں۔“

”سرجن کہاں گئے؟“
”وہ تو جیل گئے۔“

وہ اپنی بدگمانی پر شرمسار ناشے میں گسں ہو گئی۔

”اب پڑا کھالیں گی؟“ وہ روز کی طرح ان کی خاطر دراز رات پر کمر کس کے چلی۔
”ہاں کیونکہ میں نے بھی رات کا کھانا نہیں کھایا۔ تمہاری کھانا؟“

واقعی ہم بھی کبھی نزاد کی کی حد کو سمیٹے ہیں۔ اپنی ذات کے بارے میں ہماری اتنی بدگمانیاں لوگوں کو اتنا
تھکانے پہنچاتی ہیں۔ اس نے فرض دروازے سر کو ہلکے سے جھوا۔ اگر وہ اسے اہتمام سے جھوٹ نہ پونچتی
تو بہت سی کوہنٹ سے بچ جاتی۔

ہمتی ان سے ہٹو کر پکڑا لی۔
 وہ جب گڑھی آئی تھی اس کی بھرک خوب کھل گئی تھی۔ سورت و ایک مدت سے اسے نام نہان
 تھی۔ شاید یہ گڑھی کا احوال تھا۔ وہاں کی خوراک بھی یاد دلوں کے سفر کی یاد دلائی کا اثر کہ وہ کھاتی بھی
 خوب تھی۔ بھاتی روٹی بھی خوب اور دل کی بھرک مشقت کے بعد وہ رنجی نہ تھی۔ سورت نازک جین کی
 پلاٹ پر بھی وہ بے کے لیے قصبے منتقلی اور کھانسی کی باتیں کیے بڑے شہروں کے
 قصبے۔

پھر وہ رات کے کھانے کے بعد بلکی سی چل قدمی کرتی پہلے وہ مریم کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے گلی میں لپٹی کے رخ دو تین چکر لگاتی تھیں۔ اس پہلا ایک نوید چپن کی باتیں مثنویا کرتی تھیں پھر آہستہ آہستہ پورے کریمس۔ بیان کو سر میں شمار کا مشورہ تھا۔ ورنہ اس کا نہ تھا کہ ان کے لٹھے بالکل ہی ناگوار ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر پندرہ کا وقت آجاتا۔

اور صبح سے محلات پھر اسی طرح شروع ہو جاتے تھے جی کہ عین چاروں پہلے ہونے والے حاروش کے مشاعرے اترتے رفتہ رفتہ انہوں کے ذہن سے زائل ہو جاتے۔ وہ بھی مکمل طور پر بھلا نہیں جانتی تھی لیکن ایک تو کلامی مصروفیت اس پر داخل خان بالکل ہی کمرے میں بند لوگوں پر مضامینات مرتب کر رہے تھے۔ یہی کبھی ان کے احکامات کسی کی زبان یا ہر آتے یا پھر ان کے پندرہ منٹ کے لیے بے پناہ ان کے کمرے میں

شاہد سوا دیوال خان باپ سے میر متعلقی سے شخص تھے اور وہ غالباً ۱۶۷۵ء کے عوامی زندگی میں عدم
مطابقت کی پالیسی پر یقین رکھتے تھے۔ اس نظریے نے انہیں خود رسالہ لپیڈ بنا دیا، جو نسبتاً آزادی
محسوس کرنے کی تھی۔ اس کو بے پایاں کام ملا۔
ان کا حکم تھا کہ وہ جو کہنے بدل کرتے رہی کر کے آؤ۔

ایسا عالمی حکم ان کی طرف سے پہلے تو کبھی نہیں آیا تھا وہ بیغام لانے والے سے کیل کرید کر بھی کسی نتیجے میں پہنچ سکی کہ وہ اس کے گھر ضرور رہے۔ کوئی ایسے واقعہ گزری میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس کے گھر کے سامنے اس کی عزت افزائی چاہتی ہوں۔ وہ عداوتوں۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل کر لیے۔ جو گڑے بجائے سینفل پین لے۔ ہاؤس میں خوب برش کیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بھیکے۔ وہ کتنی دیر یہ فیصلہ نہ کر پائی کہ اسے اور کیا بات کر کرنی چاہیے۔ چیو لری کی اس عداوت نہیں تھی۔ ہاں آپس میں کاتول میں جو ہر وقت پڑے رہتے۔ میک اپ کاتول اسے شوق تھا۔ اس نے ضرورت سے زیادہ کوئی مسلمان کہا۔

ہے بے کس پہنچی و انہوں نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا کہ اس کی صحت مند شفاف جلد کسی آرائش کی محتاج نہیں تھی۔ کپڑے بھی اس کے ساتھ تھے لیکن پنجاب سے آئے تھے اس کی اوپر سے نیچے تک پوری تبدیلی لیکن تو مصطفیٰ نگاہوں سے وہ دیکھ کر کہلا گئی۔

”کیا بات ہے بے بے؟ تب نے ملنا تھا؟“

”ہاں۔“ انہوں نے انگ کے شعلوں سے نزدیک ہوتے ہوئے کہا۔ ”وہ انیال خاکن نے پیغام بھیجا ہے وہ چاہے ہمارے ساتھ نہیں گئے۔“

”ہمارے ساتھ... میلپ“ وہ تھوڑا سا گھبراہٹ سے۔

”میرے اور تمہارے ساتھ اور گھر میں ہے ہی کون؟“

”میں! اٹنگ۔ ہال چیک کر لوں۔“ وہ گویا مستحضر سے اپنی ڈیوٹی پر پہنچی۔

”اگر ہوا۔“ انہوں نے اس کو تیزی میں اٹھ جانے سے روکا۔

”وہ شام کی چائے ہمیشہ اسٹڈی میں پیتے ہیں۔“

وہ ترکیب کی تھی۔ وہ بھی ان کے سروں کی طرف نہیں لگی تھی۔ ایک ان اٹھائی سے اس نے ان کا آفس
 کیا۔ کیا تھا جس اور اس بات کو بھی ایک وقت گزر گیا تھا۔ یہ سادہ خوف زدہ لڑکے کو ہوا کر کے یہ جیو ہند
 لڑکے اور ترکیب پر پیش کی۔ وہ کسی سے ڈرتا نہیں چاہتی تھی۔ اس کو مرعوب ہونا یہ نہ نہیں تھا لیکن اپنے لڑکے
 کے اس ڈر پر خواہ اس کا اختیار بھی نہیں رہتا تھا۔

”تم لوگوں سے اعتقاد وہ بات کرنا جیسے تم کرتی ہو۔“ انہوں نے اس کے خوف زدہ چہرے پر ایک لمبائی کی نظر ڈالی۔

”جب انہوں نے مجھ سے کہا وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں تو میں نے شکر کیا، تمہارا ان سے ابھی تکساقاعدہ
 ارف بھی نہیں ہوا۔ اس دن بھی وہ جلدی میں تھے۔ لیکن تو میں نے کہا تقاضا ہو کہو کہ اتنا شاید وہ تم سے

گھر کی ارب پتی کے سلسلے میں کوئی بات کریں۔ پہلی ملاقات ہی اصل انٹرویو ہوتی ہے۔
وہ ان کی بدایت کے بموجب تیار ہو کر تو آئی ہی نہیں تھی۔ ایک نظر اس نے خود کو جھک کر دیکھا۔ اچھا
ہوا وہ کسی غلط فہمی میں نیک اپ وہ نہیں کر کے آئی۔ وہ ان کے سامنے کسی اور جیسی سے لگتی لپ اسٹک
اور ہلنس کے ساتھ حالانکہ وہ گریس اور مٹی میں اچھی طرح لتھراا سے دیکھتی ہی چکے تھے۔
”وہ چائے کتنے بجے پیتے ہیں؟“

”انہوں نے پوچھنے بلایا ہے۔“ انہوں نے معقول اور مختصر جواب دیا۔ بے ساختگی میں اس کی نظر
دو بار پر گئے۔ شہری ٹاکس پر پڑی۔ اس کا مطلب تھا اس کے پاس ایک گلاس پانی پینے کا بھی وقت نہیں۔
انہوں نے اپنی ملائیاں سیٹ کر ان کے گولے لکڑی کے فریم والے ہیلے میں ڈالے۔ یہ ہیلے اب بے
کا ایک لازمی جزو تھوہ خاموشی سے ان کے ہیلے پر بیٹھ کر آئی تھی۔ عورتوں کو دیکھتی رہی۔ نکلنے سے
پہلے انہوں نے کسی کو آواز دے کر کوئی چیز منگوائی۔ پہلا جتنی دیر منتظر رہی۔ لیکن مریم علی تو ان کی گرم چادر
تھے ساتھ انہوں نے وقار سے اپنے کندھوں پر ڈالی اور اس کے ساتھ چلنے لگیں۔ ”نالبا“ بے بے دانیال
سے ملاقات کے وقت خود بھی بہت محتاط ہوئی ہیں اور دوسروں سے بھی یہی توقع کرتی ہیں۔ راہداری بار
کر کے ان کی رفتار تیز ہو گئی یا پہلا کے قدم سے پرانے لگے۔ ان کے آگے کے تین بچے تیز قدم سے بڑھ رہے
اترے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ اوپر کی طرف چڑھ رہی تھی۔ ان کی بے پناہ شخصیت کے سر سے محسوس ہو گئی تھی۔
ان کے گمان میں وہ ان سے مرعوب ہو رہی تھی۔ ان کی بے پناہ شخصیت کے سر سے محسوس ہو گئی تھی۔

”آگے“ انہوں نے وہ قدم پیچے جاتے رک کر کہا۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے ان کے اگستے قدموں
کے تقاب میں آتی پھر وہ سوا۔ بیڑیوں کے مرکز میں بچے کالین براس کا پاؤں کتنی مرتبہ اسے لگا رہا
جائے گا۔
آگے آگے جا کر بے پناہ تقدیر کی طرح بند دروازے پر دستک دی اور غالباً ”جواب کا انتظار کیے بغیر
بہنڈل نیچے کر کے داخل ہو گئیں۔
اور وہ ان کی ہمرانی میں ان کے پیچھے پیچھے۔
کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے محسوس ہوا وہ نوادرات اور عجائبات کی دنیا میں داخل ہو گئیں۔
سارا کمرہ لکڑی کے پینل ورک سے مزین تھا۔ نوادراتوں کے شو کیس میں جہان بھر کی قیمتی اور منفرد چیزیں سجی
ہوئی تھیں۔
لے بھر میں اسے احساس ہوا وہ نہایت حساس پسند رکھنے والے شخص کے کمرے میں داخل ہو گئی

”آج کل انیال خان۔“ بے بے لک کر ایک کونے کی طرف چلیں۔
آتش ان میں لکڑیوں کی دھکنی آگ کے سامنے وہ آرام کر رہی۔ دروازہ کھلی باؤں کبل میں پھیلتے آگ
پر نظر نہیں جمائے تھے۔ ان کی آنکھیں کچھ سوچتی کچھ مسئلے میں غرق لگ رہی تھیں۔ وہ اپنے پیچھے کھلے
دروازے کو بند کر کے جیسے انہی عجائبات کا ایک حصہ بن گئی۔ خوب صورت اور قیمتی لیکن جلد۔
انہوں نے نالبا ”دروازہ کھلنے کی کمانڈر آگے کی چاپ سنی ہی نہیں۔“

یا آگے والے ان کی نظر میں اتنے اہم نہیں تھے کہ وہ اپنے بلند خیالوں سے پلٹ کر ان پر نظر کر
سکیں۔ وہ اس محبت سے آگ پر نظر نہیں جمائے تھے۔
بے بے نے جیسے روز کی عادت کے مطابق پائیرائی کے بدلے سرو میز پر مول کر کے اپنے لیے کوئی جگہ
پسند کر لی۔ وہ وہیں بیٹھ کر اپنی توہین سمیٹتی بھری۔
”دانیال خان یہ بیٹلا ہیں۔“

”ہوں۔“ انہوں نے گردن جھکائے بغیر کہا۔ ”وہاں تو ہوا کر رہی۔“
ان کی نگاہیں آگ پر مرکوز تھیں اور سوچتی ہوئی ذہن آنکھیں کوئی جالا سا بن رہی تھیں۔ جیسے آتش
وان کی اسکرین پر کوئی پسندیدہ منظر دکھایا جا رہا تھا۔ دروازے کی دھکنیوں کے سامنے بیٹھ گئیں۔
”بیٹھ جاؤ نالبا۔“ بے بے نے چند لمحوں میں اس ناخوش گوار سے استقبال کو سمجھنے میں صرف کیے بغیر اس
کے لیے اپنے نزدیک سوٹنے پر جگہ بنائی۔ بے بے دانیال خان کے سامنے پرے صوفے پر آرام کے موڈ
میں آ بیٹھیں۔ اس کے سامنے جو جگہ آئی وہ دانیال خان کے آتش دان سے بائیں طرف تھی۔ وہ بیٹھنے
ہوئے چٹکا سی گئی۔ اگر دانیال خان آگ سے نظر اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ سیدھی ان کی تنقید کی زد میں
آجائے گی۔ بے بے کی پیش کردہ اسی طرح خالی پڑی تھی اور غالباً ”بے بے اس کی نگاہیں بھی سمجھ
رہی تھیں۔“

”یہ دالی کری اوسر لے لو نالبا۔“ انہوں نے دستا ”محفوظ بھنگاڑے کی طرف اشارہ کیا تھا۔
”ان کے لیے جگہ بنائے کی ضرورت نہیں۔ یہ دو سروں کو جگہ دیتی ہیں۔“
”سرس۔“ بے بے چو نکلیں۔

انہوں نے آتش دان سے نگاہ اٹھا کر پہلی مرتبہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بے بے کے
ساتھ دالی کری پر بیٹھیں۔ جھجک گئی۔ آج ان کی آنکھوں کے ساتھ ہونٹ بھی مسکرا رہے تھے۔ اس نے
پہلی مرتبہ ان سے پناہ معذرت رشتہ دالی آنکھوں سے چھائی آئی۔ جھٹلائی روٹی لپکتی دیکھی۔
”کیا بھابھ میں لوگ پیار کی عبادت کو نہیں جانتے؟“

وہ سن رہی ہو گئی۔ اس کے پاس صوفیوں کی اس تقریق کا کوئی جواب بھی نہیں تھا۔
اس نے خاموشی سے آنکھیں جھٹک لیں۔ لیکن شاید وہ اب اس پر فرض تھا۔ لیکن وہ جواب بھی کیا ہے۔
اس نے آنکھیں اٹھائیں۔ دانیال خان کی گہری عین نظر میں گواہ جواب طلبی کے لیے اس پر گڑی ہوئی
تھیں۔ سچا نہیں وہ اب بھی سنجیدہ تھے یا اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔
”انہوں نے لیے اٹھائی پلکیں اس نے داپس کر لیں۔“

”اب آپ مجھے زخمی کر کے جتن منا رہی تھیں۔“ اب ان کے ہونٹوں سے وہ موم سی مسکراہٹ بھی
غائب ہو چکی تھی۔ لیکن اپنی بات منوالینے والی نگاہیں اس پر گڑے وہ ابھی تک وہ اب کے بھٹک رہے تھے۔
بے بے نے ایک حیرت بھری نظر دانیال خان پر ڈالی۔ ان کا یہ رویہ غالباً ”ان کے لیے یا نہیں عجیب
ضرور تھا۔“

”کیا مطلب؟“ انہوں نے قطعاً کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیا کاسارا لیا۔
”اس کو کہتے ہیں سیکرٹریا کو نالبا۔“

”کیا مطلب؟“ بے بے نے دوبارہ سوال کیا۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی کی طرف سے جواب نہیں کیا۔

”مجھے دراصل پتا نہیں تھا آپ کا کچھ کہاں ہے؟“ اس نے اپنے پرانے اعتماد کو بحال کر کے اس کی تماشائی بنائی نگاہوں کا سامنا کیا۔ وہ ہرزل نہیں بھی ہرگز نہ۔

”واہ آپ پنجاب سے گزری تھیں کارا سہ توڑ سونڈ کا لقمہ ہیں اور گڑھی سے دس کوڑھڑواہ اک کرتی نکل جاتی ہیں اور میرا یہ سکر قطب شمالی میں ہے شاید؟“

وہ پھر سکرارہے تھے اور اس مسکراہٹ سے وہ کیا مطلب نکالے۔ اس کی سمجھ سے بڑا تھا وہ اس کو اس کی اوقات بتا رہے تھے اس کو نوکری کی طرف دھیان دینا چاہیے۔ وہ یہاں نوکری کرنے آئی تھی۔ پچھلے کپڑاں مٹانے میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ اس کا چہرہ اس سے بالکل مختلف تاثر چھوڑتا تھا۔ یا وہ بے بے کے بقول عادی ”مسکراہٹ تھی“ حالانکہ ان کا چہرہ اس سے بالکل مختلف تھا۔

”اس کا قصور نہیں ہے۔ دراصل ہم لوگ ہی۔“ بے بے نے بات کی تسمیہ باندھی۔

انہوں نے اپنی کرسی سے سر اٹک بھٹکے سے بے بے کی طرف موڑا۔

”کیا ان سے جب بھی کوئی سوال کیا جائے جواب آپ دیں گی۔ یا آج کے لیے یہ رعایت ہے۔“ ان کے لیے میں کٹ کے دوڑے بے بے کے لیے احترام تھا اور یہ احترام صرف بے بے کے لیے ہی تھا۔

وہ ایک دم مپ ہو گئیں۔

یہ غائب! وانیال خان کی ان رویوں کے عادی ہیں۔ وہ نہ واقف تھیں نہ عادی۔

بے بے نے ایک نظر بے بے سے سیلا کی طرف دیکھا۔ شاید اس امتحان میں ہل ہو جائے۔ حالانکہ کتنا تو اس کو پڑھا تھا کتنا کرا لائی تھیں اور آج تو بیلا جیسی پر سکون اور صابر لڑکی بھی خمدی ہو رہی تھی۔ کیا حرج تھا اگر وہ مڈورٹ کے دوپول کہہ دیتی۔ اس کی نوکری جانے سے زیادہ ان کو اپنے ساتھ کے بھٹ جانے کا ملال تھا۔

یہاں اب تک اس گھر میں اور ہی امتا نہیں رہی تھی۔ اس کو اب تک اس مالکانہ لہجے کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور شاید اس لیے بھی کہ اب تک اس کا سابقہ مالکوں سے چاہی نہیں تھا۔ بانی سب گھر کے افراد بھی اسی کی طرح تھے۔ بس بے بے سارا کسی اور کے گھر میں سارے کے مٹلائی۔

اس کی پہلی نظر اس ٹارگٹ پر آئی جہاں کچھ دیر پہلے نفوس گاڑے وانیال خان کم بے ضرر اور کم تکلیف نگ رہے تھے۔ انہوں نے ایک نظر بے بے کی نظروں کے تعاقب میں اس سمت دیکھا۔

”آپ لوگ آگ کے پاس آجائے۔ یہاں کافی سردی ہے۔“

وہ اب بالکل پیچیدہ تھے۔ اپنے سابقہ رویوں کے برعکس خوش اخلاق اور مہمان نواز۔

بے بے نے احکامات کی تعمیل کے عادی شخص کی طرح ایک جھٹکے سے اپنا تھمیا اٹھایا اور آتش دان کے پاس ایک جگہ بیٹھا۔

”تم یہاں آجاؤ۔ وہاں“ انہوں نے اپنے نزدیک کی جگہ اس کے لیے عادی ”بہی خالی کی۔ حالانکہ وہ دیکھ چکی تھیں کہ اب ان کو اس کا اختیار نہیں رہا۔

”میں آپ اس جگہ بیٹھنے کے آگ کے قریب ہے۔“ انہوں نے ایک بڑا کٹن ہاتھ بڑھا کر اپنی کرسی

اور آتش دان کے درمیان پھینک دیا۔

”ملاؤہ ازیں مجھے آپ سے بات کرنے کے لیے گردن جھکائی پڑتی ہے اور میں اس طرح زیادہ آرام محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور کٹن پر آئی۔ کٹن پر بیٹھنے سے پہلے اس نے اس کا ہاتھ سارے صبراً ہی تھکا کر وہ بول اٹھے۔ ”اس کو بالکل وہیں رہنے دے۔ وہاں میں نے رکھا ہے۔“

وہ بیٹھ گئی چپ چاپ کو علم کی بے جا تعمیل اس کے لیے خوشوار تھی۔

”ہاں اس طرح ٹھیک ہے۔“ بے بے نے کہا۔ ”ارباب بتائیے گڑھی نے آپ کو اور آپ نے گڑھی کو اچھی طرح سمجھ لیا۔“

وہ اپنی کرسی کی آراستہ پشت پر سر ٹکا کر اس سے سوالات پر اتر آئے۔ اطمینان اور سکون سے۔

گویا وہ بھی ان کا کوئی پالتو جانور تھی۔ وہ اسے مددگار رہے تھے۔ پہلے کوڑے برساتے رہے اور بپ تھمتھانے پر اتر آئے۔

آجی جلدی تو اس پر رفت طاری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کبھی ایسا وقت آتا ہے جب اس نے آنسو بہانے کے بجائے بے بے کی کوشش کی کہ انہوں نے اس کے لیے کٹن بھی تو اسی جگہ بیٹھا تھا جہاں وہ سیدھی ان کے تیروں کی زینت آتی تھی۔

اطمینان سے کرسی کی پشت پر دھرا سر انہوں نے سیدھا کیا، کٹن دیر اس کی نگاہوں کی سیدھ میں اس کی نیچے اوپر جھٹکتی پگھل کو دیکھتے رہے۔

”کیا میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے دل ٹٹنی کا کوئی ہلو ٹھٹکا ہو۔“ وہ اب کہیں سے نہیں مسکرا رہے تھے۔

”آئی ایم سویری بے بے۔ آپ ہمیشہ منع کرتی ہیں اور میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔“ بے بے اس ہی صورت حال سے خبر اگنی تھیں۔

”میرا خیال ہے بیلا عادی“ ہی خاموش ہیں۔ یہ نسبتاً نرم گو ہیں اور شاید نازک بھی۔“

بے بے اس کے دفاع کے لیے ہر وقت ہی تیار رہتی تھیں۔

”اچھا۔“ ان کی آنکھوں میں لہجے بھر کے لیے شرارت چمکی۔

”اور اب تک میں یہ سمجھ رہا تھا کہ بہت دلچسپ۔“ بے بے نے کہا۔ ”وہ پیچیدہ ہوئے۔“ انہیں بہت سی چیزوں کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کے خیل مجھے جی زندگی ملی۔ اور یہ زخم ملا۔ آپ بروقت نہ آجائیں تو واقعی پیچھے مجھے کھائے ہوئے۔“ بے بے نے بے خوبی سے سراٹھایا اس سے قبل کہ وہ اس نہ سمجھ میں آئے والے بزل کو پیچھے تھیں وانیال خان ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”بے بے ہم لوگوں نے تو ان کو آج یہاں پائے پر بردہ گویا تھا کیا جانے نہیں ملے گی۔“ وہ تیزی سے اٹھیں۔ پہلے انہوں نے بیل بھائی۔ پھر کسی کا اظہار کیے بغیر خود ہی تیز قدم اٹھائی بیڑھیاں چڑھ گئیں۔

”میرا خیال تھا آپ سب لوگوں کی طرح میرا حال پوچھنے آئیں گی تو میں تفصیل سے آپ کا شکریہ ادا کروں گا۔“ انہوں نے فی الحال پاؤں پر زور ڈالنے سے منع کیا۔ وہ نہ تو آجائے۔ گوجان۔ چالے والی چیز کے سامنے شکر یہ جیسا لفظ بڑے معنی بڑا رہی سا لگتا ہے۔ لیکن آخر ہم اپنے احساس کا اظہار کیسے کریں۔ اور میں نے تو شاید کچھ کہہ کے آپ کو ہم ہی گویا ہے۔ حالانکہ میری نیت نہیں تھی۔ شاید میں

نے الفاظ نہیں جیسے۔ آپ جانتی ہیں اردو میری مادری زبان نہیں۔“
 وہ جانتی تھی ان کی مادری زبان کوئی بھی ہو ان کو اپنی گفتگو پر عبور حاصل ہے۔
 وہ اس کا یہاں مرتبہ اور مقام جان کر اس کا شکریہ بھی اس طرح ادا کر رہے تھے جیسے اس پرست بھاری
 احسان کر رہے ہوں۔
 اسے افسوس ہے ہوں کہ وہ ان کے ساتھ بد قسمتی پر اتر آئے۔
 وہ بھی کوئی بدداشت آنانے لگی تھی۔
 عرم کے آگے آگے بے چارے کے لوازمات لے آئیں۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی
 گھبرا کر جیسا کی طرف دیکھا۔ اس کو خاموش دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا گویا جس
 پر نگاہ کا خدشہ تھا وہ نہیں ہوا۔ اسٹڈی کے آخری حصے میں رکھی کھانے والی چیز کے سامنے کرسی بچھا کر
 چائے بنانے لگیں۔
 ”تم جاؤ عرم۔“ انہوں نے دانیال خان کی طرف دیکھتے غیر محسوس طریق پر اردو میں کہہ دیا۔ وہ جانتی
 تھیں وہ نوکریاں کی بلخار سے گھبراتے ہیں۔
 ”آپ کچھ نہیں گے دانیال؟“
 ”کیا ہے؟“
 ”کیا آپ ہیں اور بسکٹ۔“
 ”ہاں بسکٹ دیتے۔“
 ”ذرا تم تکلف کو کی بٹلا۔“ انہوں نے ان کی چائے میں چینی گھول کر اس کو پکڑا دی وہ کچھ رکی۔ پھر
 اس نے سامنے صغریٰ تپائی پر چائے کی پیالی اور سرد ٹنگوش سے باری باری چیزیں سرو کیں اور جواب میں
 بلکاسا سرد سا شکرہ وصول کر کے اپنی پیالی لے چلی گئی۔ بے اس کی پیالی میں چائے اٹھیلے اس کی منتظر
 بیٹھی تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنی پیالی کھسکا کر، چیں بیکر کے سامنے رکھی وہ سری سری بریدہ گئی۔
 ”آپ واپس اپنی جگہ پر آئیے۔“ اس نے اپنی پہلا کھونٹ ہی بغیر اٹھا کر ٹھٹک گئی۔
 واقعی یہ انداز حکم کا مکانہ معنی رائے تو تھی ہی۔ بچہ پچھرا تھی اس کو اسٹڈی کے سامنے کی طرح ان کو رعب جاتے
 رہنے کی عادت رہ گئی تھی۔ (یہ ان کی ساری عمر کی عادت تھی بھول بے بس)۔
 اور اس کو حکم ماننے کی عادت تھی عموماً میں بڑے کی۔ یہ مظلوم سی بھی نظر آتا پسند نہیں کرتی تھی۔
 اس نے خاموشی سے اپنی پیالی اٹھالی اور واپس اس کی منہ پر آئی تھی۔ اس سارے عمل کے دوران وہ
 چائے کی پیالی ہاتھ میں رکھے اس کے اٹھتے اور بڑھتے قدموں پر ایک سنگین سی نظر رکھے ہوئے تھے۔
 ”یہاں آنے سے پہلے آپ کیا کرتی تھیں۔ موت کے کنوئیں میں موڑ سائیکل چلاتی تھیں اور اب
 بھاگتی ہوئی کہاں جا رہی تھیں۔“
 ”کسی خاص جگہ نہیں۔ یونی۔“
 ”کچھ انداز ہے آپ کو آپ کڑی سے کتنی دور تھیں۔“
 اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ سجدگی کے لحوس لہوے میں نہایت غیر متوجہ سوال داغ
 رہے تھے۔

”اندازہ نہیں۔“ اس نے صاف آواز میں کہا۔
 ”وہ کدو جیسے ان سے آپ پرانی بار اللہ سب سے وہ آپ کو کچھ نہیں کہتے؟“
 ”جیسے شیر انسان۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ اس نے حتیٰ الجسے میں کہا۔
 ”اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جنگی ہیں۔ ان تینوں میں سے کم خطرناک کون ہے؟“
 وہ بیانی میں سے ہائے کا پسلا گھونٹ لیتے رک گئی۔ کوئی عینی خان کا مالک یہ شخص اتنا بے وقوف نہیں
 جتنا اچھے سوالوں سے اسے بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟
 اس ان کی اسے مضبوطی سے جی نگاہ کا ہمارے سے مدد نہ کیا۔
 ”دور نہ کوئی بھی کم خطرناک نہیں ہو سکتا۔“
 ان کے چہرے پر کسی نامعلوم رنگ کا کورہا کا۔
 ”انسانوں کی بد رفتاری کے بارے میں کیا دیکھا؟“
 ”میں نے انسان کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔“ اس نے صداقت سے چٹایا۔ ”تباہوں، کمانیوں سے
 دیکھا ہے اور میرے خیال سے لوگ برے نہیں ہوتے۔“
 ”اھ۔“ عینی۔ ”انہوں نے کسی نتیجے پر پہنچ کر اطمینان سے کہا۔
 ”میں بھی حیرت زدہ تھا یہ آپ کا چہرہ کسی یسائی راہب جیسا آتش کیل دیتا ہے۔ بہن بھائی ہیں آپ کے؟“
 ”نہیں۔“
 ”والدین۔۔۔؟“
 ”نہیں۔“
 ”کڑھی میں رہتے رہتے وہ ان سوالوں کے جواب دینے کی اس قدر عادی ہو چکی تھی۔ اب اس کا گھٹا
 میں زندہ تھا اس کی آواز نہیں بھراتی تھی۔
 لیکن شاید یہ اس کا لیکن ہی تھا کیونکہ سوال کر کے اس نے کتنی ہی کادو قدم رکھا۔
 ”آپ جہاں رہتی تھیں وہیں آپ کے دوست اجاب تو ہوں گے۔ آپ کے رشتے دار ملنے والے۔“
 ”ہم لوگ اتنے سوشل نہیں تھے۔“
 ”ہم لوگ۔۔۔؟“ انہوں نے خود اسازہ دروے کر پوچھا تھا۔
 ”ہاں چائے ٹھنڈی ہو گئی اور تم نے ایک کھونٹ نہیں بھرا۔“ بے بے نے تیزی سے اٹھ کر اس کے
 ہاتھ سے چائے کی پیالی لے لی۔ انہوں نے اپنی سالوگی میں دانیال خان کی برہم نگاہوں کی پروا بھی نہیں کی۔
 ”لاؤش اور سری پتا کر دیتی ہوں۔“
 ”ذرا تکلف کیجئے۔ سری پالی مجھے بھی بنا دیجئے۔“ وہ بڑے اہم اور پورے تھے۔ انہوں نے اپنی گرم پیالی
 سے ایک قطرہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔
 ”میرا خیال ہے پہلے بڑا کو چائے پیئے دیں۔“ انہوں نے دونوں کو اپنی اپنی پیالیاں تھمائے ہوئے کہا۔
 ”کون پیلا؟“ انہوں نے حیرت سے اپنی بھنوں اچکا کر پوچھا۔
 ”پہلا یہ اپنی بہن اور کون۔“

و اپنی بے ساختہ سادگی سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھ گئی۔
 ”کیا واقعی یہ مروج میرے غلط تھینے سے آئی ہے؟“ وہ ان کی زخمی ٹانگ کے نزدیک محبت اور توجہ سے ان کی طرف بھٹی ہوئی تھی۔
 ان کے چہرے کا وہ تکلیف دہ تاثر یک لخت ہوا ہو گیا۔
 وہ گڑھی کے مالک کے بجائے ایک چھوٹے سے معصوم بچے کی طرح نظر آنے لگے تھے۔ بچپن کی شوخی سے غریب روزِ زندہ دل سے ہنسا آتی۔
 ”اگر آئی بھی ہے تو میں اس موج کا ممنون ہوں۔“
 بے بے نے چونک کر سر اٹھایا۔ شاید سکرانے کے باوجود رانیال خان کی تکلیف میں ایک ایسا اضافہ ہو گیا تھا۔
 ”اب کلامت مت شکر۔ آہستہ ملاقات رہے گی۔“
 انہوں نے بے پرواہی سے اچانک سکرانے کا حوالہ دیا۔ یہ بڑا انداز میں خود سے اچھے رہے تھے۔
 اگر بے نے اس کی کوئی پکڑ کر اس کو چلنے کا اشارہ نہ کرتیں تو وہ قیامت تک نہ سمجھ پائی کہ انہوں نے محض درخواست کر کے ان کو چلنے جانے کا حکم دے دیا ہے۔



چمکتی سنہری دوا کی کانیز و بکی دھوپ کی روشنی میں دیکر رہا تھا۔
 بیانی چلی سے دوا کی بیٹھ اپنے قدموں میں بھری گری بڑی فقر آتی ہے جیسے آپ کائنات کی اہم ترین تخلیق ہیں اور ساری دنیا خدا تعالیٰ نے صرف آپ ہی کے لیے پیدا کی ہے۔ طویل اور شدید کشش کے ایک بڑے آواز میں دور سے کامیاب نظریے کی خوشی آپ کو اس وقت سے دو چار کر سکتی ہے۔
 سب کچھ اس کے قدموں میں تھا۔ حتیٰ کہ آخری دنوں کے دیوتاؤں کی درخت کی چوٹیاں اس کے پیروں کو چھو رہی تھیں۔ بے چھلکے ہو کر آسمان میں اڑ جانے کی مسرت اس کی رگ رگ میں پہلی دفعہ اتری تھی۔
 رانیال خان کے اندر بے نے بے کی رپورٹ تک کے تین دن میں وہ ساری سچی سوچا رہی تھی۔ معلوم نہیں رانیال خان نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ پانچویں دن صبح اس کی جھٹکی کر دی جائے گی۔ پہلے ان سے کشش اسی طرح چلتی انہوں نے کلاں کس تک آن پہنچی تھی اور رانیال خان نے پالا لاک منصف کی طرح فیصلہ کا حق محفوظ کر لیا تھا کہ تیسرے دن بے نے نہ سمجھنے کی میٹھییاں چڑھ کر اعلان کیا تھا۔
 ”رانیال خان کا کہنا ہے۔ تمہاری تنخواہ تم سے پوچھ کر مقرر کر دی جائے اور تم مشرقی حصے کا کام شروع کرو۔“

بے نے بے کے انداز میں لاپرواہی اور بے نیازی سی تھی۔ جیسے انہیں اس واقعہ سے بہت زیادہ دلچسپی نہ ہو یا شاید انہیں علم تھا کہ فیصلے میں کتنی ہی دن لگیں انجام کار ایک دن فیصلہ ہی ہو گا۔ انہیں اس کے خوش سے تھکاتے چہرے نے حیرت زدہ کیا نہ اطمینان کی گہری سانس نے۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر اس کو کتنی مرتبہ بے ٹالی سے منسلک اور بے چینی سے پھرتے دیکھا تھا لیکن ان کے چہرے پر ایک غصہ کا اطمینان تھا۔ انہوں نے بالآخر ہندو موزوں اور شیشے کے پت جوتے کھول کر اس کو دیکھا۔
 ”موسم ٹھنڈا نہیں؟ تم گرم کپڑے نہ پہنتیں۔ کیا بات ہے اور ہاں۔ ٹانگے کرنا میری کوتاہی میں

”اور۔“ انہوں نے مطلق شرمندہ ہوئے بغیر سچی گئی سے اپنی چائے سے گھونٹ بھر لے شروع کر دیے۔
 اس کے ہاتھ میں گرم پانی تھی اور بے نے اس کی طرف سے ان کو اجازت نہیں تھی۔ وہ جب تک چائے ختم کرے اپنے سوالوں کا سہہ دے دے۔
 حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں کوئی روایت اس نے تاریخ کی کتابوں میں دیکھی تھی۔ پچاسی کے لڑم نے روایت کی تھی۔ وہ جب تک اپنی کانگورانی لے لے اسے نہ کرے۔
 کاش وہ بھی اتنی بالاک بین سکے کہ جاس بخشی کے لیے اپنی چائے کی پیالی ان کے منحنی قالین پر اونٹھا دے لیکن سکار سوئی نہیں تھی اور چائے کی پیالی بھی اب حیات نہیں تھی۔
 آخر حقہ دہی تھی اور اس کے ساتھ مصلحت بھی۔
 ”پر دعا تو یہ آپ نے ہے۔ تو میں اندازہ لگاتی سکتا ہوں۔ گاڑی چلانا کس سے سیکھی تھی؟“
 ”ہاں۔“
 ”مالا نکہ آپ کہہ رہی تھیں آپ نے کبھی نہیں چلائی۔“
 ”میرا مطلب تھا جب نہیں چلائی۔“
 ”راہ کیا خوب مطلب تھا۔“
 ”کوئی کی چیز۔“
 بے نے بے کو جواب دینے کے لیے ہاتھ گھما دی تھی کہ تیز لہجے میں رانیال خان نے اس کی توجہ کھینچ لی۔
 ”مطلب یہ کہ آپ نے زیادہ لوگ نہیں دیکھے۔ جو دیکھے وہ کیسے تھے؟ گڑھی کے جیسے۔ بے جیسے۔“
 ”میرے جیسے اچھے یا برے؟“
 ”نہیں ان میں سے کچھ زیادہ اچھے تھے۔ کچھ زیادہ برے۔“
 وہ چونک گئے ”آج کل گوشتوں، آپ بیتی جی بولتی ہیں۔ آپ نے دنیا زیادہ نہیں دیکھی۔“ انہوں نے ایک سرچا ہوا گہرا سانس لیا۔
 ”اور اچھا ہوا کہ نہیں دیکھی۔“ انہوں نے جیسے خود سے ہر دھار کہا۔ پھر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
 وہ دو مختلف ناقابل فہم انداز میں مسکراتے اور سنجیدہ رہتے۔ لیکن دراصل وہ اس کو بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔
 ”کیا کوگا وہ اور خیالوں میں کسی سے مخاطب تھے۔“
 ”آپ کی دنیا بہت شاندار ہے۔ لوگ محض ہوتے ہیں۔ بچ بولتے ہیں۔ جی محبت کرتے ہیں اور جی نفرت ایمان دار ہیں۔ حق گو ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرنے بلکہ ظلم ہونے بھی نہیں دیکھتے اور دنیا داری کے ہر پھیلے سے آزاد ہیں۔ سولی بی مارک الدنیا کا کیڑہ زن اور دنیا پر خدا کرے آپ کی یہ احمقوں کی جنت بھی مسما نہ ہو۔“ انہوں نے غالباً بطور خاص یہ سارے فقرے انگریزی میں ادا کیے۔
 اس نے خاموشی سے ان کی دکان کی طرف دھیان دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کڑی پرانی لڑ رہے تھے۔ ”اے ایک ہی رخ پیٹھے پیٹھے تھک چکے تھے۔ اپنی زخمی ٹانگ کو انہوں نے تھوڑا سا میل دیا۔ پھر اسے تکلیف دہ جھٹکے سے سیدھا کر لیا۔“

نے پچھلے ماہ کی تنخواہ بھی نہیں دی اور غریب و سرائینہ شروع ہو جائے گا۔ خان اس سلسلے میں مجھ پر برہم ہو رہے تھے۔ وہ اس قسم کی بے پروائیوں کے سخت خلاف ہیں۔ میں نے ان سے معذرت کر لی۔ وہ میرا ہی ہو گئی۔ وہ برہمی کا ذکر ایسے کر رہی تھیں جیسے ان کے نزدیک یہ بھی ان کا بہت بڑا انعام ہو اور معذرت کرنا ان کا ذمہ و کام تھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح فقروں کی ترتیب اور موضوع کی حیثیت میں رکھے بغیر بے ربط بول رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ تم اپنی تنخواہ کے سلسلے میں خود ان سے کہہ دیا۔"

"میں بے بے! وہ بولھا سی گئی۔" مجھے کچھ نہیں کہنا۔ آپ اپنی مرضی سے طے کر لیں اور ان سے

کہہ دیں۔"

"میں بے بے! وہ بولھا سی گئی۔" مجھے کچھ نہیں کہنا۔ آپ اپنی مرضی سے طے کر لیں اور ان سے

کہہ دیں۔"

"ارے تم بھی انہی خان سے ڈرتی ہو۔ وہ ڈرنے والے آدمی تو نہیں۔ وہ بہت خوش خلق ہیں۔ چلو خیر

میں ہی ان سے بات کر لوں گی۔ تم زیادہ دیر باہر نہیں ٹھہرنا۔"

لوگوں کی کہتے ہیں اس پر بند ہو گئے لیکن قسمت کے محل گئے تھے۔

"وہ کتنی دیر وادی میں اور ہے۔ نیچے دور تک بننے والے ہاڑی نا۔ لے کی تپتی گاتی رفتار دیکھتی رہی آج

سے دنیا اس کے لیے بول رہی تھی۔"

تین قیمت کین گزری گئے اور جتنے دن طویل پڑے تھے اتنا اس کا صبر جواب دینا جا رہا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ اس خوشی کو شیئر کرے کوئی تو وہ جو اس خوشی میں اس کا شریک ہو۔

پہلا خیال اس کے دل میں گھسی کا آیا تھا لیکن خوشی اس خوشی کی خبر کو سمجھتی ہے۔ ہنسنے کے بجائے

سادے خم میں اڑتی پھرتی اور نتیجہ یہ نکلتا کہ ایک دن اہل لاہور اس کو پہاڑوں کی اس آزاد و فضا سے واپس

قید میں بند کر دیتے۔ جہاں اس کی زندگی کے رہے سب پر سکان بھارت بھی تباہ ہو چکے تھے۔

اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اس خوشی میں شریک ہونے والا وہ پہلا شخص اس کو نظر آیا۔ اس کو گواہ دراصل

اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پہاڑی نا لے کی تنگ راہ وادی جو لمبے راستے سے اوپر تک آتی تھی۔ اس نے

کسی موٹر سائیکل سوار کو تیز رفتاری سے اوپر آتے دیکھا۔

وہ اسی رفتار سے نیچے کی طرف دوڑنے لگی۔ اس نے بھی اتنے قدم نہیں اٹھائے تھے کہ موٹر سائیکل

راستہ عبور کر کے اس تک پہنچ گئی۔

"خان گل۔ مجھے جا ب ل گئی۔"

وہ اس کو وادی سے نیچے دوڑا دیکھ رہا تھا اور دوڑتے ہوئے اس کے چہرے پر بھوتی بے تھا تا خوشی بھی

اس سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے موٹر سائیکل اس کے نزدیک دوڑا اور مسکرایا۔

لیکن اس کے ہلے فقرے نے ہی اس کے مسکرائے کا مڑا کر کر دیا۔

وہ جیت سے اس کے خوشی سے مسخ ہو کر چہرے کی خوشی کا نسوم نکالتا رہا۔

"کہاں ٹی گئی؟"

"میں کڑھی میں آ کر کھڑی۔"

"کیا مطلب؟" خان گل اس کے پاگل پن کو سمجھنے سے بالکل جاہر نظر آ رہا تھا۔

"مجھے میں نے مراں پایا لی ہو کیا تھا۔ وانیل خان نے مجھے سیکٹ کر لیا ہے۔"

"لا حول و لا۔" اس نے گرا سا لیا۔

"تم بھی کیا چیز ہو سکتی! وہ بے ساختہ ہنسنے ہوئے بولا۔ "صرف پہلی ملاقات میں مجھے ایک مسئلہ کے لیے

خبر ہوا تھا کہ تم عقل مند لڑکی ہو۔ اس کے بعد تم نے مجھے بیٹھا پاؤں کیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ کو میری خوشی سے کئی خوشی نہیں ہوئی۔"

"خوشی کیسی؟" میں تو یقین تھا آپ کی کامیابی کا اور وانیل خان کی کیا جرات کہ آپ کو روپیہ کھٹ

کر رہے! وہ اپنی کامیابی پر ہنس رہی تھی۔ ابھی کبھی ہم اپنے آپ کو کتنا کمزور تصور کرتے ہیں۔

"یہ کیسی پرکشش جگہ ہے خان گل۔" اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بے خودی کے سے عالم میں

کہا تھا۔

"اتنی جلدی میں یہاں سے چل جانے کے تصور سے پریشان ہو رہی تھی۔ حالانکہ مجھے ابھی یہاں

آئے دن ہی کہتے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے میں یہاں ہمیشہ سے رہتی تھی۔ یہ پہاڑیہ بڑھ اور

اگر ایک لمحے کے لیے بھی میں اس وادی سے الگ ہونے کا تصور کر لوں تو مجھے خوف آنے لگتا ہے۔"

"نہیں یہ جھمکوں والا چکر تو نہیں۔" وہ خوش خلقی سے ہنس رہا۔

"تم کتنے غیر منجمد ہو خان گل۔" اسے سخت باہمی ہوئی۔ ابھی بھی اس پر ایک موڈ طاری تھا۔ خان

گل نے اپنی طبیعت کے مخصوص مظاہر سے اس کا سارا حواس متاثر کر دیا۔

وہ جھنجھلا کر بولنے لگی۔ "تمہیں اس وادی سے کوئی لچھی نہیں۔ شاید یہ محل تمہیں پسند نہیں اور

گل کے لوگ تمہیں پسند نہیں۔ اس لیے یہاں سے بھاگتے پچے ہو۔ اصل بات یہ ہے جو چیز آپ کی

دسترس میں ہو اس کی آپ کو پروا نہیں رہتی اور تم کہیں پھرتے رہتے ہو۔ آخر یہاں ٹھہرتے کیوں

نہیں۔"

اس نے اس کے صبر و تحمل کے کامزائے کے برعکس نہایت سکون سے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔

"یہ آپ سے کس نے کہا دیا یہ میرے دسترس میں ہے۔ ہاں شاید اسی لیے مجھے اس سے نفرت ہے۔

کہ یہ میری دسترس سے باہر ہے۔ محل میں رہنے والوں سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے

تو ہمدردی کے جانے کے متعلق تو یہی لوگ ہیں۔ مثلاً بے یار و مددگار اپنی ذات کے قیدی۔

رہی آپ کی آخری بات تو آپ نے بھی خواہش کا اظہار ہی نہیں کیا۔ ورنہ ہم ہمیں رو پڑتے۔ کیونکہ

بہر کیف اس محل میں قید کرنے کے لیے آپ کو توڑ کھا نہیں گیا۔"

وہ خاموشی سے ہر نظر تک بکھرے بڑے بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر خان گل کی طرف دیکھا اور

معذرت سے مسکرا دی۔ وہ موٹر سائیکل تھا اسے وضاحتیں صفائیاں پیش کر رہا تھا۔ جیسے وہ یہاں معزز

مہمان کی حیثیت سے لائی گئی تھی۔ جیسے اس کا ہم ہمہ وقت اپنی عزت کروا رہا۔ اپنی خدمت کروانا ہو۔ وہ

بکے سے مسکرا دی۔

"میں سوچ رہی تھی۔ تم آگے تو ان سارے علاقوں میں خوب محوم پھر کر دیکھو گی۔ دراصل اس

کڑھی سے صرف ایک ہی چیز نظر آتا ہے اور وہ میں دیکھتے دیکھتے آگیا گئی ہوں۔"

"واہ صاحب اور ابھی دو سو مہر کے سے اس وادی سے انظار عشق کر کے آپ اس وادی سے ہی نہیں حمد میں مبتلا کیے دے رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے آکٹا ہٹ کا اظہار۔"

وہ ایک مدت بعد پھر بھوم کر رہی تھی۔ کھل کر رہی تھی۔ جب خوشی اندر ہو تو ہر بات سہانی لگتی ہے۔ ہر چیز انسانی۔ وہ خان گل کی تقریر کے جواب میں کھکھلا کر رہی۔

"قر لوگ آخر اتنی مشکل اور کیسے بول لیتے ہو؟"

"لوگ کون لوگ؟" اس کو اپنے سنا سا ہوا۔

"تم بے دانیل خان۔"

"تو دانیل خان کی اردو دانی کی آپ بھی قائل ہو ہی گئیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ وہ لوگوں کو اپنا قائل کرتی لیتے ہیں۔"

یلا نے اس کی طرف دیکھا وہ عجیب انداز میں اپنے بھائی کی بات کر رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھنے سے قاصر ہی رہا۔

یہ ایک تکلیف دہ سوچیں تھا۔ وہ ان کے آپس کے جھگڑوں سے آگ ہو کر چھاؤں پر آگے ان بے شمار شکوفوں میں گم ہو جانا چاہتی تھی اور یہ اتفاق تھا یا اس کی خواہش کا احترام کہ آگے وہ ان خان گل کھڑی تھیں۔

تھا۔ ہمدردت اس کو اپنی خوشگوار کہنی سے لواز تا ہوتا تھا۔ بے آتش دان کے پاس اپنا کوشا سنبھال کر بیٹھا۔ بجلی سیٹ پر بیٹھی بتائی میں مصروف رہیں وہ دونوں ان کے آس پاس ہوتے۔ کبھی نیچے قالین پر بیٹھے آتش پھیلا کر آپس میں جھگڑتے رہتے۔ ان کی چڑیا کی دلی سے حکم کے لیے حکم ہر پتے پر جان جاتی۔ بے آگہ اٹھا کر ان کو تاش کے بتوں پر چھینا جھین

کرتے دیکھتے۔ پھر وہ بیکر لے کر آ بیٹھے اور کھلی سفید گویوں کی خاطر ایمان جیسی قیمتی چیز ملیا میٹ کے ڈالنے۔ وہ خاموشی سے مسکرا کر چلتی۔ یہ خوب صورت سا گھڑا بوجھل ان کو قسمت سے نصیب ہوا تھا۔

اسی لیے وہ اس کے لئے کچھ کو نوینڈ میں لوٹ کر سنبھال لیا چاہتی تھیں۔ یہ بلائی تھی۔ وہ جانتی تھیں۔ جس نے اس کو گھر لایا تھا۔ جس نے اس بھت کے نیچے پہلی دفعہ لوگوں کو سنا سکھایا تھا۔ خود اس کو سکھایا تھا جو کہوں کی بات اس توجہ سے اور محبت سے سنتی تھی جیسے کوئی دلچسپ قصہ سنا جاتا ہے۔ بے

نے ایک طویل اور گہرا سانس لیا۔ اپنے طویل لمبوں گہرے سانس ان کی شخصیت سے جڑ گئے تھے۔ وہ خود ہی خواہشوں کے جال بنتی تھیں۔ خود ہی موتیوں کی طرح زور و زور میں اپنی مرضی سے لوگوں کو پروتیں پھرا ایک جھٹکے سے ان کا جال بھر

بات۔ لڑان ٹوٹ جاتیں اور قیمتی موتی بول ہی اور اصرار دہرتے پھرتے۔ پھر ایک طویل اور گھٹری آدھ ان لڑوں کی بربادی پر بھرتیں۔

یہ ان کے اپنے خواب تھے۔ ان کی اپنی خواہشوں کے ظلم تھے۔ ان کے تصور کی ڈوری تھی۔ ہولناکی سے واسطے ان سب کو ملیا میٹ کر دیتے۔ سب کچھ برباد ہو جاتا۔ سوائے اسی ایک آگے اور

انہوں نے نہ کچھ بھی کیا تھا۔ ان کی آنکھیں مسلسل برادیں کی داستان سنانی تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر ان کے مشعر کہ جھگڑنے کی چیخ چنانچہ ان کو جو کاوا ہوتی۔

بھی خان گل سارے ہتھیار پیٹ کر صلح کے موز میں آ جاتا۔ اچانک وہ آتش اور کیرم کی ساری بازیاں بار جاتا۔ رضا کارانہ طور انہی پیلا کے دل کو بھائی بھی نہیں تھی۔ خیرات کی جیت کے بجائے طاقت سے لڑ کر حاصل کی ہوئی جیت اصل خوشی ہے۔

اسی ایک دن میں انہوں نے خالی زمین کی کھدائی کر کے ایک نسیبتا "ہوار ڈشٹن کے ٹکڑے پر بیٹھ

منشن کو روٹ ہالیا تھا۔ یہ قسمت ہی تھی کہ سب بے نے اسٹور سے ریگٹ اور فٹل ناگ کے کین نکال

دیے۔ ان ڈور گم سے آگاہ سارا دن اپنا کورٹ چکاتے رہے۔ عمارت کے قریب میں ایک خوشگوار سے قلعہ پر یوسف خان کی ہمراہی میں وہ اتنی سنجیدگی سے لان کی تیاری میں مصروف رہے جیسے پہل کوئی

بین الاقوامی مقابلہ منقہ ہو رہا ہو۔ پونے کی لائن ہوار کرتے اس نے ایک ٹھرو بکھا۔

ساتھ ہی پر جلال اور پر شکوہ عمارت۔ اپنی ذات میں اس وقت سے سربلند کھڑی تھی۔

دائیں طرف اوپر کی منزل میں لہرائے والے براؤن پروے لاہوری کی کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔

کئی کئی ہوا کے جھٹکے سے پردہ ہار آ جاتا۔ کئی اندر گھو جاتا۔ لاہوری کی یہ کھڑکی جو مشرق کے رخ کھلتی تھی جہاں صبح سورج سورج کی آدھن کرنیں داخل ہوتی تھیں۔ (اگر سورج نکل آئے)

لاہوری میں اس وقت کوئی کام ہو رہا تھا۔ کبھی یہ ہمیشہ کی بند کڑی کھلی نظر آ رہی تھی۔ معلوم نہیں اس وقت لاہوری میں کون ہو گا۔ چاہتے بھی اس نے کب روک کر کھلی کڑی کے سرسراتے پردوں کی

طرف دیکھا۔ پری نے بتایا تھا۔ "الک اپنی لاہوری میں کسی کو گھٹنے میں دیتے۔ اس وقت ان کی لاہوری میں جو کبھی ہے یقیناً "وہ مالک کے دست قریب رہا ہو گا۔

فرسٹ فلور کی لاہوری کے نیچے گراؤنڈ فلور پر ان کے آتش ہیں۔

اور آتش کے نیچے ہسٹ تھا۔ وہ است قریب میں تھے کہ ان کے غائب کا vent وہاں سے دیکھ سکتی تھی۔ یہ وہ ہی کمرہ تھا جہاں اس کی تقدیر کا سب سے اہم فیصلہ اس کے حق میں ہوا تھا۔

اس کی تقدیر میں اور کچھ تھا۔ یہ کون سا ملک تھا۔

"اکیا کر رہی ہو؟ ہماری لیکچر میں تیرھی کدیں۔" خان گل کی بد مزاجی نے اس کو چوکا کر دیا۔ خان گل نے بڑے اہتمام سے اپنی ٹیپ سے ٹاپ ٹاپ گزار رکھیوں کی مقرر کردہ کتاب سے بڑھ کر اس میدان کے

گرفتہ پورے کر دئے تھے اس نے بے ہودہ سے چرنا لکیر تے اس کی محنت پر ذرا بھی حیران نہ دیا۔

وہ بے ساختہ فٹس ای۔ اس کی ہنسی بہت بے ساختہ تھی۔ شاید اسی لیے ہمیشہ دلکش لگتی تھی۔ نکل گل غصہ میں ہر اچھا بڑا اٹھا کر اس پر لگا تھا۔ چاہے شرمندہ ہونے کے اس کو ڈھٹوں کی طرح ہشتہ دیکھ کر

دیں ٹنک گیا۔

"ہمیشہ خوش رہو۔" اس نے بزرگوں کی طرح دعا دی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے تم صم سا ہو گیا تھا۔

"ڈرا برے ہو۔" اس نے چھاؤں کی لکڑی سے اس کو ایک طرف دھکیلا۔

"اتنی محنت سے نشان لگایا تھا۔ پتا نہیں کہاں گم ہو گیا۔" اس نے بد مزاجی کے حصار میں دودھارہ گم ہو کر

چونے کے پیٹھ میں لکڑی سے ٹٹلا۔ "فرغ از این پیر۔"

کام پھر اچھ گیا تھا۔ معلوم نہیں کھیل کب شروع ہو گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"خان گل ہماری طبیعت میں بہت زیادہ اشتعال آتا جا رہا ہے۔"
ایک موضوع اور حالات سمجھدہ ہو گئے تھے وہ خاموش ہو گئی۔ یہ ان کا گھر پر مسلہ تھا۔ اور یوں بھی
ان دونوں نے بہتوں میں جھگڑنا شروع کر دیا تھا وہ خاموشی سے مٹی مٹی روٹیوں کے ٹوٹے توڑتی رہی تھان
گل تیزی میں جھگڑا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ بیٹا نے دیکھا۔ اس نے بے بے کے سامنے ہتھ پڑا دینے
کے بجائے وہ بدلتا پند کیا تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں بار بار وانیال خان کا نام لے رہا تھا۔ پھر وہ کھانا اور پھوڑ
کراٹھ گیا۔

بے بے غصے میں بھری بیٹی رہیں پھر انہیں ملال ہونے لگا۔ "ہاں نہیں اس نے دعویٰ پوری کیا نہیں۔
کھانے کے وقت مجھے یہ قصہ نہیں پھینکنا چاہیے تھا۔"
انہوں نے ایک دو ٹوٹے کھا کر پیٹ آگے کھسکا دی۔ "وانیال خان۔ وانیال خان۔ ہر بات میں
وانیال خان۔ اس کا قصور؟"
وہ چکی رہ گئی۔

یہ دونوں بہت اچھے گھر سے تھے اور اچھے دھن کا اتنی جلدی گزرتا تھا اچھا نہیں لگتا تھا۔
اسے لیکن تھا وہ دوسرے میں ہی کہیں غائب ہو جائے گا۔ اور وہ کہاں غائب ہو جائے گا۔ آئندہ اب جب وہ
آئے گا تو وہ اس سے معاملہ کرنا نہیں چھوڑے گی۔
اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔

وہ دوسرے کے بعد بیٹھ بیٹھ کورٹ میں تو وہاں نہیں تھا۔ مٹی کے بیچ چوڑے کی سیدھی قطاروں کے
ساتھ بیل بنا کر دوڑ رہے تھے وہ ان کا انجن بن گئی۔ یہ ٹھیک بے مزے کا تھا۔ مٹی کے بچوں کی لکھا
دیکھی آس پاس ایک بچوں کا جھنگن مانگ گیا۔ وہ ملازموں کے بیچ تھے اور غاراً "آس پاس ہی کہیں
موجود تھا۔ اس نے بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ
نہایت خاموشی سے چوڑے کی ملازمت کے اس طرف تھوڑوں کے بیچ ہاتھ رکھ کر پھسکا رہا ہے بیٹھ رہے
انہوں نے ایک بلی کی کورل کا انجن بنے دیکھا تو مزین بلی کرلی۔

وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی۔
اور گروپوں کا جھنگن ملازمت کر کے

"اچھا یہ تو تار تار میں سے کسی نے زمین دیکھی ہے۔"
ایک لڑکے نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔ "ہم یہ کھاس۔ ہم لڑی کوئل کیا تھا۔"

باقی لوگوں کے نزدیک وہ کولیس تھا۔ دنیا محوم آیا تھا۔ اس کی ہر بات پر ایمان لاتے تھے۔ اس نے بتایا
گھوڑے کے پیچھے کیے گاڑی چلتی ہے۔ کراچی کیا تھا۔ اس نے سمندر بتائی دیکھا تھا۔ وہاں کی گلیں
اور آسمان پر اپنی آنکھوں سے جہاز اڑتے دیکھے۔ لیکن وہاں اتنی گرمی تھی کہ اس کے ہم پر لالہ دالے نکل
آئے۔ اس لیے افسوس زیادہ بریدہ نہیں دیکھ سکا۔
ان کا تھکا ہوا شکل اور وہ بولتے تھے یا سمجھتے تھے۔

"چھائیں تمہیں سمندر کی کہانی سنائی ہو۔" وہ کہانی کا ذکر سن کر اس کے ارد گرد بیٹھنے اس نے غیر
کرلی کی کہانی سنائی اور چوڑے کی لکھ وہ فلم سے زیادہ اس کی حرکات و سکنات پر تھمتے لگاتے رہے۔

وہ خاموشی سے گھاس پر چوڑی مار کر چمکے کارس وانٹوں سے چوڑے گئی۔ کئی گھنٹوں کی محنت شاقہ کے
بعد ان خیل کے لیے تیار ہوا تھا۔ ملازمین کی چٹائی ہوئی۔ خان گل دوڑتا ہوا اندر گیا اور ٹریک سوٹ اور
جو کرز میں۔ مقابلہ کے لیے تیار ہو کر گھوں میں باہر آیا۔

"وہ۔" تم نے تو بہت اہتمام کیا ہے۔ اس کا مطلب یہاں گئے تو وہ گے نہیں میں نہیں کھیتی تم بہ ایمان
ہو۔

"اس کا مطلب یہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کھیلنا نہیں آتا۔"
"بے بے کو بلاؤ۔ فیصلہ کون کرے گا۔"

"بے بے کے فیصلے کو ماننا ہی کون ہے۔ چاہے داری کے فیصلے۔ ان کو اچھی طرح دکھائی بھی نہیں
دیتا۔"

"اس کا مطلب سوچ آئے ہو کہ ایمان داری سے نہیں جیتتا۔" وہ وہیں بھی دھناتی سے جھگڑتی رہی۔
"ایمان داری سے کون کسی کو جیت سکا ہے لی۔" اس نے قہقہے کا گراموڈ طاری کر کے ٹھنڈی آہ
بھری۔

"چلو لاؤ اپنی بے بے کو۔" وہ وہاں پانی پانی ہو جائے۔

بے بے بہت دیر سے آئیں۔ ناہوار زمین پر ان سے آسانی سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ یوسف خان ان
کی کرسی اٹھائے اٹھائے بول کے ساتھ زمین پر ان کی کرسی جھادی۔ وہ مشکل گھنٹوں کو سہاری کرسی کے
پاس آکر رک گئیں۔ انہوں نے ایک نظر غارت کی طرف دیکھا۔ ذرا جھجک کر بیٹھ رہیں۔ گیم ٹکس ہونے
سے پہلے کھانا سرو ہو گیا۔ بے بے نے تمام ضابطے اور قوانین طاق پر رکھ کر گیم ختم کر ڈالی۔
"چلو
کی بہ اہمیت تھی۔

"کھانا لگ گیا ہے۔" پھر اٹھا ہوا جائے گا۔ "بیٹا نے تاجدار کی سے ریکٹ اچھل دیا۔ اس نے بھی بھی بے
کی حکم عدولی کی ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی ان کا دھیان گیم کی طرف تھا ہی نہیں۔ گھنٹوں پر پڑے گئیں
کو زمین کی گھاس کو آسمان میں اڑنے والے پرندوں کو۔ انہوں نے ہر طرف دیکھا تھا۔ صرف شغل کا ک
کی طرف ہی نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ دونوں جھگڑتے تو چونک کر گیم کی طرف دیکھتیں۔

"اب بس بھی کرو۔"
وہ سست دوی سے قدم اٹھائیں عمارت کی طرف چل پڑیں۔

وہ ریکٹر شغل کا کال اٹھاتے تڑتے جھگڑتے ان کے پیچھے پیچھے



"شیریں کا خط آیا تھا۔"
بے بے نے کسانے کے کمرے میں ایک غیر معمولی وقار سے کرگیا کوئی اہم انکشاف کیا۔ خان گل کا

چچا اور کالیا ایک تیزی رفتار میں چلتا چارک گیا۔
"اور اس میں کھانا ہے مجھے ان کو لینے کے لیے فوری طور پر تیار آجانا چاہیے۔"

"یہ میں نے کب کہا ہے۔" بے بے نے تیزی سے اس کی طرف دیکھا۔



ایک دفعہ ختم کرنے کے بعد انہوں نے فرمائش کر کے بار بار سنی باجماعت خود بھی پڑھی۔ اور اس وعدہ پر ان سے جدائی قبول کی گئی کہ وہ ہر روز ان کو یہاں پر ایک نئی کہانی اور نئی نظم سکھائے گی۔ اس کام کے لیے بیڈمنٹن کورٹ کے نیچے چیمبروں کی قطار کو جماعت کا درجہ دیا گیا۔ اور وقت بعد از ناشام مقرر ہوا تھا۔ وہ کھانے کے بعد مقررہ جگہ پر پہنچی تو جماعت خانہ گل کی قیادت میں بانی میں پتھراوری تھی۔

”تم گئے نہیں؟ ہیں تو سمجھی تم کہیں چلے گئے۔“

”کہاں؟“

”مجھے کیا پتا جہاں بھی جاتے ہو۔“

وہ ہنس پڑا۔ ہاں اچانک جانا پڑا ہے بے نتیجہ رہا۔ لیکن زیادہ دور نہیں صرف شیر کی کچھار تک۔

وہ چپ ہو گئی۔ ”میں کل کی ٹیم تمل کرنے آیا تو تپا چلا۔ ساتھی بھی بدل گئے اور میری بھی۔“

”یہ کن لوگ ہیں خان گل؟“ اس کی باتوں کی ایسی عادت سی پڑ گئی تھی کہ اس نے ہنسنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

”کوئی لوگ ہیں۔ ہمارے لوگ ہیں۔ ہماری بستی کے لوگ۔“

”آپ کا مطلب آپ کے ملازموں کے؟“

”ملازم بھی ہوں گے ان میں اور آزاد بھی۔ گرجی بستی خانہ گل کے اصلی باشندے دیہی ہیں جو گورھی پر جان دیتے ہیں۔ اس کی خاطر لڑتے ہیں۔ کتنے ہیں۔ کل ہوتے ہیں نیچے ان کی بستی ہے۔“

”میں نے یہاں کے عوام کی بستی تو دیکھی نہیں۔“ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ ”میں نے سوچا یہاں صرف تھیں۔“

”آپ نے سوچا یہاں وہانیل خانہ گل خانہ اور بے رہتی ہیں۔ الا الا خیر صلا۔“

”اور شیریں بھی۔“ اس نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر گرجی نہ ہو تو آپ کی اس ادا کا مضمون پوچھ سکتا ہوں۔“

بڑا لڑنے دیکھا وہ جاکھڑا ہوا۔ غصہ میں اکڑا اور پھیلا ہوا۔ تکرار فضول تھی اور تاجن بحث کا اسے شوق نہیں تھا۔

”میرا دل چاہتا ہے خان گل میں تمہاری بستی کے اندر جاؤں۔“

خانہ گل ہچکچا کر خاموش ہو گیا۔ معلوم نہیں وہ معاملات کی کس نوعیت پر غور کر رہا تھا۔

”تمہارے لوگ میرا آنا پسند نہیں کریں گے۔“ اس نے خودی اس کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی۔

”ملا پسند یہ بات اگر کوئی ہے تو صرف اتنی کہ۔ اگر تم ان کے لباس میں ان کے درمیان جاؤ۔ جیسے ان بچوں نے لباس پہن رکھے ہیں۔ کھیر دار شلواریں خوب پھیلی ہوئی فراکیں اور اس میں ہر رنگ ہونا چاہیے۔“

”اس کا مطلب تم لوگ باہر کے لوگوں کو ہضم نہیں کرتے شاید یہی وجہ ہے جب بھی میں باہر نکلتی ہوں قیمت خان۔“

”مجھے اندر داخل ہونا ہے کتنے افسوس کی بات ہے تمہارے متعجب ہو۔“

”ہم بہر کیف جو کچھ بھی ہیں تم ہمیں منوں کی تقریروں سے بدل نہیں سکتیں۔ مزہ جو کام بھی اپنا لباس

پل لو۔

انہوں سے تسمیں کوئی بھی ایسا لباس لاوے گا۔ جو نہ سستا“ و حلا ہوا ہو گا۔“

وہ مانگتی، دھکیلتی اور زچہ لگتی۔ اسے بے سے اجازت بھی ملنی تھی۔ اور بری گل سے لباس۔

اور اتفاق سے ان دونوں کے حصول میں اسے چنداں دشواری نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس نے وہ سر اور میزوں پر ڈالنا سستی کیا اور تمہا کرپن لیا۔ بری کے اصرار پر بھی وہ اپنی باتوں کی گت نہ ہوائے۔

وہ جیسے بھی تھی۔ ایسی ہی ٹھیک ہے۔ باتوں کو برش کر کے اور جو کرنا چاہا کرنا۔ بستی کی برکت کے تیار تھی۔

بری ہاتھ میں کنگھی پکڑے اس کی پیڑھیاں ہانے کی حسرت دل میں لیے رہ گئی۔ مریم اور پردہ مند دیا کرہٹنے لگیں۔ بری کا مزاج البتہ تعلیم یافتہ گھرانوں کی طرح برداشت کا مادہ لیے ہوئے تھا۔ وہ بوجی ہنسی تھی۔

”سنو مذاق اڑاتی تھی۔ اس کے نزدیک وہ کسی اہم سیاسی مہم پر جاری تھی۔

علاقہ لباس میں سنبھل سنبھل کر پہاڑی پتھروں سے راستہ بناتی وہ اس قدر مخری لگ رہی تھی کہ خان گل اس کو دیکھ کرے تھشائیں پڑا۔

”میں اسے اگر کوئی لڑکی سا ڈھکی ہاندہ کر تمہارے شہر چلی جائے۔ تو ایسی ہی لگے گی۔“

وہ خاموشی سے اس کے ساتھ بیٹھ اترنے لگی۔

”پتا نہیں۔ تم نے کچ بولا تھا یا جھوٹ۔ مجھے شک پڑتا ہے۔ آخر شیریں وغیرہ بھی تو عام کپڑوں میں گھومتی ہیں۔“

”انہوں نے ہنسی دیکھی ہی کب سے۔“ اس نے بات کاٹا۔

”اور مت فک کرنا میں نیچے پیدل جانا پسند گا۔ میں تمہیں موٹر سائیکل پر بٹھانے کا وسک نہیں لے سکتا۔ اس گھیر وار کپڑوں کے ساتھ۔“

”ٹھیک بات بتاؤں خان گل۔“ اس نے بستی کے سمت قریب آکر کہا۔

”میں نے یہ کپڑے پہلے دفعہ نہیں پہنے۔ بہت پہلے بھی ایک مرحلہ ہمارے کالج میں کچل شہوا تھا۔

میں نے سوائی لباس پہنا تھا۔ اس میں اسی طرح شیشے لگے ہوئے تھے۔ گھیر وار کرتا اور شلوار سب میں کالج کے اسٹیج سے گزری تو میری پر ہیل نے مجھ سے کہا کہ اگر تم سوات چلی جاؤ تو یہاں شاید لوگ تم کو پہچان نہ سکیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے ہم دور بیٹہ کر کیا کچھ سوچ لیتے ہیں۔ حالانکہ اس کا خیال ہے کوئی توقع نہیں ہوتا۔ حالانکہ مجھ میں اور تم لوگوں میں اتنا فرق ہے۔ کہ تمہاری بستی کے بچے بھی انگلی اٹھا سکتے ہیں۔“

وہ اس کی گتے لگی تھی۔ معلوم نہیں اس کچلی شہر۔ سانی پر یا ناصلوں پر۔

”بستی بالکل نیچے پہاڑوں کے دامن میں گھری ہوئی تھی۔ کچی آبادیوں پر مشتمل سامنے نظر آنے لگی تھی۔ اور ان پستیوں سے بہت دور خانہ گل کے گھر کی قطع نماز جیاں اور پائند اور ادب نظر آ رہی تھیں۔ جیسے ان کی اونچائی آسمان میں سوار تھی اور کچی اور کچی لگی ہو۔“

”اس کے باوجود ہم ساتھ ہیں۔ اگر فرق ہو تو ایک درجہ ہے۔ پہاڑ ہمارے درمیان بھی حاصل ہوتا۔“

بستی کے گھروں کی چھتیں سیدھی اور سہل تھیں۔ انہوں نے پہاڑوں کی اوٹ میں ہمارے پتھروں سے اپنے تھک لور سیدھے مکان بنائے تھے۔ جو انہیں پہاڑوں جاتوں اور مردہوا سے محفوظ

رکھتے تھے۔ عام ہاڑی مکانوں کی طرح ان کی چھتیں و سطوحانی نہیں تھیں۔ اور گھر کے سامنے پھاڑوں کی دھلو انہوں میں بے شمار درخت اور پودے آگے ہوتے تھے۔ وہ جس جس گھر میں داخل ہوا۔ اس کا فقہا المثال استقبال ہوا۔ وہ لوگوں کی زبان کا انگریزی میں ترجمہ کرتا۔ ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا رہا۔ وہ محل کے واقعات سے بے خبر تھے۔ وہاں کون کون سے کون دوست ہے۔ کون سی سائز شس کے خلاف ہو رہی ہے۔ وہاں کی دنیا میں ان کے لیے کیا سوچا جا رہا ہے۔ ان کو صرف اسی بات سے دلچسپی تھی کہ کس وقت اور کس حکم پر ان کو کالوں کے لیے جان لٹانی ہے۔ ان کے گھروں میں عجیب عجیب ہتھیار تھے۔ ہر سائز اور ہر قسم کی بندوق اور گن ان کی دیواروں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے گھروں کے دروازے پر گھوڑے کی نعل لٹکی ہوئی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں کھولے ہر چیز کو تیرانی سے دیکھتی اور سرست سے خوش ہوتی رہی۔ یہ سب چیزیں اس کے لیے بالکل نئی تھیں۔ جیسے وہ خواب میں کہہ جاتا تھا۔ یہ سب کچھ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

ایک چھوٹی سی ڈیپنری تھی۔ ایک مناسب سا کھانا کھاتا تھا۔ چار کائیں تھیں اور بس۔ بستی کے لوگوں کو بڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ دو سال پہلے کسی ماسٹر کا یہاں نقل ہوا تھا۔ لیکن وہ آیا نہیں۔ کوئی استانی آئی چند مہینے بڑھا کر وہ بھی چلی گئی۔ بچوں کو بڑھنے کا بے تحاشا شوق تھا۔ لیکن یہاں بڑھا نہ والا کوئی نہیں تھا۔ اور تو تو دریاں بچوں کو قوت ان بڑھانے کے لیے کوئی عالم و سنیاب نہیں تھا۔ جس گھر کو دور دراز کے علاقوں سے بلا کر رکھا گیا۔ وہ موسم کی سختیاں اور راستے کی دشواری اور پہنچنے کی کد دہنی سے آگیا کر جاتا تھا۔

اسے خان گل روایاں سے بستی کی رپورٹ دے رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک محرک فلم چل رہی تھی۔ یہی چلتی زندگی فلم۔ اوپر سے ہمہ کر آنے والے دریا کا یہاں شیب تھا اور کتنی دور تک بستی میں باہی سیدھا اور صاف بہتا چلا جاتا تھا۔ وہ استعمال کا پانی بھی یہیں سے بھرتے اور پکڑے بھی یہیں آکر دھو تے تھے۔ وہ لوگوں سے ان کی خیریت پوچھتا۔ ان کے حالات معلوم کرنا کویا رعایا پرور تھا۔ ہاڑی مالے کے اس طرف بہت سی عورتیں اس کے لیے دست کاری کی چیزیں لائیں۔ چھوٹے موٹے تحائف آئے۔ لاقعداد افراد پر ستمل ایک مجمع اس پر رسالات کی بوجھا ڈکڑا تھا۔ مجمع کا کوئی شریف النفس کہنی ہار کر منع کرتا اور سمجھاتا۔ ایک وقت میں ایک سوال کر دیا۔ ان کو پشیمانی نہیں آتی اردو بولو۔

یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا اس میں خوب اس کا دل لگا ہوا تھا۔ اچانک مجمع میں کھسپ پھڑک پھڑا اٹھا اور اس کے دیکھتے دیکھتے مجمع نے اپنی گردنوں اور غاواروں کا رخ موڑ دیا۔ مجمع کی آنکھیں ہوتی گردنوں کے ساتھ اس نے اپنی گردن اٹھائی اور رک گئی۔

پتا نہیں دھاتی بے خبر کسے تھی کہ اس نے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نہ سنی۔

نہ سر پر اگر گھوڑا رکھنے کی آواز۔

نہ دانیال خان کا پکارنا اسے سنائی دیا۔

ظلم حیرت کدائے اس کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ لوگ گھوڑے سے اترے دانیال خان کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا تھا اور ساکت و ساکن اپنی جگہ اسی طرح جمی رہی۔ وہ کسی بہت ضروری کام سے آئے تھے۔ ان کی تیوری پر نارا تھکی کی ہلکی سی شکن بھی اور ہاتھوں میں گھوڑے کی مال۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔ انہوں نے مصروفیت سے مجمع میں حاشا کر کے کسی کو آواز دی اور کام کاج کی ہدایات دے کر اس کو نامعلوم سمت رخست کر دیا۔

اس کا خیال تھا کہ جس کام سے بھی اس طرف آئے ہیں۔ جلدی اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے لگا میں الٹ کر گھوڑے کی طرف ڈال دیں اور آہستہ روی سے چلے ان دونوں کی طرف آئے گئے۔

ان کے چہرے کی بکھری ناراضگی پوشیدہ بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ اس ناراضگی کا سبب معلوم کرنے میں بالکل غافل تھی۔ وہ خان گل کی طرف بڑھے اور جیسے سے مسکرائے۔

”میں ٹال کی طرف جا رہا تھا۔ سنا ہے رات۔ جنگل سے بھر کڑی کالی مٹی ہے۔“
”مجھے بھی یہیں کسی نے بتایا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ نواہ ہے۔ اگر واقعی انہوں نے سارے درخت کی شاخ کٹی ہے۔ تو ہم چھوڑیں گے۔“
”اس نذر تہہ مزانی سے حاصل؟“ انہوں نے ٹھہر کر سکون سے کہا۔

”میں حالات معلوم کر کے یہاں آگیا۔ لوگوں سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا تم بچے آئے ہو۔“
”یہ بہتی دیکھنا چاہتی تھیں۔“

انہوں نے گفتگو میں سے اس کو بے کار شے کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔ خان گل کے مخاطب کرنے پر بھی انہوں نے ایک غلط نگاہ اس پر نہیں ڈالی۔
”تم ان کو چھوڑو اور آؤ ہم ساتھ ہی چلتے ہیں۔ گھوڑا لے جاؤ۔“
”میں خوب چلی جاؤں گی۔“ اس کے منہ سے یہ سادہ نکل گیا۔

انہوں نے ایک لڑکی نظر اس پر پڑی جیسے اس ساری مشکل اور مصیبت کی زندگی تو تھی۔ اس کی وجہ سے ہی تو یہ تنگنا شروع ہوئے والا ہے۔ ایک توہین آمیز نظر اس پر ڈال کر وہ اپنے احکامات کی تعمیل کے لیے خان گل سے مصروف کار ہو گئے۔

”چلیے۔“ خان گل نے معذرت سے کہا۔ ”آپ کو بہت اچھی طرح سمجھاتے لیکن افسوس کوئی ایمر جیسی ہو جاتی ہے۔“

”کوئی بات نہیں، آپ لوگ جانیے میں خود چلی جاؤں گی، راستہ سامنے نظر آ رہا ہے۔“

”راستہ بہت لمبا ہے شاید آپ کو انداز نہیں ہوا۔ اگر گھوڑے پر۔“

”میں گھوڑے پر ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ اس نے خندی کے بغیر کہا۔

دانیال خان نے اس کو گھورا۔ ”میں اور کوئی کام بھی ہے یا صرف آپ کی ہش و ہری کا احترام کیے جانا

بے جا خان گل۔ ان کو اوپر چھوڑ کر آؤ، جلدی آنا۔ وہ پلٹ کر اپنے پیچھے خاموش کھڑے شخص سے مخاطب ہو گئے تھے۔

بے جا خان تو بہن کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ مرے مرے قدموں سے خان گل کے تعاقب میں چلنے لگی۔ گویا کسی کی عزت اٹانے میں اس شخص کو لٹے ہیں۔ اس کو ان کا یہ رویہ اندازِ تحکم اور تکبر کا سرا سرا لالچہ بھی کچھ برا لگتا۔

بیشہ دانیال خان کی غیر موجودگی میں جھلائے ہوئے خان گل نے بھی تابعداری سے ان کے ہر حکم کو سنا تھا۔ اور جلدی آنا جیسے مشکوک لفظ پر احتجاج کیے بغیر اور کسی ناراضگی کا اظہار کیے بغیر وہ اس کے حکم کے سبب اس کو واپس پھوڑنے جا رہا تھا۔

”میں جلی جاؤں گی خان گل۔ تم چلو۔“

بہاری کے موڑ پر جہاں پہلی بار ان کی اوٹ میں چلائی تھی۔ وہ رک گئی۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے خوش خلقی سے مہمان نوازی نبھائی۔

”تم میری وجہ سے اپنا نقصان مت کرو۔“ وہ دونوں ہاتھ سے گھر نبھاتی اترتی اور نکل گئی۔

اس نے پہلی بار ان کی چوٹی سے ہاتھ لگائے رک کر دیکھا۔

اس کو خان گل کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ اونچی پہاڑیوں سے بہت نیچے وادی میں گھوڑے کے پاس کھڑے شخص کو اس نے اچھی طرح پہچان لیا۔ وہ دونوں ہاتھ پشت پر رکھے گردن اٹھائے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کوہ اس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن اپنی ذات سے اس کی ناگوارانی کو یہاں تک محسوس کر سکتی تھی۔ بہاری کے اسلگے منوڑے کو دھکی کر اگلے طرف بھاگ گیا تھا۔ بہت تھک ہو گئی۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کبھی کبھی ہم بندی سے بچنے کی طرف دیکھتے ہیں تو پستی میں کھڑے لوگ ہمیں حقیر بنے ہوئے لگتے ہیں۔ لیکن تقدیر یہ ہے کہ آپ جلدی کر کے کھڑے لوگوں سے اہم ہیں۔ اس کو اپنی ذات کی حقیر نگاہ میں کسی لیکن اس کے پاس اس کا کوئی مل بھی تو نہیں تھا۔ اس کو یہاں وہ کریمیں کھا چل کر بورا دست کرنا بلکہ خور کو اس میں قسم کرنا تھا۔

اس نے کمرے میں کھس کر کپڑے بدلے۔ لیکن پر کپڑے ہو کر بستے پانی سے آنکھوں کو چمکائے کی بھرپور کوشش کی۔

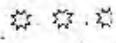
یہ اولین دور کی اولین ہنگامہ تھی۔

ایک ہی سمت سے پے در پے ہونے والی توہین کا اسے سامنا کرنا ہی ہو گا۔ آلے والے وقت کے لیے خود کو ہمیشہ بہاری سے تیار رکھنا چاہیے۔ ہر پرول نہیں کہ تو کمری پھوڑ کر بھاگ جائے۔

وہ کم بہت نہیں کہ سخت ست سکتی رہے۔

اور وہ اتنی بدخبر نہیں کہ جہاں ملازمت کرتی ہے وہاں تاہم توڑ گستاخوں سے ماکوں کے دانستہ کہنے کرے۔ اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اس چار دیواری میں اس کا جتنی مرتبہ بھی الگ سے سامنا ہوا اپنی ہنگامہ قابو میں نہ رکھ سکی۔ اس نے منہ تویہ سے رگڑا۔ بالوں پر برش پھیرا اور خاموشی سے بے بے کے سنگم روم میں جا بیٹھی۔

آئندہ زندگی میں اس کو ہر حال میں خود کو مضبوطداشت کی سزا دینی پڑے گی۔



”بڑی جلدی واپس آگئیں۔ خیر ہے نا۔“

”جی۔“ وہ دونوں بڑے موزے پر غرق ہوتے مختصر ”ہوئی۔“

”دیکھ لی سکتی۔ اور سنا ہے تم یہاں کالیاس پس کر گئی تھیں۔ مجھے مہم نے بتایا۔“ وہ خوش خلقی سے مسکراتی اس کا جائزہ لینے لگیں۔

”تم نے مجھے دکھایا ہی نہیں۔“ قہقہہ ”تم کو اچھا لگا ہو گا۔ تمہاری رنگت بھی ہمارے لوگوں کی طرح ہے اہلی اہلی صاف شفاف سیدھے سیدھے عین نقوش۔ لوگوں نے کیا کہا۔“

وہ چپ سی رہ گئی۔ لوگوں نے جو کچھ کہا تھا وہ بے بہرہ تھا۔ وہ لحد بھر کو بھی دانیال خان کی اسے اوپر بڑی فقارت بھری نظروں کو بھول نہیں سکتی تھی۔

وہ شاید اس سے یہ کہتا چاہتا تھا کہ کوئی نامور نے پر لگا کر موزہ نہیں دین سکا حالانکہ وہ خواہش کے باوجود اس کو کچھ نہیں سمجھا سکتی۔

”نئی لہجہ اس کی چہا مضموع تکبر کی اس طرف آئے تو وہ اپنی صفائی پیش کرے۔“

”ہاں بے بے۔“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”جلدی دیکھ لی۔“

بے بے نے ایک نظر اس کے بدلے بدلے موزہ کی طرف دیکھا۔

”تھک جاتی ہو۔“

”جی۔“

”آرام کرو۔“ وہ جیسے اشارے کی منتظر تھی۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی۔ پری دوا کی کا پونچھنے لگی تھی تو اس نے اس کالیاس واپس کر لیا۔ یہ کپڑے جوات بلا مبالغہ ہے حد بہت آئے تھے اور جن کو سننے کی تمنا اس کے دل نے کتنی مرتبہ کی تھی تو ہر بے جانوں کی طرح گھٹاؤنے اور خوفناک لگ رہے تھے۔

وہ کسی کے پیچھے کسی کو پہلے کھس میں جھٹلا ہونے کو تیار نہ تھی۔ ہر شخص اپنی ذات کے حوالے سے خود اعتماد ہو آتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپے سے گھٹنے میں دوسروں کا اعتماد زیرہ کرے راست کے کھالے پاس نے حذر سے پیش کی تو اسے پتا چلا کہ اس کوئی کراؤ سنس آگیا ہے۔

خان گل بغیر پتے بڑی دیر سے کس عائب تھا۔ کتنی کہ قیمت خان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ان دونوں کراؤ سنس کے لیے دانیال خان سے روبرو کیا تو پتا چلا وہ شام سے آفس میں نہیں ہیں۔

پری دوا کے گلاس کے ساتھ ہی کمانی لے کر آئی۔

وہ جاتی تھی وہ کہاں ہو گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا وہ جہاں بھی ہیں اسے غیر محفوظ نہیں۔ لیکن بے بے کی ہجائی نے اس کے دست پر رکھ دئے گا سارا پروگرام کینسل کر دیا۔

وہ صبر سے آگئی۔ باؤں میں چپل ڈالے اور بے کی اسے سہارا ہٹ کو ان کے پاس جا بیٹھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ رگڑنا چاہیے کہ نہیں۔ ان تیز کی گشتی کی واحد گواہ وہی تھی۔ وہ بے بے کو بتا رہے تھے خاموشی سے وقت کا انتظار کرے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنا منصوبہ بھول تشریش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ جہاں

وہ محفوظ بھی ہیں۔ کتنی مرتبہ اس نے گھٹ کے قریب متحین ہندو قبیلے کے گرو کو جھانک کر دیکھا۔ آسمان کی طرف تخی ہندو قبیلے کا پر لٹکے ہوئے ہمارے سنے اس کو کتنے اطمینان کا احساس دلاتے تھے۔ لیکن آج اس کو احساس ہوا کہ وہ کتنے بے سہارا محسوس تھے ورنہ ان پر ان ہیں۔

رات کے بارہ بجے اس کے اعصاب بے بسی کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر ناکارہ ہو رہے تھے۔ قریب تھا کہ وہ جھگڑنے والے وقتے کا سارا اچھا بھلا بچو ڈوڑی کہ اچانک برآمدے میں شور مچا دیا۔

وہ تینوں شانے سے شانہ ملاتے ایک قدم اندر کی طرف آ رہے تھے۔ کسی نے غلام! ان کو بے بسی کے ہراساں ہونے کی اطلاع پہنچا دی تھی۔ بے بسی نے اٹھ کر راداری کی طرف دوڑنے کی کوشش کی لیکن شدید اعصابی دباؤ کے نتیجے میں ان کے گھٹنوں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ شیشوں کے ساتھ لگی ماسک سے ہنسنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ان تینوں نے اکٹوں میں رک کر کچھ بات کی۔ قیمت خان واپس مڑ گیا۔ خان کل سیدھا چلا اپنے کمروں کی طرف چلا گیا تھا۔ ایک دو گھنٹوں کے وقفے کے بعد وہ مہر کا گروانیال خان نے اندر قدم رکھا۔ ان کی پہلی نگاہ شیشے کی کھڑکیوں سے لگی بیلا پر پڑی۔ وہ ٹھنک کر رک گئے۔ غالباً ان کو اس سے احترام کی رتی برابر توقع نہیں تھی۔

توجہ کے بالکل خلاف انیال خان کو دیکھ کر بے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

وہ تیزی میں چلتے ان کے گھٹنوں کے نزدیک ڈالو ہو کر بیٹھ گئے۔

”کیا ہوا بے بسی؟“

”بے بسی کی بخت کی زندگی کا فائدہ ہی کیا ہے بے بسی کو کچھ ہو جائے۔“

”ہائیں ہائیں۔“ انہوں نے بے بسی کے بھریوں بھرتے کاچھے ہاتھوں کو سہولت سے اپنی مٹھی میں دبا لیا۔

”ہم نے آپ کو پریشان کر دیا ہے۔ نا بے بس اور اسل میں اور خان گل مڑی بختیار چلے گئے تھے۔ آپ کو تباہ عاطف کئے ہوئے مورخ تاش لے بیٹھا۔ وقت گزرنے کا یہ نہیں چلا۔ اب میں اس نے خان گل کو بطور پریشان رکھ لیا ہے۔ وہ ان کے قیمتی سلک کے نازک دپٹے سے آنسو پونچھتے پونچھتے بولے۔

”ذرا فنی فلی ہمارے ہے بے بسی۔ لیکن پتا نہیں چلا اتنی رات ہو گئی۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔“

بے بسی نے اپنے بے ساختہ رویے پر شرمندہ سی ہو گئیں۔

”مجھے کیا پتا تھا خان گل ہمارے ساتھ ہے۔ میں نے سوچا وہ توں بنا تھیں۔“

”آپ نے سوچا ہم دونوں ہی شاید لڑ بھڑکے ہیں یا وہ ایسا کر سکتے ہیں بے بسی؟ وہ مجھ سے چھوٹا ہے

آپ جانتی ہیں میں اس سے نفرت نہیں کرتا توں۔“

”چھوٹو۔“ انہوں نے اس کے کندھے سے ہتھ پٹا ہے۔ ”عاطف کی بیوی تو بہت خاطر کرتی ہے۔ کھانا

وہ کھایا؟“

”ہاں۔“ وہ چوہہ گئے۔ ”کھانا تو کھالیا۔ ظاہر ہے۔“

”اور موٹریں تو گھوڑی میں تھیں۔ تم کس چیز پر گئے؟“

”گھوڑوں پر۔“ انہوں نے بے ساختگی میں کہا۔

وہ زیادہ دیر تک رک کر شاید بے بسی کا سامنا کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ گرم شال میں لپیٹ کر انہوں نے اپنا سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔

”آئیے آپ کو کمرے میں چھوڑ آؤں۔“

وہ اسی طرح راداری میں چلنے والی خوبصورت شیشوں والی کھڑکی کے پاس دم بخودی کھڑی تھی۔

”بیٹا! ہمیں آرام کرو۔“ بے بسی نے رواداروں سے کہا تھا۔

اس کے نزدیک سے گزرتے دانیال خان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا ان کی نگاہوں میں مشکور

لنگھوں کا ایک مایہ سالر لیا۔ چہرہ آگے کمرہ گئے۔

☆ ☆ ☆

گڑھی کے حساب میں تو صبح ہونے والی تھی۔ یونکہ رات کا بیشتر حصہ گزرا تھا لیکن اس کے سونے کا وقت ابھی شروع ہوا تھا۔ وہ بستر لیٹ کر سوچتی رہی حالانکہ وہ فوراً سو جانا چاہتی تھی۔

دانیال خان نے اپنی طور پر کسی مصلحت کے تحت بھوٹ بولا ہے۔ وہ مصیبت کیا ہو سکتی ہے۔ وہ بھی

بستی والوں کی طرح ان مصلحتوں کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو دن بہت روشن روشن تھا۔ رات والے واقعے کی بزم کی کسی حد تک دھل چکی

تھی رات دیر تک جاگنے رہنے کے سبب صبح اٹھنے بھی مشکل رہی اگر لیکن اس کو سرگیت اٹھنا تھا۔ یہ اس

کے باب کا گھر تو نہیں تھا کہ جب تک جی چاہے بول پڑا کر سوتی رہے۔ اول اس کا بیٹا منشی بیارٹھ اس کا

انتظار کر رہا تھا۔ وہ گڑھی بستی کا دور اس دور انصاف مکمل کرنے کے لیے آج سے مناسب دن اور ہوتی

کیا اسکا بے روشن اور چمکدار دھلا تھا۔

وہ نماز کو کرتا رہا ہو کر ہر آئی تو چند لوگ چند بیگلات کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔

نمبر دن پری بھی اے بے بیے ناشائستہ کرنے کے سلسلے میں کشمکش کا انتظار کیا تھا اور کھانا کھا کر

کریں دو سرے نمبر پر پروشہ تھی۔ ہر وار کا پیغام تھا۔ آپ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر لایسری میں

آئیں۔ وہ سی ہو گئی۔

سارے منصوبے سارے پروگرام ساری خوشی سوار کے ایک پیغام نے ملایا میٹ کر دی۔

وہ دانیال خان کا سامنا کرنے سے بہت کھڑکی تھی۔ وہ ٹھنک آمیز رویے میں بات کرتے اور مطلب کی

دھیماں بکھیرتے رہتے۔ اچھے اچھے سوالوں میں ابھرا کر وہ سوں کو زیر کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا۔

لیکن اس کے پاس کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اسے ہر کیف جانا تھا۔ بے بسی کو قطعی فراموش کر کے وہ آہستہ

قدموں سے ان کے حصے کی طرف روانہ ہونے لگی خاموش اور طویل راہداری میں طرف ان کے کمروں

کو مڑتی تھی۔ ان کے استعمال کے تین حصوں میں سے بار بار وہ ہر حصے میں ان کے ہاتھوں رک ڈالنا چکی

تھی۔ یہ آخری حصہ تھا۔

لاہور کی کڑی روش کھاتی یہ طہیروں پر تیز قدم اٹھاتے اس کا دل نور زور سے دھڑکتا رہا۔

وہ اتنی کم حوصلہ اور بڑول تو بھی رہی نہیں تھی لیکن دانیال خان کا سامنا کرتے ہی ان کی صورت کی

تندی اور تخی اس کو خفزدہ کر دیتی۔ کتنی مرتبہ وہ سوچتی دانیال خان کے جملوں کا ایک ہی علاج ہے کہ ان کو

نابز توڑ جواب دیئے جائیں لیکن پیشہ کی چلتی رہنے والی زبان ان کے سامنے ٹھنک ہو جاتی لنگھوں کے

ذہن میں طاق میں اگر رک جاتے۔ پھر وہ جھٹلا جھٹلا کر جو کچھ کتہی رہتی وہ ان کی لچکی کا سبب بنتی تھی۔ وہ جو کتہی میں اچھڑ کر وہاں سے چلی آتی تھی۔ کیا کریں گے جان سے تو ہمیں مار دیں گے اگر کتہی کریں گے تو وہ موم کی نہیں بنی۔ لیکن لا پیرری کے نیم واپس عظیم الشان دروازے کے سامنے وہ اس طرح سارکت کھڑی تھی جیسے سجاوٹ کے لیے بطور مجسمہ لگائی گئی ہو۔ لا پیرری فلائیر کے ذریعے مختلف حصوں میں تقسیم یہاں سے دکھائی دے رہی تھی۔ عین مرکز میں کھڑی کے آتش دان کے سامنے آرام کرسی میں نیم درازہ کسی کتاب میں محو تھے۔ آگ کی طرف رخ کیے اس سے بالکل بے نیاز۔

وہ بے آواز قدموں سے بھاری قالین پر پاؤں بھر رہی خاموشی سے ان سے ذرا فاصلے پر اگر رک گئی۔ وہ اپنی کتاب میں اتنے محو تھے کہ انہوں نے اس کے سہمے قدموں کی رکی رکی سی آواز بھی نہیں سنی۔

وہ کتہی در کھٹکھٹ میں خود سے جھگڑتی رہی۔ اس کو آواز دے کر اپنی مصیبت بولا لے اس کے چونک جائے یا اچانک اس کے اپنی لا پیرری میں ہونے کا احساس کرے۔ اچانک انہوں نے کتاب سے سر اٹھایا اور گردن ہٹا کر اپنی مخصوص بھاری اور گھیری آواز میں جھٹلا کر کہا تھا۔

”آؤ آخر آپ بیٹھتی کیوں نہیں۔“ مجھ بھر کے لیے گردن تھما کر انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”یا کوئی نگہ یہاں آپ کے شایان شان نہیں۔“ ان کی آنکھوں میں لپکتے نظریے سے کوئدے اس کے لیے اب اجنبی نہیں رہے تھے۔ ضرور کوئی بات ان کی خلاف مرضی ہو گئی ہے۔ اور اب جب تک وہ اپنی ضد کے سامنے اس کے نتیجہ نہ دیکھیں تو ان کو سکون نہیں آئے گا۔ اس کا جی تو چاہا وہ ان کے نظریے فقروں کا جواب سخت مست فحشوں سے دے دے لیکن یہ بہت مشکل برگ تھا۔ وہ ان کی چھت کے نیچے ان سے احسان فراموشی کے موز میں نہیں تھی۔

اس نے اصرار اور دیکھا۔ موٹے سے نو موٹے کے کشن کے اسٹول پر بیٹھی وہ اپنا مودا سنبھالنے لگی۔ وہ اپنی کتاب کے کئی اہم حصے میں مصروف تھے۔ ان کے چہرے پر بکھری۔ ان کی مخصوص درشتی جو غالباً ”ان کی طبیعت کا خاصہ بن چکی تھی اس طرح داخل کو لے کر رہی تھی۔ وہ کتہی در کھٹکھٹ رہی۔ کوئی سوال ہو۔ کوئی جواب ملے۔ آخر اس بھانکناٹے میں وہ کب تک اور کہاں تک انتظار کرے۔

”آپ نے مجھے بلایا تھا؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا ”مجھے کچھ اور بھی کام ہیں۔“ کتہی در کے بعد انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ بہت دیر تک انہوں نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔ ”واضح آپ کی مصروفیت کا تو میں بھی قائل ہوں۔“

ان کا غصہ اوج اوجہ اس کو کھیلانے دے رہا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور جو کرنا چاہتے ہیں کہہ کیوں نہیں کہتے اس نے مباحثہ پسند کرنے کے بجائے خاموشی پسند کر لی۔

”لیکن جس موضوع کے لیے میں نے آپ کو بلایا ہے وہ آپ کی مصروفیت سے جدا نہیں۔ میں اس کو کویشالی کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سلسلے میں کوئی چیز رفت نظر میں آ رہی۔ میرا مطلب قابل ذکر قابل تعریف یہ کتاب ۳۴ انہوں نے دستک دینے والے انداز میں کتاب کو ہچا کر بتایا۔

”یہ کتاب اندرونی آرائش کے سلسلے میں ایک بہترین کتاب ہے۔ علاوہ ازیں اس موضوع پر میرے پاس اور ایک شہادت موجود ہے۔ اگر آپ کو کتابوں سے دلچسپی ہو۔“

ایک ڈرامائی وقفے کے انہوں نے نظریں آگ پر گاڑے گاڑے سنجیدگی سے کہا۔ ”بہتر ہے ایک پارٹی ہمارے اخوت کے درختوں کی خریداری کے لیے اصرار رہی ہے۔ ہمارے منصوبوں میں ڈرننگ ٹیبل اور سائز ٹیبل شامل ہیں۔ لیکن اس پارٹی کو دیر سے دیر کروانے کی میری خواہش مجبوری یہ تھی کہ آپ کو اپنے پیش نظر کر کے وقت دے مری کہنی کو بے تحاشا متاثر کرنا پڑتا ہے۔ وہ اخوت کی لکڑی سے زیادہ گھر۔ اس گھر میں اس کی عزت افزائی اس کی ڈینگ کو زیادہ در نظر رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی سوات میں ایک سے ایک اعلیٰ اخوت موجود ہے۔ میں پیچیم سے اس کو لے کر گزری نہیں خان تک پستول تو یہ تھیلے چند نازک نکات پر ساتھ والا ہمسایہ بولس پارٹر کو لے اڑا ہے اور میرے اپنے گھر میں کوئی قابل ذکرات نہیں ہو سکی اس کے کہ ہمسائوں کا ایک کمرہ وی ڈیکوریٹ ہو گیا ہے۔ اور سامنے والی زمین پر بڑے مشین گورنمنٹ بن چکا ہے۔“

وہ سرخ پڑ گئی۔ اس کے پاس کہنے کو الفاظ کے ذخیرے ختم ہونے ہی تھے۔ وہ غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ وہ واقعی سستی اور کھلی کامرہ کرتی رہی۔ مناظر کی فراوانی اور بے پناہ کی بے تحاشا محبت نے اس کو کلام سے دور کر کے کچھ تن آسان سا بنا دیا تھا حالانکہ وہ بہت سخت جان تھی اور اس ارادے سے آگے بھی نہیں تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ اس نے دلی بی بی آواز میں کہا۔ ”میں اس پر مطلب نہیں۔ آپ کی زندگی پر آپ کا اپنا پورا حق ہے لیکن ہم اپنی زندگی سے اپنے کام کاج کے حصے چھین کر لیتے ہیں آپ بھی اس نامم شہر کر بیٹھے۔ تو مجھے سے تین بیٹے تھک دس سے چار۔ جو وقت اور جب بھی آپ کو مناسب لگے لیکن اس وقت آپ کو کام پر ہونا چاہیے۔ لا پیرری سے۔ مجھ سے بلکہ جہاں سے بھی آپ کو مدد ملے وہ حاصل کریں۔ اور اس کے بعد آپ کی اپنی مکمل زندگی ہے۔ آپ کو کم کم کیلے ناش کھیلے، تہمتی میں گھومے پھریے۔“

وہ اسی سنگین اور تھوڑی آواز میں توری پر ہلکی سی ٹھنک ڈالے کچھ دیر خاموش رہے۔ ”مور غالباً آپ کو فنیس ڈریس شو سے بھی دلچسپی ہے، ہر کیف یہ کسی بڑے شہر کی لانگ ایجنج نہیں۔ یہاں لوگ کچھ بھولی بھولی باتیں بھی ہوتے ہیں اور باتیں بھی بناتے ہیں۔“

”مجھے تو کوئی پروا نہیں۔ اور اوقات کار جو بھی آپ مقرر کریں مجھے سوٹ کریں گے میں ابھی سے کام شروع کر اؤں گی۔“ وہ اسٹول پر دھنسی بے پروائی سے ہاتھوں کو دھنسی بولی۔

”آپ یہ کہہ سکتی ہیں آپ کو برا نہیں۔ واقعی آپ بہت لاپرواہ ہیں۔“ انہوں نے اٹھ کر کھڑکی کے دونوں طرف کے پردوں کی ڈوریوں کھینچ کر کمرو روشن کر دیا۔ ”خدا کرے آپ کی یہ لاپرواہی لوگوں کی جان بچاتی رہے کسی کی جان نہ لے لے۔ تو آپ آج سے کام شروع کر رہی ہیں۔“ وہ اب سادگی سے مسکرا رہے تھے اور مسکراتے سے ان کے لمبے کا زہر کس جا چھوٹا تھا۔ ”اور جب آپ کا کام ٹھیک کے قریب ہو جائے تو آزارہا کر مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔ تاکہ میں اپنے ہمسائوں کو مدعو کر لوں۔“ وہ حکم کی قیاس میں خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جی جلدی نہیں ہے۔ بے شک آپ چائے پی لیں۔“ انہوں نے زالی کو ملکا سا دھکیلتے کہا۔ زالی نے کر آنے والا شخص اس کی تک اس طرح موب کرنا تھا۔ اس نے بیٹھو میں آہٹکی سے دانیال خان سے کچھ کہا تھا۔

”دیکھو؟“ دانیال خان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ نے ناشتا کیا نہیں کیا؟“

اس کے جواب میں طویل خاموشی کو ملازم نے اپنی پشت کے بہارے سنبھالا دیا۔

”ہاں لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ناشتا کیے بغیر پورا دن گزرتا ہے۔“

وہ پھر کچھ بولا تھا۔

”ہاں ہاں کہہ دیتا ہے۔ وہ ناشتا کر لیں گی۔ تم لے آؤ۔ ناشتا۔“ وہ تیزی میں مڑ کر چلا گیا۔

”میں ناشتا نہیں کرتی۔ اور ویسے بھی میں اپنے کمرے میں کھاتی ہوں۔“

”ناشتا نہ کرنا اور بات۔ میرے ساتھ نہ کرنا اور بات۔ جیسے آپ کی مرضی ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”بہر گف تب ناشتا کر لیجئے گا۔ کیونکہ میں بے بے کے سامنے طویل وضاحتوں سے بہت خوف کھاتا ہوں اور بات بات کرتے۔“ انہوں نے دروازے کی چوکت پر اس کو جاتے جاتے پکارا۔

”یہ کتاب لیتی جاسیے۔“

وہ خاموشی سے لپٹ کر آئی اور ان کی کتاب اٹھالی۔ ”مختصر ناول“ وہ تیزی میں مڑی۔

”ایک اور بات! انہوں نے اس کے اٹھتے قدم روک دیے۔

”آپ نے جو کچھ ڈیکورٹ کر لیا ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔ لگتا ہے اس موصوع پر آپ کی معلومات بہت اچھی ہیں۔“

”مختصر ناول“ وہ تیزی میں سرخیاں نیچے اتر گئی۔ ان جیسے خشک ہارغ آدمی سے تعریف کے دوپول بھی ایک عجیب چیز ہیں۔

بے بے کے ہزار منع کرنے اور خان محل کے پردہ ہاتے رہنے کے باوجود وہ بہت سنجیدگی سے کام پر جت

گئی۔ کبھی دانیال خان مگر نہ تو ایک دو تھوڑی قدرے بول کر اس کا حوصلہ بڑھا دیتے۔ یا مسلسل کام نہ کرتے رہنے کی ایک سنجیدگی سے تلقین کر کے اپنی پچھلی تقریر کو بھلا دیتے۔ وہ لمحوں کے لیے ٹھہرتے اور محل

دیتے۔

وہ دن رات مصروف رہتی۔ وہ دانیال خان کے لیے مزید باتوں کی منجائش نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

اس دن جب وہ بہت سنجیدگی سے فریج کی ترتیب کے سلسلے میں دوسرے خان محل کے لیے ٹھہرتے اور محل

اس نے آتش دان کے پاس ٹھہرتے بے بے سے اڑنا سنا تھا۔

وہ خان محل کو حسب عادت شدید اندیشہ جھڑک رہی تھی۔

دانیال خان مڑھی سے واپس جا رہے تھے اور چونکہ وہ ایک طویل مدت کے لیے مڑھی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں لہذا خان محل کو اپنی ذمہ داریوں کا اچھی طرح احساس کرنا چاہیے۔

لہذا نگ چیز کی پشت اٹھ میں قہارے بلا سامن ہی رہ گئی معلوم نہیں میں اندر کسی کوشے میں اس

لگایا۔ کچھ خالی خالی ہو گیا ہے۔ آخر تو ان کو جانا تھا۔

بے بے نے بھی بتایا تھا وہ اپنی ایک گمشدہ لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ اور اب جبکہ ان کا پاؤں ٹھیک ہے اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہیں تو کیا ہر بے ان پاؤں سے چلتے دو اپنی لڑکی کو ضرور ڈھونڈیں گے۔

اور اس مسئلے سے اس کا کوئی تعلق ہونا بھی نہیں چاہیے۔ وہ یہاں صرف نوکری کی تلاش میں آئی ہے۔

زندگی کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ کھوئے نہیں۔ اس نے کرسی سنبھال کر اپنا راستہ بچنے کی کوشش کی لیکن لمحہ بھر کو لنگا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آگیا ہے۔ بے بے باہر سے آنے والے کی خوش

دل سے پذیرائی کر رہی تھیں۔

بے بے خان محل دانیال خان۔

ہر چیز آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی اور۔۔۔

دروازے میں ایستادہ دانیال خان حیرت سے ایک ملک اس کو دیکھ رہے تھے۔

اس نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ آنکھیں بول بے موقع جھپک کر اپنی رسوائی کا سبب بنیں گی۔ اور وہ

فحش اس کے سامنے ہی تو کھڑا تھا۔ دروازے کی چوکت میں کسی ساکت تصویر کی طرح جما ہوا۔ اپنی ذہن اور حیرت لینے والی کشادہ آنکھیں اس کی غم آلود سی آہٹکی کرتی پلوں پر مرکوز کئے۔ جیسے ان نگاہوں کے

سامنے بھین، بے بے کی کیفیت کا کوئی مظہر ترتیب سے گزرا ہوا ہو۔ بے بے آنے والے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ اسی طرح آتش دان کے قریب کھٹے سکڑے خان محل پر برس رہی تھیں۔

”دانیال خان چلے جائیں گے تو یہاں کے جھگڑے کون نمائے گا؟“ اور کون جانے وہ کب واپس آئیں۔ دو مہینے چار مہینے ان کا کیا ہے۔ یہ تو شاید پاؤں کی جھجوری بھی ان کی۔ یا اور کوئی بات۔ ورنہ وہ اتنا

عجز نہ کر سکتی کہ کئی کمال ہیں خان محل۔

انہوں نے خان محل کی طرف سے جواب نہ دیا کرکون کھرا کر اس کو کھوجا۔ لیکن وہ جواب دینا بھی کیسے۔

وہ ہوتا تو جواب کی گرفت میں بھی آتا۔ وہ غالباً دانیال خان کے کمرے میں قدم رکھتے ہی غسل خانے سے باہر کھسک گیا تھا۔

بے بے کی گھومتی نظرس دانیال خان برنگس تو وہ شرمندہ ہوئے بغیر نہیں دیں۔

”خمس دیکھ کر کھانا لیا۔ بہت شرمناک لگا ہے۔ تم اس کی اصلاح کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے۔“

”آپ کے بقول تو میں مڑھی کی طرف بھی دھیان نہیں دیتا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بے بے کے پیار

گھٹنوں کے نزدیک سٹپا پر بیٹھ گئے۔ ”پورے پر بھی دھیان نہیں دیتا۔ بلکہ کہیں بھی دھیان نہیں دیتا۔“

حالانکہ سب طرف مڑھی توجہ ہے۔ ہر جگہ میرا دھیان ہے۔ اور آپ سے یہ کہنے کو دیا میں کہیں

جا رہا ہوں۔“

ان کی طبیعت کی یہ چو بھالی اس نے پہلی دفعہ ہی دیکھی تھی۔ وہ بے بے کو دیکھ کر عیش چھوٹے بیچ کی

طرح اپنے لانا فحوائے لگتے تھے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے بے بے ان کا کتنا ہی احترام کریں نہ کرتی

ہوں۔ ان کے لیے وہ لاڈلے سے بگڑے بیچے تھے۔ انہوں نے ایک دم لپٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ

خاموشی سے دیوار کے نزدیک لیٹ شڑ کے پاس خاموشی اور سنجیدگی سے ان دونوں کے التفات کا جائزہ

لے رہی تھی۔ ان کو اپنی طرف پھرتا دیکھ کر اس نے آنکھیں چمکائیں۔ یہ ایک ذاتی سامنا تھا۔ اور غالباً

اس میں اس کو دلچسپی لینے کا حق بھی نہیں تھا لیکن وہ فطرت کی سچائی سے مست کم آنکھیں پھیر سکتی تھی۔
 ”آپ تشریف رکھئے گا۔“ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔
 اس نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس پر عادتاً ”بس نہیں پڑے تھے۔ طفر
 کے کاری تیر چلا کر اس کو چھٹی نہیں کر رہے تھے۔ وہ بیٹھے کے لیے اوجھڑا کھڑے ہوئے۔ اس کی تلاش میں نظریں
 گھمائے گئیں۔

”اگر آپ آج پہلا۔“ بے بے نے خوشی خوشی اس کے لیے جگہ تلاش کی۔ ”اگ کے پاس۔“
 پہلا اپنی تنہائی برقرار رکھے بے بے کے نزدیک بیٹھ گئی۔ وہ اس کے بیٹھے ہی اپنی سنی پر دوبارہ بیٹھ
 گئی۔

”میں آپ کے لیے خوشخبری لایا ہوں۔ بد نے علی خان رات آیا تھا۔ شیریں آ رہی ہیں۔“
 ”اے میں آئی۔“ بے بے نے بے چینی سے سر ہول ہاتھوں میں تھام لیا۔
 ”اے میں کہوں۔ ان کو مست راست ان کے ساتھ ہیں۔“

میں تو چاہتی تھی خان گل ان کو لینے چلے جاتے لیکن ان کی تو ذرا ریاقت پر تو ہن ہو جاتی ہے۔“
 ”اگر وہ خود ابھی جا نہیں گئی تو کوئی ہرج نہیں۔ راستے بالکل محفوظ ہیں۔ اور ویسے بھی وہ پیدل تو نہیں
 آ رہیں۔“ بے بے کو کچھ گھٹنا چاہتی تھی لیکن بیلا کی طرف دیکھ کر چپکے ہو رہیں۔

وہ کسی ہی بیٹھی تھی ساری باتوں سے بے نیاز اور لا محنت۔ شکر وہ وہ غیر اختیاری لمحہ بغیر حساس کے
 گزر گیا اور اسے اپنی نظروں میں سرخو کر گیا۔ وہ نہ دھچک پڑے کو بے تاب برسی آنکھوں کو جتنا مرضی
 سزا دے لیتی ہوئی گناہ نہ ہوتا۔

”ان کے لیے کمر کا بندوبست کرنا ہوگا۔“ بے بے نے موضوع بدلے پوچھا۔ ”وہ بلاغ کی طرف
 والے ٹھیک رہیں گے؟“

”کوئی سے بھی کوئی نہیں۔ وہ گھر کے اپنے لوگ ہیں لیکن سامان آ رہے ہیں۔“ ان کے لیے کی اپنا حیات
 اور آنے والوں کے لیے ان کی جذباتی سی بے کابی پہلا سے بھی نہ رہ سکی۔ اس نے لمحہ بھر کو دانیال خان کی
 طرف دیکھا۔ ان کی طبیعت کی چونچالی اور شدت کی وجہ سے اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

”میں جا کر کمرے دیکھوں۔“ وہ حتی الامکان احترام کے دائرے میں رہتی کھڑی ہو گئی۔
 ”کیوں؟“ دانیال خان نے حیرت سے پوچھا۔ ”اس میں دیکھنے والی کون سی بات ہے۔ مریم
 سے کہیں گا وہ دیکھ لے گی۔ آپ تشریف رکھئے۔“

دانیال خان ایک الجھا ہوا بزل تھے جو اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آ سکتے تھے۔ وہ بے بسی سے بیٹھ گئی وہ
 جب بھی کام کی طرف سے معمولی سی غفلت برتی تھی تو وہ اس کو یاد دلانا ہوتے نہیں تھے۔ اور جب وہ
 فرض کی تکمیل کے لیے اٹھتی تو ان کو برا لگتا۔

”دانیال۔“ آپ اس مرتبہ ٹھیکے کا فیصلہ کر کے جائیں۔ یہ مسائل خان گل سے سلجھنے والے نہیں۔“
 ”کیوں۔ وہ بچہ تو نہیں۔ آپ نے اس کو خفا سا سمجھا رکھا ہے۔ میرے خیال میں تو وہ کافی بالغ ہو چکے
 ہیں۔ اور میں کہاں جا رہا ہوں۔ آپ لوگ مجھے بیٹھے پر کیوں تلے ہیں؟“

بے بے ایک نظر ان کی طرف اٹھا کر خاموشی سے اگ کی طرف دیکھنے لگیں۔ دانیال خان کسی سوچ

میں اٹھتے بے بے کی نظروں کے تعاقب میں نہایت سنجیدگی سے اگ کو گھورتے رہے۔
 ”میں چاہتی ہوں۔“ پہلا خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔

”اگر وہ اس کی بیوی میں اٹھ کر اس کے پیچھے آئے۔“
 ”اس کا مطلب ہے آپ لوگ واقعی مجھے بھیجنا چاہتے ہیں۔ لیجئے میں چلا جاتا ہوں۔“ وہ دروازہ کھول کر
 باہر نکل گئے۔ پہلا شرمندہ سی رہ گئی۔ مجرم سی بنی۔ وہ بائیں سے ان کی خالی جگہ پر بے بے کے سامنے آ
 بیٹھی۔ ”میرا تو یہ مطلب ہرگز نہیں تھا بے بے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ انہوں نے ابرو اٹکی سے موڑھے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ ”اس طرح کی باتیں
 کرنا ان کی عادت ہے۔ ان کا مطلب نہیں ہوتا۔ میں تمہیں کئی دفعہ سمجھا چکی ہوں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کڑھی جھٹی خان کے مالک سردار دانیال خان کی باتوں کا کوئی مطلب نہ ہوتا
 ہو۔“ وہ بے بے کے سامنے جھنجھلا تا نہیں چاہتی تھی لیکن یہ بھی پہلا موقع تھا کہ دانیال خان نے اس کی
 ذات پر نظروں کے تیر نہیں چلائے تھے۔

”میں نے یہ نہیں کہا۔ میرا مطلب ہے کہ ان کی باتوں کا وہ مطلب نہیں ہو تا جو ہمیں نظر آتا ہے۔“
 جو کہنا چاہتا ہے وہ اتنا نہیں۔ اور جو کہہ رہا ہو تا ہے وہ اس کا مطلب ہی نہیں ہوتا۔“
 پہلا بے بے کی دانش مندی پر ششدر رہ گئی۔ وہ دنیا سے منہ پھیرے آتش دان کی طرف رخ کیے کتنی
 باخبر تھیں۔

”یہ بچپن سے عجیب و غریب ہے۔ شاید ماں کی محرومی نے ایسا بنا دیا۔ یہ جس سے پیار کرتا ہے اسے
 بہت تنگ کرتا ہے اور جس سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہو اس سے اس کو کوئی شکایت بھی نہیں ہوتی۔ تم اس
 کی کسی بات کی پروا نہ کرو۔ نہ اپنا دل ملیا کرو۔ نہ ریشنا ہو۔ اس اپنے کام سے کام رکھے گا۔“

لیکن یہ تو کسی بھی انسان کے لیے بہت مشکل کام تھا۔ انسان اور ڈیکوریشن نہیں یہی تو فرق ہے
 انسان تو ضرور سوچتا ہے۔ وہ کسی سے اس کی سوچنے کی صلاحیت تو نہیں چھین سکتے۔ بے جان چیزوں کے
 درمیان رہتے رہتے انہوں نے انسانوں کو بھی جاندار سمجھنا چھوڑ دیا ہے شاید۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی اس کے پاس ایک پروجیکٹ تھا۔ جس کی تکمیل کے
 لیے کوئی مدت مقرر نہیں تھی۔ لیکن اس کو ہر کیف ایمانداری سے کام مکمل کرنا تھا۔ اس کے بعد کیا
 ہو گا؟ گویا اس کا تصور اس کو خوفزدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ لیکن وہ بددیانت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کام

میں مزید دس ہندروں دن کا وقت تھا۔ پھر بلیم سے پارٹی آجاتی اور انہوں کے درخت کے ٹھیکے کے بعد اس
 کا کوئی ٹھکانہ نہیں بیا زیادہ سے زیادہ اس کی ضرورت مہماؤں کی موجودگی میں رہے گی۔ اس کے بعد سال
 بھر تک اس کی اس گھر کو کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اتنی حقیقت ہند تو وہ تھی۔



پھر اگلے ہی روز جب وہ بے بے کے ساتھ سرخ پرتی شام میں بے بے شیشوں کے پت کھولے ہوا زون
 کے پیچھے غراب ہوتے سورج سے محو ہو رہی تھی تو کسی کی آمد کا طوفان اٹھا۔ اس گھر میں ہر شخص کی آمد
 ایک طوفان ہوتی ہے۔ معلوم نہیں یہ گھر ہر وقت کیٹوں کو کیوں ترستا ہے۔ بے بے نے اپنے آرام دہ
 موٹے میں دھننے دھننے کان آوازیں سن لگائیں اور پورے وقتوں سے کہا۔ ”شیریں ہے۔“ پھر تھوڑی سی

وجہ صرف کر کے انہوں نے جیسے خود کو یقین دلایا۔ "ہاں شیریں ہی ہے ساتھ میں سارا بھی آئی ہے۔" بھلا کی طبیعت پر عجیب۔ پڑھو کی سی چماتے تھے۔ سامنے سورج ڈوب رہا تھا۔ اور آسمان کے ساتھ اس کا دل۔ خوب قابو رکھنے کو اس کا ہمت دل چاہتا تھا۔ لیکن دنیا سامنے سے دھندلائی جاتی۔ بہت خاموشی سے وہ بھی اپنی لڑکی کے سامنے آنے والوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس فن کے ساتھ کہ بے بے کے انتظار میں بے تابی تھی اور اس کے انتظار میں بے چینی۔

باہر آندے میں کوئی زور زور سے بول رہا تھا۔ لفظ بے بے کی بار بار تکرار سے اسے اتنا مفہوم تو سمجھا رہا تھا۔ آنے والے غالباً پہلے بے بے کے کمرے کی طرف گئے تھے۔ ان کو وہاں نہ پا کر وہ دوسرا دھڑکھڑاتے پھر رہے تھے۔

"اگر وہ جان بے بے اور وہ" ان کی کمزور صنفی آواز ان لوگوں کی جھنجھکی چلائی۔ آوازوں کے سامنے وہ جھکی تھی۔ دھڑکنے سے روانہ کھلا اور بھاگتی ہوئی شیریں سیدھی بے بے کے باؤں میں۔ اس نے اس لڑکی کو بہت تھوڑا دیکھا تھا۔ پہلے کمرے میں ڈراؤر کو۔ پھر کھانے والے کمرے میں۔ لیکن وہ وہی تھی آئی تھی اور اتنی حواس باختہ ہو رہی تھی کہ کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے تو ہچکچاتی تھی۔

"بے بے میری بے بے" وہ بے بے کے گلے میں بھونپتی بچوں کی طرح ٹھٹھک رہی تھی۔ بھلا چکی نہ جھکی۔ اس میں کوئی رانی بھی نہیں تھی۔ اس کے کوئی اتنے ناز اٹھانے والا ہو تا تو وہ بھی جی بھر کر ٹھٹھکی۔ گو اس کو اب یہ سب بچہ اچھا نہیں لگ رہا تھا تو یہ اس کا احساس محرومی ہی تو تھا۔

"اس مرتبہ دوستوں سے ملنے بے بے کی یاد آئی۔" صحبت میں بیٹھتی بیٹھتی بولی سی آواز۔ "اسلام علیکم" سارہ نے پردوں کے پاس خاموش کھڑی ایک اجنبی لڑکی سے راہ و رسم بھائی۔ بیلا جو اب "مسکرا دی۔" اسلام علیکم۔

"اف خدا بابا۔" شیریں اپنی خوبصورت سی آواز میں چلائی۔ "یاد نہیں آئی۔ بے بے کی بات سنو سارہ۔" سارہ کو تمہارے بھائی کو کہیں۔" سمانوی سلونی سارہ سی سارہ خوش خلقی سے فیس رہی تھی۔ آپ کیسی ہیں بے بے۔ سچ تمہارے یاد کرتے تھے آپ کو۔ اور یہ شیریں تو بار بار پروگرام بناتی تھی۔ میں نے ہی اس کو روک رکھا۔ ہمارے سمسٹر تھے نا۔"

"اور میں سوچ رہی تھی کہ بے بے مجھے پوچھنے ضرور آئیں گی۔ وہ میرے بغیر اتنے عرصے رہی نہیں سکتیں۔"

"کیسے سفر کرتی تھیں دور ملک اور ساتھ میں کسے لاتی۔ خیر ساتھ کو کوئی بات نہیں۔ بیلا میرے ساتھ ضرور آتی۔ اسے بیلا سے تم ملیں؟"

"ہاں۔" شیریں نے اسے ٹھٹھک لہجہ میں پکارا۔ "بیلا۔" وہ بارہو کو شش کے اپنے لہجہ کی ضرورتی چمکانہ سکی۔

"گناہات۔ یہ بھلا ہی تھی جس کی وجہ سے مجھے تمہاری کمی کا احساس نہیں ہوا۔"

شیریں سامنے والی کرسی میں دھڑکی کر بیٹھ رہی۔ اس کو بے بے کے اعزازات سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہ تھی۔ وہ بہت دن بعد گھر آئی تھی۔ اس لیے کئی بھر کرسیں رہی تھیں۔ جیسے جیسے ہی سارہ دوسرے

سوئے تھیں تو جھٹک لگی۔ "اگہ۔ ہوم سو بہت ہوم۔ سارہ۔" "واقعی ہوم تو گھر میں ہے۔ چنانچہ رات کے کھانے میں بیلا کو کہا۔" تو وہ روغن خوش۔ چھین کر لیا۔ بے بے آکر کھانا کھا کر پڑا اور بے کھانا نہ سو سکا۔ کیسا سہرا۔"

"رات کے کھانے میں تو میرے ابھی سارہ جب ہم گھر آ گئے تھے تو گھر کی گھر سے حساب بہت چلتا ہو گا۔ فی الحال ہمیں چاہئے کھانا کھانے کے کھانا کھانا۔" افسوس بے بے میں شہر پر تھوکی ہوں۔"

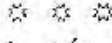
"میں سمجھتی ہوں کسی سے۔" بیلا تھکی ہوئی۔ "جیسے جگہ چھوڑنے کی ضرورت تھی۔"

"تھکی سردی ہے۔ پشاور میں رہ کر یاد ہی نہیں رہتا کہیں سردی بھی پڑی ہے۔ سردی پڑی کسی کو کہیں اور لکڑیاں لگا کر لے۔" سارہ بیلا کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ "چائیس میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔"

"آپ ریسٹ کریں۔ اتنا لمبا سفر کیا ہے۔ آپ نے کل سے کتنی ہوں۔ وہ ابھی چائے اور لکڑیاں چھوڑتی ہے۔" تھکی شہر کو شش اس نے کی کہ اس کا انداز کہہ سستوں والا ہوئے پائے۔ اس گھر پر اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہاں کچھ فرائض تھے جن کی بنیاد وہ پیشہ یادر تھی۔

"میں تو تھک کر چور ہو گئی۔" شیریں بڑے صوفے پر اوٹھنے پر لکڑیاں۔ "تم آرام کرو سارہ۔"

واقعی اس کو کمرہ بھی کیا تھا۔ اس نے پری کے ذریعے خاندان کو سکھایا تھا کہ باجیاں بچھ کر ہی اس میں اور انہیں چائے کے ساتھ لوازمات بھی درکار ہیں۔



اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ کمرے میں آئی تو اسے محسوس ہوا۔ وہ کافی دنوں سے بہت زیادہ آرام ہو رہی ہے۔ آسمان سے اندر جھرا اس کی کھڑکی کے شیشوں پر بھی گرنے لگا تھا۔

اور خاموشی سے برتنی اداس کی پھوار اس کے دل کو گھیرے تھی۔ ایک اداس سی بے نام سی تاریکی آہستہ آہستہ اس کے چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ کاش اس اندر میرے میں خود کو جھکا کر کہیں کم ہو جائے۔ لیکن یہ کتابنا الیہ ہے کہ اس جتنی میں چھپ جائے اور ہم ہو جانے کے لیے بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اس کو اپنے کمرے میں آکر اپنی بے نام ابھرتوں سے اچھے آدھا فائدہ بھی نہیں گزارا تھا کہ بے بے کا

بیلا اٹھیا۔ اس کا خیال تھا۔ آج اس کو مکمل فرصت دے گی۔ بے بے کو ایک نیا قتل مل گیا ہے۔ ایک ایسا انسان جس سے ان کے ماضی کی کڑیاں جگہ جگہ سے لٹی ہیں۔ اس کی یاد آنے بھی نہیں دے گا۔ لیکن

وفا شعار ہے بے بے کی طبیعت کا لازمی جزو تھی۔ وہ نہیں بھی کسی کو بھی نہیں بھول سکتی تھیں۔

"اٹھانک دو م میں چائے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔" پری نے منتقلی کا حق ادا کرنا چاہی۔ المذہور استعمال

کر دیا تھا اس کو اصولاً "تو اس وقت نماز کو کرتا رہا تھا لیکن اب وہ سب سے آئی تھی اس کی سے آرام کر رہی پر دروازے پر گھمائی اداسی کو نصیب تھیں کرنے کے موز میں تھی۔ وہ نماز کو پڑھے بدل کر نکلی تو وقت خاموشی

سے بچھ اور آگے سرک چکا تھا۔ شاید وقت پر اس کا اختیار اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہی ہو رہا تھا۔

گھر میں صرف دو نئے مہمان آئے تھے۔ لیکن باؤں کے کورڈور کے خاتمے سے مارے مگر وہی

بھائی خان کو معلوم ہو چکا تھا کہ آج یہاں ایک نیا طوفان اتر آئے۔ زندگی میں پہلی بار وہ سارہ سے لباس میں تھی۔ اس کے بالوں کی تراش بھی سادہ تھی۔ اب تو ایک مدت سے نہ ترشوانے کی وجہ سے

کندھوں سے نیچے تک جھونے لگے تھے۔ بال باندھنے کی عمر بھر کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے اب بھی

اس کو بھی کلام سب سے مشکل لگا۔ وہ ہر شے کر کے بالوں کو پونجی ڈالتے پھرنے کے لیے پھوڑتی۔ اس نے گھر میں آنے والوں کا لباس بھی ایک نظر میں دیکھ لیا تھا۔ اور علیہ بھی۔ وہ جتنی کیڑوں جدید تراش کی سلائی اور بالوں کی بہترین بناؤں کے ساتھ انگلیوں میں زمرہ کے کپڑے پہنتے دیکھتے، بہت استیلاوت پر ہوتی تھیں۔ جیسے ان کے بدل بیروں اور زمردی طرح قیمتی اور نایاب ہوں۔ اس نے ایک نظر اپنے حلیے پر ڈال دیا اور شیشوں کے بند دروازے کے اس پار جہاں آئینہ والی گرمی اور باتوں کی مہک تھی۔ اس نے اندر جانے کا ارادہ کیٹل کر دیا۔ کتنی دیر سے دروازے کا ہینڈل ہاتھ میں تھا۔

گوگوں کی کش کش سے نکل کر فیصلے کی حد میں داخل ہو گئی۔ میں کسی سے معذرت کسلاؤتی ہوں۔ وہ ہینڈل سے ہاتھ ہٹا کر گھڑی ہی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وانیال خان کی کسی پر لطف منظر سے محظوظ نہ کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک دم چلتے سے وہ ان کے تین سامنے اس طرح گر کر رک گئی تھی۔ کہ اگر ذرا بھی زور سے گھومتی تو ان سے ٹکرائے ہٹا کر نہیں سکتی تھی۔

وہ اس سے بالشتوں کے فاصلے پر تھے۔ صرف ایک اپنی سی نگاہ اور اس نگاہ میں بھی اس نے بھانپ لیا تھا۔ وانیال خان شام کی اس چائے کے لیے بطور خاص اجتنام سے تیار ہو کر آئے ہیں۔ مخصوص قیمتی موانہ پر فہم کے جوئے اس کے دائیں بائیں لڑاتے گزر رہے تھے۔ گویا آج کے مہمان وانیال خان کے خاص مہمان تھے۔ ورنہ اتنے عرصے میں اس نے ایک مرتبہ بھی ان کو ڈانٹک ہل میں آتے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے جھکی ہوئی نظروں کو ایک مرتبہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اگر وہ ذرا سا اوجھڑا ہوا تھا تو اس کو واپسی کا راستہ مل سکتا ہے۔ لیکن وہ معلوم نہیں کس ارادے سے اس کے راستے میں تھکے ہوئے توں کی روکی مسکراہٹیں اٹا رہے تھے۔

وہ بہت خوش تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔

اور اسی لمحے نے اس کو اس کر دیا۔

”تو آخری فیصلہ ہی ہوا کہ آپ جاری ہیں۔“

وہ خاموش رہی۔ اس گھر کے لوگ لوگوں کے راز اپنے نہیں کمال دیکھتے ہیں۔

”میری طبیعت... وہ کچھ کچھ کچا کر چپ سی ہو گئی۔ جھوٹ بولنا معمولی بات نہیں ہوتی۔“ (میری طبیعت شاید ٹھیک نہیں ہے۔)

”آخر دس منٹ تک خود سے الجھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا آپ نے۔“ وہ بے متوجہ اس کو پھر کسی آواز میں گرفتار کر رہے تھے۔ دھچکے دھچکے لہجے میں اس کے بالوں کے نزدیک کان کے پاس جھٹکے۔ وہ پیشہ کی طرح اس کو ہٹانے میں کامیاب ہو رہے تھے۔

”اور اگر کوئی اس اچانک بیماری کی وجہ دریافت کرنا چاہے تو؟“

”وجہ تو کوئی نہیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔“ اس نے مری مری ہی گواہی دے کر کہا۔

”اور دل کیوں نہیں چاہ رہا تھا؟“ وہ جانتی تھی لفظوں کی تخیل گری ان کا پیشہ رہا ہے۔ وہ جب تک اس کو اذیت نہیں دالیں گے، یہی ملے نہیں لگیں گے۔

”ذرا مل آپ سب لوگ ایک ہیں اور میں۔“ وہ روئی میں اپنی بات کہتے کہتے جھٹک کر چپ ہو گئی۔ اس کو اپنے اس فقرے سے خود تری کی بو آتی تھی۔ اور وہ خود کو مجبور۔ بے کس ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”میں جانتا تھا۔ میں جانتا تھا۔“ ایک گہرا مایل سانس ان کے پیچھے ورنے آوازا دیا۔ ”اور یہ کوئی قابل غریب نہیں۔ آپ کو آپ کے اس گدھ لکس کی مڑا ضرور ملنی چاہیے۔“ انہوں نے بایاں ہاتھ آگے بڑھا کر دروازے کا ہینڈل جھکا دیا۔ دروازے آواز نکلا۔

ان کے دائیں ہاتھ دروازے کی چوکھٹ تھی۔ اور بائیں ہاتھ میں ہینڈل۔ اور دروازے کو تھامے دو لوں بازوؤں کے ڈیسکے اترے میں اس کا پیلا بڑنا وجود۔

”تشریف لے چلیے۔“ ان کی آواز ساف گئی اور نمایاں تھی۔ بغیر کسی لرزہ کے۔

اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ سامنے وانیال خان۔ یعنی اراوں سے اس کا راستہ اپنے وجود سے روکے کھڑے تھے۔ وہ فن سے ٹکرائے بغیر صرف ہل ہی میں داخل ہو سکتی تھی۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے ایڑیوں پر گھولی اور ہال میں داخل ہو گئی۔

وہ ایک قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ایسے شامل ہو گئے۔ جیسے وہ اپنے اپنے کمرے سے ایک ساتھ گئے تھے۔ ہال خوب چمکا رہا تھا۔ قہار گرم ساری والی آئینے اور شیشے کی چیزیں آٹھ تھیں۔ ہیرے کے گروچند ہی کرسیوں پر لوگ ہونے کے باوجود ہال بھر اُبھرا اور پریش لگ رہا تھا۔

شیریں نے بے آواز کھٹنے والے دروازے کی آواز غلبا۔ اپنے دل پرستی۔

خان گل سے ٹانھا ہلا کر لڑنے والی شیریں کا پیارا رنگ تبدیل ہو کر سرخ سا ہو گیا۔

وہ بے آواز میں اٹھ کر آئے والوں کی طرف لپکی۔

لیکن منہ زور خواہشوں کو ٹکاؤ دیتی تھم کر رگ کی۔ یہ عیلا کی چند منہری بے قابو نہیں با معلوم ہوا ہے ان کے ڈنک کوٹ سے ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں۔ حد سے تھکنا اس کا لالہ سمجھو کا چوہے حالات سے بندہ سیر ہو رہا تھا۔ واپس لوٹ جانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ وانیال خان نے دروازے سے شیریں تک ایک لمبے کے لیے بھی اسے بھاگنے کا کوئی راستہ فراہم نہیں کیا تھا۔ اس کے کندھے سے بالکل نزدیک اپنا کندھا ملائے وہ شیریں کے لیے مسکرا رہے۔

”پیشہ ویلا۔“ بے بے نے جیسے اسے تنبیہ کی۔ خان گل اور مرجن ہمارا اس کی آمد کے احترام میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے مرجن ہمارا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ خفیف سی ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ اپنی کرسی کی طرف گھبراہٹ سے۔

”کیسی ہیں آپ؟“ مرجن ہمارا اپنی خوش اخلاقی بھارے تھے۔ اپنی کرسی کی پشت سے وہ وانیال خان اور شیریں خان کی بے تابانی ملاقات کو بغیر دیکھے محسوس کر رہی تھی۔

شیریں کے آنگ انگ سے سر پھوٹ رہی تھی۔ اس کی آواز میں شوقی اور چونچالی اس بات کا چٹا دے رہی تھی کہ اسے جو شخص اس سے ملا ہے اس نے پیچھے سارے ملنے والوں کی خوشی کو کم کر دیا ہے۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ تھک بول۔ ”اس نے گزرا کر کہا۔ غیر شعوری طور پر اس کا دھیان بار بار پیچھے کھڑے ہونے کی طرف جھٹک جاتا تھا۔ جیلا کا تعارف، شیریں خان کی بہترین دوست اور ان کی دست

دونوں کی طرف دیکھا۔

”پھر کیا ہے ان کا نام؟“

”براقہ در نام ہے۔ تاریخی۔“

”خان گل۔“ اس نے اذیت پیش کر لی۔ بی بی آواز میں پکارا۔

”پلیز نہ بے نیس نہ اب تو تجس بھی ہو گیا ہے۔“ سارہ نے منت کی۔

دانیال خان نے ایک تخت چنچ واپس پلیٹ میں رکھ کر ایک گہری تھوڑی نظر خان گل پر پھینکی۔ وہ اتنی نمکناں اور احساس دلانے والی نظر تھی کہ میز کے گرد موجود سب ہی لوگوں نے غصے سے سرسبز کر لیا۔ خان گل پیکا سا رہ گیا۔

”ان کا نام ہے سورنگ۔“

جیلانے ایک گرا ہوا سامان لیا۔ ایک بلا آتے آتے گل گئی۔ اور اس کے لیے ہاتھ نہیں اس کو دانیال خان کا ممنون ہونا چاہیے یا محض ایک اتفاق سمجھ لیتا چاہیے۔ کیونکہ انہوں نے خان گل پر وہ سرزنش کرتی نگاہ ڈالی کہ اسٹاٹ سوپ مانگا تھا۔ اور منکر کر تھک کر پوچھی تھی۔

اس کے بعد خان گل بچھ سا گیا۔ وہ میز پر موجود چیزوں لڑکیوں کے ساتھ باری باری مذاق کے موڈ میں تھوڑے سا رہ کر ذرا دل قہقہے کے باوجود خان گل نے ایک افسانہ بھی منہ سے فائو نہیں نکالا۔ ایسے میں سرزنش باری کا کام آئے۔

وہ خان گل کی بیٹھ سے بھی آگاہ تھوڑے سا کو محفل میں بے تکلف ہونے کا موقع دے رہے تھے۔ انہیں جیلانے کی بے بسی کا احساس بھی تھا۔ اسے نشانہ مشق بننا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خاص طور پر ایسے دو لوگوں کے بچھو اس کے لیے بالکل اچھے تھے۔

اور اس کو دانیال خان کے معتبر ہونے پر اعتراض ہونے کے باوجود اعتراض کا حق نہ تھا۔ یہ سب خانوں کی روایات کا حصہ تھا۔

”چلو لڑکی۔ گل کا پروگرام ترتیب دے۔ کیا کیا کرنا ہے؟ خان گل نے مجھے آستہ ہی بیلہ سننی کورٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کے علاوہ؟“

”اے ہاں۔“ بے بے نے جیسے اتنی دیر بعد چونک کر محفل میں ماضی دی۔ وہ کورٹ تو خود ان دو تھیں نے چلو لڑکی سے کھو کھو کر بتایا ہے۔ اور مجھے درمیان میں خواجوا کھینٹا لے گئے۔ انہیں کمرانے کے لیے۔ اور تم نے مجھے بتایا نہیں دانیال خان کہ لڑکیاں ڈار کے ساتھ آ رہی ہیں۔ تمہیں انداز نہیں میں کتنی پریشان تھی۔ ان کے اکیلے آنے کے قصور سے۔“

”یہ اکیلی آ رہی تھیں ڈرائیو کے ساتھ۔ سرزنش مار تو قسمت سے ہی مل گئے۔“

خوش قسمت سے۔ ”سرزنش مارنے لگا۔“

”ہمیں تو کوئی قسمت نہ ملی۔ سارا راستہ ڈانٹ ڈانٹ کر لے گئے ہیں۔ بغیر دعویٰ پھل نہ کھاؤ۔ ان پر اسے ہوا ہے ناز کا لھانٹا لھانٹا۔ ان ہائی پینٹنگ کے لٹال چیز نہ چکھو۔ گندے سڑکے ہاتھ لگے ہیں۔ ہم تو سارا راستہ کبابوں کو ترستے آئے ہیں۔“ سارہ بڑبڑائی۔

”دانیال خان۔“ سرزنش باری نے چھری سے اشارہ کیا۔

راستہ سے کر دیا یا جا رہا تھا۔ سارا در بے نواز۔

سارا در بے نواز نے اس سے کوئی خاص روایتی فقرہ بول کر اسے مشکلی نہیں دیا یا شاید اسے بھی ہوں اس کا حسیانہ اپنی کرسی کے سامنے سے زیادہ پیچھے تھا۔

”دو تھیں کسی ایسے پرستار پرستہ کر رہے تھے جو انہوں نے پیلے بھی کہیں اور دور کی چھوڑی تھی۔“

”وہ بڑی عجیب سی SHOP تھی۔ اور وہاں والا آدمی بہت ہی STUPID تھا میں نے اس کو بہت یاد دلایا۔ آپ کا حوالہ دیا کہ میں آپ کے ساتھ آپ کی دکان پر گئی تھی۔ کتنے گستاخی کو دوں گا۔ کل کا سارا دن اسی منت ماحبت میں گزارا۔ تو چھیں بے شک سارہ سے۔“

”کیوں پوچھوں؟“ آپ نے جو کہہ دیا۔ اور اتنی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے جاس وقت بھی بتایا تھا آپ کہہ دیجئے خلی سا ہے۔“

”لیکن آپ سے تو بہت بار کرنا ہے۔“ اس کی ہنسی کی لٹک نے اس کو لکا سا چوٹا دیا۔ یہ اس کے پرانے لوگ ہیں اس کے اتنے شاید اسی لیے اس شخص کی گفتگو کا انداز سب ہی سمجھ دلا ہوا تھا۔ وہ گفتگو میں طنز کے تیر پھینکتا، بھلوں کے گھاؤ لگا تا شخص بڑا نرم خوش ہمایا، محبت کی شمعیں روشن کرنا شیریں کے چلے آئے تھے جیسے خوشی سے سیراب ہو گیا تھا۔

”لی میز کے ایک کونے میں چوڑی مٹی سے کسی بحث میں الجھے تھے وہ ایک جھسے میں شیریں کے ساتھ جاتے تھے سارہ در بے نوازی طرف انہوں نے ایک طویل خوبصورت اور گہری مسکراہٹ بند کر لی۔ جیسے عزیز ترین دوستی کے عزیز ترین دوست کہ کسی بھی انتہا کے لائق سمجھائی جاسکتا ہے۔“

”یہ سرزنش باری کو حسیانے سے تولا ہے۔“

”شکر ہے۔“ سارا در بے نواز شاکھی سے ہنس پڑی۔ ”آپ کا حسیانہ کہیں اور بھی گیا۔“

”آپ اپنے حسیانہ کی بات کریں۔ کتنی فلمیں دیکھیں۔ کتنے ٹائل بڑھے۔ کتنی شاعری کی پاس بھی ہوں گی اس سال؟“ جیلانے کا پلٹ سیدھا کرنا چھ لڑ گیا۔

آج وہ ایک بالکل ہی نیا دانیال دیکھ رہی تھی۔ سستی سے اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے اس نے ایک نظر عوام کی طرف دیکھا۔ خان گل کے سوا سب ایک دوسرے میں مگن تھے خان گل اس کو بیوی دیکھی اور اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔

”سارا در بے نواز۔“ اس نے دو متانہ سے لہجے میں اس کو پکارا۔ ”تمہارا ان سے تعارف ہے؟“

”جی ہاں۔ ہو چکا ہے۔“ آپ زیادہ قائل نہ بنیں۔“

”آپ چھوٹا تو ان کا نام بتائیں۔“

”جی ہاں۔ ان کا نام اچھی بتایا ہے۔ یہ میرا حافظہ اتنا خراب نہیں۔“

”تھوڑا بتایا ہے۔“ اس نے شرارت سے کہا۔ ”جیلانے ان کا نام۔“

وہ سن سی ہو گئی۔ بھری محفل میں کیسا غلط مذاق کرنے جا رہا تھا۔ جتنا کہ لہجے دے بیٹھی تھی اتنا ہی مسخر کا نشانہ بنی۔ اس نے چوری چوری دانیال خان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا رخ تھوڑا سا شیریں کی طرف گھمائے پڑے اٹھا کر اس کی کوئی بات سن رہے تھے۔ خدا کا شکر، متوجہ نہیں تھے۔

”ہائیں۔“ وہ خان گل کی شرارت اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس نے چھٹی آنکھوں سے باری باری

”جیسے اگر احساس نہ ہو تاکہ لڑکی سے ناوانی میں غلطی ہوئی ہے تو ایک عذراش سوری۔“ انہوں نے بے پے کی طرف دیکھ کر پھری روست میں بھونک دی۔

بے پے بھاری سے کرسی سے اٹھ کر آتش دان کے پاس چلی گئیں۔ ”جب بھی تم لوگ اکٹھے ہوتے ہو۔ پاگلوں ایسی باتیں کرتے ہو۔“ انہوں نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ ”اس سال میرے کھٹے بالکس ہی جواب دے گئے ہیں۔“

”نیل تو اب ہر روز چلتی ہوں۔ پوچھ لو بیٹا۔“ چن تابیلا۔“

”ہاں واقعی۔ بے پے نے روزانہ تھوڑی سی واک دان میں کرتی ہیں اور آدھ گھنٹہ شام کے وقت ضرور۔“ اس نے پلیٹ سے بہت دیر کا بھٹکا سر اٹھایا۔

”مرجن ٹارنے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔“ وہ تو میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ ان کی صحت دیکھ کر بھی اور سب کی بھی۔“

”بھی صحت کے علاوہ کچھ اور بھی دیکھا کریں۔“ سارہ رب تو ان کی بھاری آواز سے سب کو ہنسا دیا۔

”وہ اتنی اچھی آتی پارسی سی لڑکی۔ آپ کا مطلب ہے مولیٰ ہو جائے، بھی صحت مند ہو سکتی ہے۔“

”کیا بات ہے؟“ انہیں خان نے بہت دیر بعد اپنی بھاری آواز میں پوچھا تھا۔ ”یہ سارہ“ مرجن ٹار سے بہت ناراض ہیں؟“ وہ شیریں سے مخاطب تھے اور کسی بہت اہم انسان جیسے سارے آثار اس کے چہرے پر کھینچے ہوئے تھے۔

نئے عجیب سے خیالات نے اس کو گھیر لیا۔ ابھی بہت زیادہ وقت نہیں گزرا۔ جب دانیال خان دروازے سے اس کو سرخروں کی طرح کھیر کر اندر لے آئے تھے۔ جیسے اس کے بغیر یہ محفل اور حوری سی رہ جائے گی۔ لیکن اس کے اندر آنے سے وہ اتنے انجان سے ہو گئے جیسے اس کو اندر لانے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ رہا ہو۔

بے پے آتش دان کے پاس چلی گئی تھیں۔ خان گل نے ہوٹل پر چپ لگائی تھی۔

دانیال خان کی ساری توجہ شیریں کی طرف تھی۔ وہ کسی اور سے مخاطب بھی ہوتے تو شیریں کے حوالے سے ایک اکیلے سرجن ٹار تھے۔ محفل کی رونق سنبھالنے کی کوشش میں بار رہے تھے۔

قہوہ کی سروں شروع ہوئی تو اس کو اندازہ ہوا کہ بہت تھکی ہوئی ہے۔

اتفاق ہی تھا کہ اس کو قہوہ کا ملا ایک دن بھی پسند نہ آیا۔ اور دن میں کتنی ہی مرتبہ اس کو پینا پڑا تھا۔ اس کے ہر گھونٹ میں اس کو بار بار مسالوں کی بو آتی تھی۔ اور ک دار چینی، چھوٹی لالچی، معلوم نہیں قہوہ کس کس چیز پر کھرب ہوتا تھا۔

گھانے کے خاتمے پر محفل بے پے کے کمرے میں شفٹ ہونے چلی۔ خان گل نے دکھائی سے معذرت کر لی۔ وہ وہیں بھر چنگلی خروخروں کے تعاقب میں دوڑا تھا۔ اور تھک گیا تھا۔

مرجن ٹار اور دانیال خان ذرا سست قدم رکھتے کسی سنجیدہ بات میں مگن ہو گئے۔ شیریں دنیا سے بے نیاز اپنے خوبصورت شالے جھٹکتی بھاگتی بے پے کے سنگھ روم کی طرف چلی۔ یہی موقع تھا۔ اس نے سوچا۔ دانیال خان پیچھے رہ گئے تھے۔ بے پے آگے نکل گئی تھیں۔ اور دائیں طرف کی راہداری اس کے کمرے کی طرف نکلتی تھی۔ وہ ابھی مکمل طور پر گھوم بھی نہ پائی تھی کہ اسے لگا۔ سست قدم اُفرا دے اپنے

قدم تیز کر کے اس سے آگے چلے۔ وہ مڑتے ہی رک گئی۔

مرجن ٹار اور دانیال خان اس کے راستے میں حائل ایک دوسرے سے بالکل مختلف تازوں سے رہے تھے۔ پہلا شخص حادثے سے مسکرا تا اور دوسرا غلطی سنجیدگی سے سامنے دیکھتا۔

دونوں کے چہرے پر اپنے اپنے پیشے کی شدت رہی تھی۔

”تو معلوم یہ ہوا۔“ مرجن ٹار نے دانیال خان کو مخاطب کیا۔ ”کہ آپ علاوہ اچھا کھانے کے اچھی ڈیکورنگ بھی ہیں۔ کچھلی بار سے لب تک میں نمایاں تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔ کچھ رنگ کھر گئے ہیں۔ کچھ زندگی اور ناکی آگئی ہے۔ وہ مرہولی اور بے رونق اب درود پوار پر نہیں چلتی۔“

”بہت سبک ہو۔“ وہ شلفلی سے فس دی۔ ”آپ نے زیادہ تحریف کر دی ہے۔“

”میں زیادہ نہیں کی۔ اتنی کی آپ سخت ہیں۔ اور آپ کہاں تشریف لے جا رہی ہیں۔ ابھی تو قہوہ کا ایک دور اور چلے گا۔ بھی شیریں سارہ۔ ان کو ساتھ لے کر چلاؤ۔“

شیریں ایک جیسا کے سے اندر داخل ہو چکی تھی۔ سارہ رک گئی۔ وہ فرماری واپس ہوئی۔ واقعی اس کو بیلا کے ساتھ چلنا چاہیے تھا۔

”سوری۔ مجھے اتنا زیادہ پسند نہیں۔“

”قہوہ پینڈ ہے مت پیجئے گا۔ ہم تو پینڈ نہیں تات۔“ مرجن ٹار کے بہت اصرار سے اس کو ابھینے ہوئے گئی تھی۔ سارہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بے تکلفی سے مسکراتی اندر چلی۔

کمرہ خوب گرم اور روشن تھا۔ لوگ اپنی پسند کی جگہیں سنبھال کر کپ نگار رہے تھے۔

سارہ نے بلا کو پکڑی لیا تھا۔ اور دوپٹا کو اچھی جگہ پر مٹا دیا۔ وہ سارہ اور بے تکلف تھی۔ شاعری کرتی تھی اور چھوٹے موٹے افسانے لکھتا کرتی تھی۔ لیکن زیادہ خود گمان نہ تھی۔

دانیال خان اور شیریں بے پے کے نزدیک تھے۔ سارہ کی باتوں میں بہت زیادہ دلچسپی کے باوجود وہ جب بھی نکلا کرتا کرتی دانیال خان آرام کرسی میں ریٹیکس کرنے کے انداز میں دروازے اٹھا کر اس کی کوئی کتا سنتے تھے۔

جلدی خان گل محفل میں شامل ہوا۔ مرجن ٹار دوست تو دانیال کے تھے لیکن غالباً پسندیدہ شخصیت خان گل کی تھے۔

جلدی سونے والوں کو نیند آرہی تھی۔ اسے تو ویسے بھی ہلکے سونے کی عادت نہیں تھی۔

لیکن جب وہ سونے کے لیے بستر آئی تو اس کا ذہن جھکا ہوا اور سر بہت بو بھل تھا۔ آکھیں شدت نیند سے جتنے کے باوجود نہ نہیں ہو پاری تھیں۔ وہ جب بھی چلیں سونے کی ایک خوبصورت سر کے ساتھ جھکا ہوا دریا یا قنار سراسر کی نیند اڑاتا۔ وہ ان کے بیسی نہیں ہے۔ اور نہ ان میں سے ہے۔ اور یوں بھی اس کو متعجب اپنا کام مکمل کر کے پٹے جاتا ہے۔ آرام دہ تکیہ اینٹ کی طرح سخت اور پھری طرح جھکا ہوا تھا۔

ایک مدت بعد اس کو کتنی ہی لوگوں کی یاد نے ایک ترتیب سے بے چین کر دیا۔ گوشتی، مٹل، جمید منیر صاحب، مکمل صاحب، رجب، چاہلہ اور ان سب سے اور اس کے اپنے پلایا۔ ایک وقت تھا جس پر سے اس کی گرفت آہستگی سے سبک گئی لیکن باغی کا سہارا اس کی یاد میں آجایا وچپ اور اتنا ہی محفوظ تھا۔

اور سب سے بڑی بات کہ وہ اس کا اپنا تھا۔ اس میں کسی کا حصہ نہیں تھا۔ اسے کوئی چھین نہیں سکتا تھا۔ اس میں نہ کوئی حد تھا نہ رشک۔ بہت دنوں کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر کانوں کانوں کو بہکوتے رہے یہ کیسی عجیب رات تھی۔ وہ اپنی تکلیف کا سبب معلوم کرنے سے بھی بالکل عاجز تھی۔ رات کی تاریکی میں خاموشی سے بولی ری اور اس بولنے سے اس کو عجیب طرح کا آرام آ رہا تھا۔

کتنے سے بے نام دکھ آہستہ آہستہ رستہ پانی میں دھل رہے تھے۔



گزشتہ میں آنے والے اگلے تمام دن خوشی مسرت کے دن تھے۔ ہنگاموں اور راتوں کے دن تھے اس کو گزشتہ میں آنے لگتا ہی وقت کر چکا تھا لیکن ان ایام نے ان درودوں میں اتنے جھٹکتے اتنی خوشیاں اور ایک دم اسے مسرت سے ہنگامے ایک دم محسوس نہیں کیے تھے۔

سمائی طبیعت سرجن غار ہر وقت پروگرام بناتے رہتے۔ ”ہمیں پاڑی دریاؤں کا برماؤں بانی اوپر سے نیچے آبشار کی صورت میں کرتا ہے۔ ان وہاں بارش کی ہو گا۔“

”ہاں۔“ ایک نوجوان لڑکا۔

”میں ڈیوٹی تقسیم کرتا ہوں۔“ وہ ہاتھ میں کاغذ پھیل لے کر انہیں سنا رہا تھا۔ ”خان ملک جینوں کے لیے ٹرانسپورٹ کی فراہمی کا بندوبست کرے گا۔ کیا کیا چیزیں ہوں گی اور کتنی تعداد میں سارے رتبہ تو اس کی ذمہ دار ہیں۔“

”میرس خان انٹرٹینمنٹ کا بندوبست کریں گی۔ اور ہاں پکائے والوں کی دیکھ بھال خاتمہ دنیا کے ذمے ہے۔ ہر گز نہ ہو۔ ہر قسم کے افسر اعلیٰ وانیال خان ان کے ذمے۔“

”معاف دیجیے۔ شاید میں شرکت نہ کر سکوں۔“ بیلا نے بولی کی آواز میں معذرت کی۔ ہنگامہ خیز بانی کی ہنگامہ اپنے عروج پر تھا کسی نے اس کی اتنی دلی بلی معافی نہ کی تھی۔ میوزک اوپننگ آواز میں بج رہا تھا۔

بے پایاں بارشوں پر ہاتھ لگنے کے باوجود اس شور شرابے میں سرشاری پیشی تھیں۔

”معاف تو آپ کو تب کیا جائے گا جب اس معافی کا سبب معلوم ہو۔“ سرجن غار اس کے سامنے آگئے۔

”مجھے قصور کا کام ہے۔“

”میرا خیال ہے آپ کے افسر اعلیٰ ایسے عالم نہیں۔ اور اتنے بور بھی نہیں۔ اے لوہہ بھی آگے ہاتھ لگن کو آ رہا کیا۔“

کچلے دروازے سے دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے اور بے تحاشا شور سے ہلکی سی ناگواری کے اندھار پید عثانی چڑھنے والیانیال خان گروپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جو فلوور کشن رہے ترتیب پر سے انچیوں کی گھنٹہ میوزک پر چنگیاں بجانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شیریں خوشنوار سے مسکراتی آگئی۔

اور اب بیلا سے کیا شاید کسی سے بھی یہ چھپانہ رہا ہو کہ شیریں اپنی تمام تر تنگ مزاجی اور چڑچاہن چھوڑ کر وانیال خان کو دیکھتے ہی کل اٹھتی ہے۔

اور ہمیشہ شجیدہ شجیدہ اور لے دیے رہنے والے وانیال خان اس کو دیکھ کر مسکراتا نہیں بھولتے۔ لیکن شیریں کی قسمت کہ ان تک پہنچنے سے پہلے انہیں سرجن غار نے اچکایا۔

”خاہ وانیال خان! اس محفل میں اس وقت آپ کا ذکر ہو رہا تھا۔ خدا را جواب میں وہ جھسکا ہوا شہرہ۔“

بڑھے گا جو موقع محل کے مطابق بھی ہے۔ دراصل ہم ایک پانچک ترتیب دے رہے ہیں اور خاتمہ بیلا کو آتے ڈیوٹی کی اجازت دے کر رہے۔“

بیلا کا منہ رنگ لایا۔ بات کو اس انداز میں تو اس نے لیا بھی نہیں تھا۔

”فضول باتیں نہ کرو۔“ انہوں نے ناگواری سے کہہ کر اپنے راستوں کو پھر اسی طرف موڑ لیا جہاں خوش باش ہستی مسکراتی ایک ہستی ان کی منتظر تھی۔

”ہم بڑے مزے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ خوش مزاجی سے آرام نہ ہونے پر دروازہ دھکے دیا۔ ”کیا پروگرام ہے اور پروگرام سنانے سے پہلے براہ کرم یہ غل غبا نہ ہو کر۔“

سارہ رب نواز نے ٹخن دھکی کر کہ کسٹ ماہر نکال دیا۔

”افسوس لا لارا نیال۔“ تان سین کی روح کو کتنا افسوس ہوا ہو گا۔“

”شکر ہو کہ تان سین تمہارے سکوی دریافت سے پہلے مر گیا۔ اس کیسے پروگرام؟“

”لا لارا غار ہم لوگوں کو آبشار کے نیچے بانی کیوں رہے جارہے ہیں۔“

”لا لارا غار۔“ انہوں نے شوخی آواز میں سرجن کی طرف دیکھا تھا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا۔ یہ کئے کہاں تلنے کے بھی ماہر ہیں۔“

”ماہر ہمارے پاس موجود ہے لیکن معلوم نہیں کیوں جب سے میرے پاس بیٹھا ہے۔ ایک سے ایک اعلیٰ بر محل یا موسیق نگار اسانہ کھڑے جا رہا ہے۔“ سرجن غار نے اپنے سچے کی ٹھیکہ کی گواہی سے چھوڑا۔

”کون ہے وہ ماہر؟“ بے ساختگی میں اس کے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر وانیال خان نے ایک لمبی سی آواز دے کر بھیج دیا۔

”اے کی بھی۔“ جیسے سوال کرتے ہی بات کی گہرائی تک چلے گئے تھے۔

انہوں نے ایک مرتبہ بھی بیلا سے رسا نہیں کہا کہ آپ ضرور چلیے کیا ہر جہ ہے؟

انہوں نے سرجن غار کی بات کا جواب دیا تھا کہ آہ اس کو ڈیوٹی آف مل سکتا ہے یا نہیں۔

گواہی بالکل بے کار ہے حقیقت اور فضول سی چیز تھی۔

اسی لیے اس نے سرجن غار اور سارہ رب نواز کے بہت اصرار کے باوجود بڑے احترام اور پریشانی سے معذرت کر لی تھی۔

”بے بے اکیلی ہیں۔ کافی کام باقی ہے۔ کانسٹرکٹرز کی پارٹی مفقوبہ ورت کرے گی۔ مجھے اصل میں بے بے کے بغیر نہیں گئے جانے کا پروگرام تھا۔“

نہ جانا چاہے انسان تو ہمارے بے حساب ڈیلیس بے شمار۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خود کو بے وقعت نہیں کرے گی۔ غار اور سارہ کی محبت کا احرام اپنی جگہ۔ بے بے کے اصرار کو بھی وہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن وہ اس پارٹی سے بچنے کے لیے جتن سے جتنی پھری۔ حتیٰ کہ وہ شور مچانے والا اور ہنگامہ کرنے والا قافلہ گھر کو دیران کر کے چلا گیا۔

متمحل کے مطابق بے بے کے پاس آج بھی۔

پھر سرجن غار کے احرام میں اس نے رات کے کھانے کے لیے اپنے چاکلی ہند کے دو کھانے بڑائے۔ یہ عجیب اتفاق تھا۔ سرجن غار ہراس کھانے پر مرتے تھے جو ان کے گھر میں اکثر پکا تھا۔ کالی تو ریاں اور سبز

ماست تھی۔ بیلا کو لگا۔ اس کا سارا لے کر یہ کسی اور کونسلے کی کوشش کی ہے لیکن وہ کوئی اور اس
جست کے لئے کون ہو سکتا ہے۔
اس کے حلق میں ممکن یا نہیں اگلے لگا۔ واقعی وہ یہاں عمر بھر کی خدمت میں زندگی بھی تنگ دے وہ اس
علاقے کے لوگ اس کو نہیں قہقہے کے سوائے بے بے کے اور بے بے بھی ڈر کے خوف سے۔
آہستہ آہستہ۔۔۔
خان محل بھی شاید اس کو اس علاقے میں مان لیں۔ اگر وہ ان کی شرائط پر پوری اترے۔ وہ ان جیسا
لباس پہنے۔ ان کی زبان بولے۔ لیکن اس میں بھی گارنٹی کوئی نہیں۔
سیرس تھکت اور غور سے گردن اٹھائے تھے۔ بالکل بے نیاز سارے پشتوں پر کچھ کہہ رہی
تھی۔ سرجن ڈاکر کی موجودگی میں جو عام اردو بولی جاتی تھی اب اس کا لحاظ نہیں رہا تھا۔

رات کو ہر کام سے فارغ ہو کر اس نے فرحت سے ان کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کی ہر جگہ ست
اچھی تھی۔ بہت تحقیق کاغذ استعمال ہوا تھا۔ پانچونگ بھی لایا جواب تھی۔ تیل سے چھپڑے تھیں بیسا
ٹائل۔ درویشوں کا بیٹوں اور فرشتوں کے بیٹوں کے بیڑا بن۔
اسے افسوس سا ہوا۔ یہ لوگ گورنمنٹ کے سب ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ حکومت پاکستان کے وفادار ہیں
لیکن پھر بھی سوادری اور جاگیر داری کے نقشے میں چور چور اسے سرجن ڈاکر کے کچھ کامت دکھ ہو۔ وہ
بجانب سے تھکے قسمت نے ان کو ٹیپن میں سرحد میں لایا اور جانے سرحد ان کو کب اپنا لے گی۔
وہ ان کی دی ہوئی کتابوں کو ورق ورق کر کے بہت دھیان اور بہت احتیاط سے پڑھتی رہی۔ گو وہ خود
آسانی سے پڑھتا پڑھتی شاعری سمجھ نہیں سکتی تھی۔ آخر میں کچھ سنی تھے۔ اور یہ غالب تھا اس کا پاپا۔
کس کے گھر جانے کا سیلاب جا میسرے بعد

اس نے نرم گلیہ عادتاً "پیشہ پر رکھا۔ لپٹ آف کیا۔ ٹائٹ لیب بستر کے ساتھ جک کر لے ایک قاتر
سے آہستہ آہستہ وہ غالب کا مصرعہ دہرانے لگی۔ وہ تو خواہ ایک سیلاب بلا تھی۔ اور بتائیں کس کے گھر
جانے گی۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی تھی۔ اس کو لگا اس کے دروازے کے باہر کوئی ہے۔

اسے شدید شہر آری تھی اور غالب "ی سو بھی گئی تھی۔ کتنی رات گزرتی تھی پہلے پہل اسے شک گزرا
سارہ شہر میں وغیرہ کسی پروگرام کی تیاری میں مشغول ہیں یا۔ لیکن اتنی رات گئے ایک سائیز ٹیبل سے
گڑی اٹھا کر دیکھی چمکتے سنہری ڈائل رات کے سوا دوا بیچے کا پتہ دے رہے تھے۔ وہ ہر دو گئی۔ اتنی رات
کے اس کے دروازے پر کون ہو سکتا ہے۔ اس کا گھر تو رات میں بھی نہیں پڑا۔ کہ کوئی انتہائی سے جا گئے
والا یہاں سے گزرا ہو۔ وہ مکمل طور پر بیدار ہو گئی تھی۔ اور ہلکی ہو کر خوفزدہ۔

اسے لگا۔ اس کے دروازے پر ہو کوئی ہے شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس کو بکا رہا
ہے۔ وہ بے ساختگی میں دروازے کی طرف بڑھی کہ بولت کھول دے۔
لیکن ٹھٹک کر رک گئی۔ لیکن تکلیف میں مبتلا کوئی شخص اس کے پاس کیا کرنے آیا ہے۔ وہ ڈاکٹر تو
نہیں ہے۔

مسالے کاؤشت وہ کچن میں تھوڑی دیر مصروف رہ کر واپس اپنے کمرے میں گیا۔
رات کے کھانے سے پہلے وہ لوگ واپس آ گئے۔ بے باہر کے خطوں سے تھرا کر آسمان کی طرف
پھونک پھونک کر دو کر رہی تھیں۔ وہ آئے تو بے پروا تھے۔ ان کے پیٹ بھرے ہوئے اور جسم ٹھکے
ہوئے تھے۔ اس کے بعد بھی سرجن ڈاکر نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اور جی بھر کر حریف کی۔ وہ عجیب سا وہ
کھلے دل کے آدمی تھے۔ گوشی کے بعد اگر کوئی شخص اس کو واقعی دوستی کے لائق لگا تو وہ سرجن ڈاکر تھے۔ وہ
جتنی دیر اس کے آس پاس رہتے اس کی کسی نہ کسی بات کی حریف میں زمین آسمان کے فاصلے کا کراس کا
خون بڑھاتے رہتے۔ باقی لوگ برائے نام ہی کھانا کھا رہے تھے۔ کیونکہ دن بھر انہوں نے خوب جگا تھا۔
لیکن وہ بے تحاشا خوش اور نواذ تھے۔ عام طور پر جب ان کی محفل میں وانیل خان نہ ہوتے تو اسے ہی
خوش ہوتے۔ تھتھے جیسے اہل اہل کر کرتے۔ وانیل خان کی زندگی بہت مصروف تھی۔ سارا دن ان کے
پاس گزار کر ان کا دست ہر ہر ہوا تھا۔ وہ اپنے انس میں جا بیٹھے تھے۔ وہ ان کی محفل میں جتنا بھی ریزہ رو
رہتے وانیل خان کے بغیر ان کا گزارا بھی نہیں تھا۔

صبح ناشتا کرنے سے پہلے سرجن ڈاکر واپس چلے گئے۔ وہ لوگ ناشتا کرنے میں زبرد آئے تو معلوم ہوا کہ
وانیل خان نے ان کو صبح کی نماز کے ساتھ ہی پشاور روانہ کر دیا ہے۔ کیونکہ سرجن ڈاکر کا آج کلنگ میں
کوئی اہم کام تھا۔ شاید باقی سب لوگ ان کے ارادوں سے آگاہ تھے۔ سوائے بے باہر کے۔ کیونکہ
وہی وہ تو اس خبر حیران ہوئے تھے۔ بے باہر الفاظ کی صورت میں اور بیلا گفتگو کے بغیر۔

"بے باہر ہم لوگ ان کو کڑوسی کے گھٹ تک رخصت کرنے گئے۔ پھر پیدل واپس آئے اور ہاں
آپ کے لیے انہوں نے ایک تحفہ بھی دیا ہے۔"

"تحفہ؟" بیلا نے حیرت سے سرائیا۔ سارہ اسی سے مخاطب تھی۔

"ہاں تحفہ۔ نوٹس آف نرنڈ شپ کے طور پر انہوں نے یہی کہا تھا۔"

"وہ کیا چیز ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جو مجموعی ہلے سائز، پھر موٹائی چھوٹے سوال" آیا وہ غم ہے کہ سخت۔"

"اگر واقعی انہوں نے کوئی تحفہ دیا ہے تو وہ کتاب ہوگی۔"

"ہاں۔" سارہ نے حیرت سے سرس کی طرف دیکھا۔

"مکمل ہو گیا ہے تحفہ کو تو مکمل ہر جہاں۔ اور اس قدر تھیں۔ لیکن دینے کے معاملے میں شک۔" وہ
دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی۔ ایک کم مونا لیکن خوب چوڑا مائیک آٹھ لائی۔ ویلا نے سب کی موجودگی
میں بیکٹ کھولا اور سب کے ہتھکے ہوئے سروں کے درمیان سے چلی گئی کتابیں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

یہ چار کتابیں تھیں۔ کلام علیہ شاہ کلام ہامہ فرید الرحمن بابا اور دیوان غالب۔

بیکٹ پر اسکا چٹا بیٹہ اسے خوش کارڈ پر لکھا تھا۔ "ہم کسی سے نفرت نہیں کرتے ہیں نا۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ یہ سب لوگ خان تھے۔ باقی علاقوں سے تعلق رکھنے والے اپنی اپنی ذات اور
زبان کے قیدی۔ ان میں صرف وہ دو ذول بنی باہر کے تھے۔ ان سے امتیازی تھے اور غیر۔

گویا یہاں جو عام طور پر غیر بھائیوں سے نفرت کی جاتی ہے اس کا شمار صرف وہی نہیں۔ سرجن ڈاکر بھی
تھے۔ سرجن ڈاکر کے اس ماہ سے چھوٹے فخرے میں اس کو شکایتیں نظر آ رہی تھیں۔ ماسٹ تھا۔

”ہیلا“ دروازے پر جیسے کسی نے انگلی سے دستک دی۔ دھیمی آواز دہا ہوا الجھ۔ اور ایک لمبی آواز
دروازے کے بالکل قریب گڑھی تھی۔ اور یہ آواز تو وہاں کھول کر آوازوں کے شور میں پھولی مچان سکتی تھی۔
اس کی تیرہ بالکل ہلکا گئی۔ اس نے بے ساختگی میں کی ہول تھا کہ دروازہ پر اچھول دیا۔ اس کا اندازہ غلط
نہیں تھا۔
”کیا آپ جاگ رہی ہیں۔“ دانیال خان نے ایک ہاتھ سے سارے کے لیے اس کے دروازے کی
چوٹ پکڑ رکھی تھی۔ وہ ایسے لباس میں تھے جیسے انہی ہاتھ سے آئے ہوں۔ فل بوٹ کرم جیکٹ میں ان
کے ہرے کی تکلیف چھپی نہیں تھی۔

”جی“
”کیا آپ توڑی در کے لیے میرے ساتھ آئیں گی۔ میرے کمرے میں؟“ وہ اپنی بات کہہ کر اس لہجے
سے مڑ گئے جیسے وہ ان کی ہر بات بھی ٹال ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ میکانیکی انداز میں دو قدم اٹھا کر گئے۔
کرم کمرے کے لیے بس باہر بہت سہولت ہے۔ کوئی اور کمرہ یا کمرہ شمال۔“
وہ واپس اپنے کمرے میں مڑی۔ گرم کالی چادر کندھوں پر ڈال کر وہ انہی قدموں سے ان کے پیچھے آگئی۔
وہ اس سے دو قدم آگے ہو گئے تھے لیکن اسے محسوس ہوا وہ چلتے ہوئے لڑکھڑاہے ہوں۔ اور ہر قدم پر ان
کے منہ سے ایک اذیت بھری آواز نکلتی تھی۔ وہ ہونٹوں میں دبا کر دیکھ رہے تھے اس کے باوجود ان کے
قدم ہموار ترتیب سے اور تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ اس کو ان کا ساتھ دینے کے لیے دوڑنا پڑا۔ اس کے
کمرے سے ان کے کمرے تک بہت فاصلہ تھا۔ وہ ادھار اسٹے کرنے کے بعد بل کھاتے زینے کی
رینگ کے پاس رک گئے۔ چست میں مضبوط جسمی روشنی کے بلب میں اس نے دیکھا ان کا چہرہ سرسوں
کی طرح زرد تھا۔ آنکھوں کی ذہانت کسی اذیت کا شکار ہو کر دم مری ہو گئی تھی۔ وہ جیسے مزید چلنے کے قابل
نہیں رہے تھے لیکن بہت جلد یہ فاصلہ طے کرنا چاہ رہے تھے۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اس نے ان کے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرا دیا۔ کچھ بھر کے لیے انہوں نے اپنی کمرے
”شش“ انہوں نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرا دیا۔ کچھ بھر کے لیے انہوں نے اپنی کمرے
ٹھیک لگا کر بیٹھا۔ کاسہارا لیا۔ پھر ملے اور بری طبعی لڑکھڑا گئے۔
”آپ میرا سہارا لے لیں۔“ وہ کشادہ روی سے کہہ کر ٹھیک گئی۔ ”میرا مطلب ہے اگر آپ۔“
انہوں نے ہاتھ پیرھا کر اس کے شانے کا سہارا لے لیا۔ ”آپ“ ایک چھٹی سی آواز ان کے منہ سے
نکل گئی۔ جیسے اس طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ وہ دھڑکی بھاری سا ٹھٹھا ان کے ہاتھ اس کی پشت سے گزرا
اس کے اوپر اس کے کندھے پر آکر ٹھیک لگا تھا۔ شاید اس طرح ان کے لیے جتنا آسان ہو گیا تھا۔
کتنے دنوں اور کتنی صدیاں گزریں۔ ایک آدھ پہلے بھی انہوں نے اسی طرح چند قدم اٹھائے تھے۔
کلن کتابے تاریخ اور وقت اپنے آپ کو نہیں دہراتے۔ صرف اسی فرق کے ساتھ کہ دور کس کونڈ
رات کے بھیا تک مناتے ہیں دو رہے تھے۔ کتوں کے ایک ہوا ترے سے بھونکنے والی آوازیں اسے غور
کر رہی تھیں۔ انہوں نے اس کا سہارا لینے کے باوجود اپنا بوجھ خود اٹھا رکھا تھا۔ چند قدم چل کر انہوں نے
اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔
”آپ ڈر رہی ہیں؟“

”تھوڑا سا۔“ اس نے دوا انداز میں کہا۔
”جنگل ہے اور آسمان ہر طرح کے جانوروں پر ہے۔ ہر طرح کے۔“ انہوں نے سچی خیریت کو اپنی زنجی
چال کے ساتھ برقرار رکھا۔ اور مطمئن نہیں ہو کر خود کسی جنگلی جانور کا شکار ہو کر آگے بڑھیں۔ اور کان
جاملے ہوئے تھے۔

”اور آپ کو پڑنا نہیں ہے۔ کیونکہ میں آپ سے بہت مشکل کام لینے والا ہوں۔“
انہوں نے تکیے کی ایک اور دو ٹول میں کچلی۔ سیدھی ہی بل میں مشروط اور ہلکا ہو گئی۔ پتا نہیں
جس دم کے لیے بلانی گئی تھی۔ اس قابل بھی ہو کہ نہیں۔ لیکن اس کو کسی نہ کسی قابل ہی دیکھنا
ہے۔ اور سامنے ہی دانیال خان کے کمرے تھے۔ بل کھاتے زینے کے اوپر لائبریری۔ پیچھے یہ خانہ اور
ساتھ ساتھ ان کے آفس۔ وہ بیڑھیاں اترے اور چڑھنے کے بجائے اپنے سونے والے کمرے میں داخل
ہو گئے۔

”آئیے۔“ انہوں نے دروازہ کھول کر اندر آنے کے لیے راستہ بنا لیا جیسے وہ ان کے گھر مہمان آئی تھی۔
”ہاں۔“ اس کو پری بیٹھے تو ایک لمبی طویل آہ سے ایک مدت اور وقت سے انہوں نے سینے میں دبا رکھا تھا
پہلے ہی گئی۔
”آپ کو زحمت تو ہوگی پورا یہ چادر تو سچھت۔“

اوڑھنے والی خوبصورت سی سفید چادر انہوں نے بوٹ کے پیچھے رکھی اور آہستہ آہستہ فل بوٹ کے
نئے کھونٹے شروع کر دیے۔
”یہ بڑے اچھی طرح گرا دیں۔ اندر کی روشنی باہر بالکل نہیں جانی چاہیے۔“ رسی فٹروں کو بلانے
طاق رکھ کر انہوں نے احتکات جاری کرنے شروع کر دیے۔ شدید لفظوں میں خلع کرنے کے لیے ان کے
پاس وقت نہیں چاہتا۔

اس نے سینی انداز میں یک کھینچ کر پاؤں طرف کے پورے برابر کر دیے۔ تیز مسٹارنگ کے ویلوٹ
کے پروں نے سینی طور پر روشنی کے انعکاس کو ناممکن بنا دیا ہو گا۔ اختیاطاً اس نے شیشے کے لاک چیک
کیے۔ یہ تو اسے پتا چل گیا تھا۔ اندر جو کچھ ہونے والا ہے نہایت رازداری کا معاملہ ہے۔ لیکن کیا ہونے
الایہ شاید اس کے فرشتے بھی پہل تک نہیں سوچ سکتے تھے۔ دائیں پاؤں کے فل بوٹ کے نیچے
کل کر ایک اذیت ناک آواز سے انہوں نے جو ہانا رات ایک لمبی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔

”سوری“ اس نے اپنا منہ اپنی ہی تھیلی کے زور سے سمجھ لیا۔
ان کا فل بوٹ خون سے تر مسقید چادر پر گر پڑا تھا۔ ابھی تک ان کی زخمی ٹانگ سے سرخ خون کے
قرعے چپکے ہوئے تھے۔
”ڈر رہی ہو یا؟“ انہوں نے بلاشر تکلیف کی شدت میں اسے شدید اپناہت سے پکارا تھا۔
”میں واقعی ڈر رہی ہوں۔ آپ ٹھیک سمجھیں۔ میں ایک سے زائد مرتبہ آپ کو اس آزمائش میں
لا کر چکا ہوں۔“
وہ خاموشی سے ان کے زخمی پاؤں کے نزدیک دوڑا تو بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ ان سے بحث کی پوزیشن میں
نہیں تھی۔ سورت وہ اس سے ایک ان کہا بیان مضبوط کرنے کی وجہ ضرور دریافت کرتی۔

ہو جاؤں، چھین ماروں اور زور زور سے روڑوں۔ لیکن بس میں صرف برداشت کر لیتی ہوں۔ وہ بھی اپنی تکلیف برداشت کر رہے تھے حالانکہ وہ دلچسپی رکھتی تھی کہ دم بہ دم ان کی تکلیف میں کتنا اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر تیز دھار چھری الٹ پر تپائے لگی۔ چھری کی دھات تپ کر سنہری ہو گئی تھی۔

”بس اب اس کو ایک طرف رکھ دیجئے اور بڑے دھیان سے میری بات سنئے۔“ وہ اتنا دھیان کہاں سے لاتی۔ اس نے چھری اٹھا کر پیتل کی ڈیکوریٹن والی پلیٹ پر رکھ دی۔ اور حکم کے بموجب ان کے قریب آگئی۔

”ہاں“ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ”اب یہ تھوڑے سے ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ اور کانپ بھی رہے ہیں۔ لیکن اتنے نہیں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہو تو اب تک بے ہوش ہو چکا ہوتا۔“ وہ اتنی اذیت میں مسکرا رہے تھے۔ تکلیف اٹھا کر اس کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ اس نے ایک گمراہ سانس لیا۔ اسے گلے میں پڑے اس ہمارے کسی دھول کو تو بھانا ہی تھا۔

”میں ڈری ہوئی نہیں ہوں۔ شاید تھوڑی سی سردی ہے۔ آپ بتائیے اب کیا کرنا ہے۔“ ”یہ دیکھیے۔“ انہوں نے میڈیکل بکس کھولا۔ ”یہ گاز ہے۔ یہ کاتن اور سفید رنگ کا سفوف اس کے زین پائوڈر ہے۔ آپ اس جگہ کٹ لگائیں گی۔ اس چوٹی سے کوئی کھینچ لیں گی۔ یہ سرخ والی دوائی لگا کر یہ ڈھیر سارا پاؤڈر الٹ دس کی اس کے فوراً بعد آپ کو ڈریٹنگ کرنی ہے۔ اور اگر میں بے ہوش ہو گیا تو یہ سالت میری ناک سے لگانا ہے۔“

اس کامل جیسے دھڑکتا بھول کر ایک جگہ رکھا ہوا تھا۔ سانس ٹھہر گئی تھی۔ وہ کسی باہر مریض کی طرح سینہ طالب علموں کو بڑی بے نیازی سے جیسے کسی اور مریض کی سرجری کی تفصیل بتا رہے تھے۔

”اور اگر میں شور مچاؤں۔ گھبرا جاؤں۔ یا میری چیخ نکل جائے تو آپ نہیں گھبرائیں گی۔ نہ افراتفری میں کسی کو ہانے نکل جائیں گی۔ آپ تیار ہیں۔“

”جی“ اس نے ثابت اور صاف آواز میں کہا۔

”تو ہمسایہ بڑھے۔“ وہ اٹھی تو اس کے ذرا کھڑائے تھے۔ لیکن قیمت ہوا کہ وائٹل زخموں سے بھیگی روئی سے خون پونچھ رہے تھے۔ ان کا چہرہ تکلیف کی شدت سے نیلا نیلا تھا۔ لیکن وہ ہر مرتبہ اس سے آنکھیں ملنے ہی کر اذیت۔ وہ صبر و ضبط کے اعلا ترین میدان جیت کر سرخروئی اور ہمارے سے بیٹھے ہمارے اندر کہیں دم سے چارہ تھے۔

وہ چپ چپ چھری اٹھا لائی چھری اب ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

اس نے ان کے کندھے کے مطابق پہلے ٹیبلٹ والی روئی سے ڈس انفیکٹ کیا۔

دائیں ٹانگہ کے دوئیں میں وہ ابھری ہوئی چھوٹی سی پلیٹ تقریباً ”باہری پڑی“ تھی۔ لمبے کاشیڈ نیچے جھکا

راس نے تمام تر محنت سے چھری۔ ان کے زخم پر رکھ کر دوائی۔

”اللہ“ پچھلا ہونٹ دانتوں میں پیچ کر انہوں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”اپنے ہاتھ دکھائیے۔“ اول“ انہوں نے اس کے پھیلائے ہوئے ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبا کر چھوڑ دیئے۔

”مستحق نہیں ہیں۔ اور کانپ بھی نہیں رہے۔ اسی لیے میں نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اور آپ کے سوا کسی کا کر بھی نہیں سکتا تھا۔“ پچھلا میمری پنڈلی میں کوئی لگی ہے۔ ”انہوں نے ہاتھ ہوتے سانس کے ساتھ خود کو کرسی سے جیسے نیچے قایلین پر گرالیا۔“ اور یہ کوئی آپ کو نکالنی ہوگی۔“

”اے۔“ وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ ”کیوں ناگزہی کے ڈاکٹر کو لائیں؟“

”کوئی ڈاکٹر نہیں۔“ انہوں نے قطعیت سے کہا۔

کسی اور کو اٹھا دیتے ہیں۔ قیمت خان کو۔“

”کوئی کسی کو نہیں۔“ انہوں نے برہمی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”قیمت خان کو تو کسی قیمت پر نہیں اور آپ کو مہاتمسور نہیں کرنی چاہیے۔ اگر کچھ دیر اور گزرنی تو جسم میں بڑا خوفناک انفیکشن شروع ہو جائے گا۔ یعنی زہر پھیل جائے گا۔“ وہ اپنے اسی غیر رواداری والے بے پریٹ آئے تھے۔

”سسٹم میں جائے۔“ چلی الماریوں میں سے اتھرائی لٹ والی الماری میں میرا ٹول بکس پڑا ہے۔ اٹھا لیا۔ اور اتنی خاموشی سے، اتنے دلیلاؤں جیسے ملی جاتی ہے۔

اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور احکامات کی تعمیل میں چپ چاپ باہر نکل آئی۔ ان کی حس مزاج کسی بھی ناموزن جگہ بدکار ہو سکتی ہے۔ وہ تیزی سے بیڑھیاں اترتی پیچھے چلی گئی۔ معلوم نہیں اس کو ہسپتال کی بجلی جالانے کا اختیار ہے بھی یا نہیں۔ لیکن بجلی جالانے بغیر وہ نہ الماری تلاش کر سکتی تھی نہ کھول سکتی تھی۔

بست جلدی وہ ٹول بکس لے کر بغیر کوئی آواز پیدا کیے واپس آگئی۔

”گڈ۔“ وہ قرقر پر بیٹھے بیٹھے بولے۔ ”آپ نے محسوس کیا۔ باہر کسی قسم کی کوئی آواز تو نہیں تھی؟“

”میرے خیال میں تو سب سو رہے ہیں۔“

”ہوں۔ اب یہ بکس میرے پاس رکھ دیجئے۔ اور ڈریٹنگ روم سے میرا میڈیکل بکس اٹھا لائیے۔“

وہ نہایت تابعداری سے کمرے اور غسل خانے کے درمیان والے ڈریٹنگ روم کی وارڈ روپ سے ان کا میڈیکل بکس اٹھا لائی۔

”یہ لمبے بالکل نزدیک لے آئیے۔ یہاں اس طرح ایسے شاپ۔“

انہوں نے ٹول بکس کھول کر ایک تیز دھار چاقو نکالا۔ اس کی دھار کو انگلی پر چبک کیا۔

”ڈر! اس کو آگ پر سرخ کر دیجئے۔“ اس کے سناٹے نکل گئے۔ اس ایک سے سے پہلے اس کے گلن میں بھی نہیں تھا۔ وہ اس سے کیا کام لینے والے ہیں۔

”بھلا“ وہ بہت نرم روی سے کہہ رہے تھے۔

”میں نے آزمایا بھی ہے۔ دیکھا بھی ہے۔ آپ بہت بہادر ہیں۔ بہت باہمت لڑکی ہیں۔ یہ کوشش آپ ہی کر سکیں گی۔“ یہ اچھا مذاق ہے۔ بار بار اس کو ایک مصیبت دکھا کر یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ بہادر ہے۔

بست ہمارے۔

حالانکہ میں بہت بڑبڑا ہوں۔ اس نے سوچا۔ میرا بھی ایسے واقعات پر جی چاہتا ہے میں ہسپتال

”بے۔ لا۔ بے۔ لا۔ بے۔ لا۔“ ہنسی بھری نگاہوں میں ایک قاتل سے خون کی بوتلوں کی طرح اس کے کان میں ٹپک رہا تھا وہ چھری آہستہ آہستہ گھمائی ٹانگہ میں گناؤ گناؤ کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ پتیل جیسی وہ چھوٹی گولی یا مکر لٹک گئی۔ اس نے دس اذیت بھری شرہ چھٹی سے کھینچی گولی ٹپک سے پتیل کی پیٹ پر گرائی۔

آؤ ہمارا حلقہ بھرو خونی گزریا۔
لیکن وانیال خان کو زخموں کی شدت سے چور چور بے ہوش سا کر گیا۔ ان کا سر ایک طرف لٹکا ہوا تھا۔ آنکھیں غنودگی کی حالت میں نیم کھلی تھیں۔ اور ٹانگہ سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے ٹانگہ سے دھیان ہٹا کر تیزی سے سانس والی شیشی ان کی ٹانگ کی طرف بڑھائی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے قنابت سے اس کا ہاتھ پرے ہٹا دیا۔ ”آپ ڈرنک سمجھتے“
وہ تیزی میں نیچے جھک کر پاؤں اور بدلو دار بند کورہ واؤں کے چکر کاؤ کے بعد آہستہ آہستہ پٹی کسے لگی۔ موٹی روئی اور ٹھنڈے پانی کے بار بار چھینٹوں سے خون بہنے کی رفتار میں کمی آگئی تھی۔ کسی تھکے وقت میں کیا فرسٹ ایڈ کا گورنر ہی کام آیا۔ ورنہ کوئی زخم کے ایسے حصے پر آسانی سے پٹی باندھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی چاکلہ دست ڈسینس کی طرح ہنسی محبت سے ڈرنک کے بل تقسیم کر رہی تھی۔

انیت ناگ مراحل رات کے اس بڑھتے پہر میں آہستہ آہستہ گزری گئے۔
اس نے وہیں بہت سے فلور کشن اوپر اوپر بچھا کر ان کے لیے قالیں پر ہی آرام بہ بستر تار کر دیا۔ خون آلود چادر سمیٹ لی۔ ٹول بکس اور میڈیکل بکس ایک طرف دھوپے۔

”آپ کے لیے دودھ لادوں۔“ گرم دودھ اچھا رہے گا۔“
”نہیں۔“ شکر ہے۔“ انہوں نے وہیں تکیوں پر دروازہ دھک کر آنکھیں موند لیں۔ ”چھڑوں کو اپنی جگہ پر واپس رکھ کر میرے پاس آئیے اور دھیان سے میری بات سنئے۔“

ان کی بند آنکھوں سے اور پیشانی پر لکیوں میں تکلیف لکھی تھی۔ ان کا رنگ ایک دم ہی سفید پڑ گیا تھا اس وقت ان کو دودھ کے ایک گرم گلاس کی شدید ضرورت تھی۔ لیکن وہ شاید اس کا باورچی خانے میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس طرح جاگے جانے کا ڈر تھا۔ اسٹڈی میں رکھے فریق میں دودھ نڈا رو تھا۔

”آپ کو بیک کافی بے دوں؟“
”ہاں یہ ٹھیک رہے گی۔“ انہوں نے آنکھیں کھولیں تو وہ سرخ بھی تھیں اور تھکی ہوئی بھی۔ وہ بیٹر پانی بال کنزائی پور مل کر کے ان کے پاس لائی تو وہ نیمہ آنکھوں سے ہٹھک رہی تھی۔

”یہاں۔“ انہوں نے چور آواز میں جیسے انہوں نے اسے خواب سے بکرا تھا۔
”میں نے تمہیں کس قدر تھکا ڈالا ہے۔ رات کے ایسے وقت میں جب ساری دنیا چین کی نیند سو رہی ہے۔ تمہیں میں نے تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تم بھی مجھ پر اہت بھیجی ہو گی۔“

”بالکل نہیں۔“ وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس ہی آ بیٹھی۔ بے ہوشی کے بالکل نزدیک جا کر بھی انہوں نے خود پر سے اختیار نہیں کھوایا تھا۔ وہ افسوس کرنا محذرت کرنا، مسکرا کر کچھ بھی تو نہیں بھولے تھے۔

”تم نے کتنی بری رات گزار دی ہے۔ نیلا کیا تمہارے رات بھول جاؤں گی۔“

وہ چکی رہ گئی۔ پتا نہیں وہ اس سے بھول جانے کا مطالبہ کر رہے تھے یا نہ بھولنے کا۔
”یہاں اس گھر میں بہت سے لوگ موبہ ہیں۔ خان کل ہیں پشیریں ہیں مارہ ہے۔ لیکن میں اس کام کے لیے تمہارے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔“

”شاید اس لیے کہ میں ہمارے ہوں۔“ آپ کے بقول۔ اس نے دل میں سوچا۔
انہوں نے آنکھیں موند کر سر دوبارہ کھینچے پر نکال دیا۔
”اور میں کسی پر غلط بھروسہ نہیں کرتا۔ دیکھو، تم نے عام لڑکیوں کی طرح مجھ سے فضول سوال نہیں کیے۔ کہ یہ گولی کہاں سے لگی ہے؟ کس نے چلائی؟ رات کے وقت میں کہاں تھا؟ میرے گارڈز کدھر تھے؟ حالانکہ یہ سب سوال تمہارے دل میں بھی موجود ہوں گے۔“

اس نے ان کا خالی کیا ٹانگ ایک طرف رکھ دیا۔
”دیکھو بیلا۔ گھر بھر میں اس واقعہ کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ گورنری کی سیاست میں ایک ہلٹ کا مطلب ایک ہلٹ نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ہے دس خون۔ خان کل قیمت خن کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہونے پائے ورنہ وہ خون خرابہ مجاویں گے۔ وہاں کے دس آدمی کھڑے کھڑے بھون دس گے۔ اور ان کے آدمی ہمارے سر آدمی۔ یہ یہاں کی روایت ہے کہ ایک خون کا انتقام ہزاروں خون بہا کر لے لوں تک چلتا ہے۔“

”لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ کی زندگی محفوظ ہے۔“
”مجھے پتہ ہے اس کا برف ہاتھ انہوں نے سہانگی میں اپنی گرفت میں لے لیا۔
”چھوٹی سی بہادر لڑکی۔ تم فکر نہیں کرو۔ زندگی تو صرف خدا ہی لے سکتا ہے۔ اور وقت سے پہلے کچھ ممکن نہیں۔“ وہ تم تو ٹھنڈی برف ہو رہی ہو۔ اپنے اوپر کس وال او۔“

”میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔“
”ہاں، نہیں اب جانا چاہیے۔“ بے خیالی میں اپنا فقرہ ادا کر کے انہوں نے اپنی گرفت میں لیے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ بھی جمایا۔ دو ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں اس کا ٹھنڈا برف ہاتھ نہیں چھپا ہوا تھا۔

”تمہیں جانا چاہیے۔“ انہوں نے والی ہے۔“
انہوں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کیے بغیر اپنی بات دہرائی تھی۔

”خدا حافظ۔“
”خدا حافظ۔“ اسی دھبی آواز میں جواب دے کر وہ اسی طرح لیٹے تھے۔

”مجھے پتا ہے پلیز۔“
”ہوں۔“

”صبح ہونے ہی والی ہے۔“
”ہاں بیلا۔ تم جاؤ۔ اچھا ہے تھوڑا سا سو لیٹ۔“ انہوں نے ہند مٹھیاں کھول دیں۔

وہ خون آلود چادر اٹھا کر دروازے تک گئی تھی۔ پھر رک گئی۔
”کیا رات بھر یہ دروازہ کھلا رہے گا۔ آپ کی زندگی محفوظ کا تو ہے نا؟“
وہ گروں ہزار سی اٹھا کر مسکرا بیٹے۔

”جب تک تم ہو بیلا۔ مجھے نقصان پہنچانے والوں کو شکست دینی رہو گی۔ تمہارے دوست میری زندگی ہر طرح محفوظ ہے۔ یہ چادر آبتار میں مبلوٹا۔ راستے میں قاتلین پر خون کے دھبے کہیں نہ پگھلے ہوں تو ان پر پاؤں چھڑک دیتا۔ اور کھل اور کھنکھڑا چھی طرح سوتا۔ تمہیں کالی سرودی لگ چکی ہے۔ کہیں بخار و خارش نہ پڑے۔ اور اب جاؤ۔ خدا حافظ میری۔“

انہوں نے تھلا ہونٹ کاٹ کر قہر وادھر راچھوڑ دیا۔

وہ دروازہ نہ کر کے باہر آئی تو ذہن سے ایک بوجھ آہستہ سے سرگ گیا۔ سامنے میسر پر روشن چاند نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ صبح ہونے کی والی تھی۔ اس نے گھراساں اپنے ہاتھوں میں بھر کر مانہ واکالخت لیا۔

”خدا حافظ“ اس نے ہونٹوں میں بیدار کر کہا۔

راہداروں کے شیشوں سے پرے زرد چاند کسی خلست خوردہ مایوس انسان کی طرح بچھا بچھا اور تھکا تھکا سا تھا۔

سرودی کی شدت میں موت کو اپنے اتنے نزدیک دیکھ کر اس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے یہ برف ہاتھ اس کے ہاتھوں میں جکے لگے لرزہ رہے تھے جو اپنی ہر اذیت ہر تکلف رانٹوں میں کچل کچل کر خاموش ہوا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ اجنبی ’’اجنبی مقدس‘‘ مقدس سے دکھائی دے چکا تھا۔ دینے والی غشیری سرودی میں وہ ایک عجیب و غریب رات گزار کر آئی تھی۔ کتنی دیر ’’ان ہاتھوں پر کسی اور کا تلاء رہا تھا۔ اور پتا نہیں کتنی دیر ‘‘ان ہاتھوں نے مسیحا کے نام پر خون بہایا تھا جو ابھی تک پور پور کانپ رہے تھے۔ پتا نہیں سرودی کی شدت سے یا جذبول کی افراط سے۔

یہ نقد پر کی پہلی دوسری نہیں پتا نہیں کون سوس ستم تفریق تھی۔

آٹھ بھلا جو نگہ تم بہادر ہو۔ اس لیے تم پر یہ فوج عائد کی جاتی ہے کہ اس بہادری کی سزا بھگتو۔ اب عمر بھر ان نہ ٹیکھنے والی آنکھوں سے ٹکرا کر گھر گھر کر تم دیر ہو اور دیر روٹے نہیں بہادر ہو سوتے نہیں۔

اور عمر نہ بھی بیت جائے تو وہ لوگوں کو یہ نہیں سمجھا سکے گی کہ میرے گلے سے یہ خون اتار دو۔ میں بہادر نہیں۔ میں تو اپنی ہی کمزور لڑکی ہوں۔ بالکل بزدل۔ کتنی شدت سے میرا بھی جی چاہتا ہے۔ نہ کسی کا گروہ اور چھٹی کو کچھ کہہ لیکن ایسے نازک نازک وقتوں میں میں بھی دھماؤں مار مار کر روؤں۔ کسی کے کان کے سہارے کسی کا گریبان چھڑک کر ہمتی سے بزدلی سے تین کروں جیسے اس نے ریم چاچا کی ہمتی میں دیکھا تھا۔ عورتیں اس کو ابراہان دیکھ کر فرخاندی سے آواز اور آنسوؤں کے دریا بہاتی تھیں۔ اس لیے بھی شاید کہ ان کو بیٹ کر چپ کروانے والے۔ اور چکار کر خاموش کرانے والے موجود تھے۔ وہ جوان کے اپنے تھے جن کے ساتھ مل کر وہ اس کے شمار جانے کا نام ہوشی کر سکتی تھیں۔

چلتے صاف شیشوں کے پیچھے کالی رات کے آخری حصے کا چاند آج کا اپنا سترم کرنے کے قریب تھا۔ درختوں کی چوٹیوں پر غنڈی سچ روشنی کی کرنیں ابھی ابھی میسر مار رہی تھیں۔ جنگل کے جانوروں نے اپنا لاپ بند کر دیا تھا۔ اور یہ سب اس بات کی علامات تھیں۔ کہ ایک روشن صبح اس کی منتظر ہے۔

130

اس کے ذمے ایک دو کام تھے۔ اس ڈوبتی رات میں طویل راہداروں میں ملکی روشنی کے بلبلوں میں قاتلوں پر سرخ چھبے تلاش کر کے ان پر لگ لگ کر پاؤں کا چھڑکاؤ کرنا تھا۔ گو یہ معمولی تلاش نہیں تھی لیکن اس کی بصیرت افروز روشن آنکھوں نے اسے آسمان بنا دیا۔ پورے راستے میں اس کو جا بجا قطرے بھرے ملے تھے۔ وہ فاصلوں سے شخصی شخصی بوندوں کی صورت لگے ہوئے تھے۔ اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر قاتلین کے روئیں میں ڈھیر سا را پاؤں چھڑک دیا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ رواں برابر کرتی۔ سفر طے کرتی گئی۔ وہ ایک جگہ ٹھک کر رک گئی۔ قاتلین پر ایک ساتھ بہت سی بوندیں گری گئیں۔ میسر سے گول گھماؤ والا زہن اوپر میسر پر جاتا تھا۔ اور میسر دانیال خان نے چند لمحوں کے لیے اس کے کندھوں پر اپنی سانس ہوا کی تھی۔

زنگی جیسے کچھ دیر کے لیے ٹھہر گئی۔

بست سا را پاؤں اندر مل کر وہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ شاید صبح کی اذان ہونے والی تھی۔ اذان سے پہلے ملازم بیدار ہو کر اوپر آدھر پھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے دانیال خان کے ان کے راز کی حفاظت کرنی ہے تو وقت سے پہلے اپنے کمرے میں شمس جانا چاہیے۔

اس نے مکمل میں کھتے ہی محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں جال رہی ہیں اور گرم گرم ابلتا پانی پلکوں جیسی کمزور دیواروں میں شکاف ڈال کر باہر نکلتا آ رہا ہے۔ اسے خود تری کی یہ کیفیت کبھی نہیں بھولی تھی لیکن آج کتنی شدت سے اس کا جی چاہا وہ چلا چلا کر احتجاج کرے۔ ہڑتال کرے۔ اور تمام تر اعتراضات اور تحفات دینے والوں کو واپس لوٹا دے۔

پھر اس نے سرودی کے زور اور آنسوؤں کے ریلوں کو روکنے کے لیے مکمل سر تک آن لیا۔

اتنے بڑے واسطے کے بعد نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ بھڑے ہوئے ریل ہاتھ میں پکڑے کچھ گشہ لمحوں کی تلاش میں نامکمل سی تھی۔ ان لوگوں کی کسی سے دشمنی ہے؟ اور کیا دشمنی ہے؟

دانیال خان اپنی باتوں کو اتنے راز میں کیوں رکھتے ہیں۔ وہ بار بار حادثوں کا شکار ہوتے ہیں اور ان حادثوں کی پردہ پوشی پر کیوں اس قدر اصرار کرتے ہیں؟

شاید ساری رات بھی ان سوالوں کے جواب کے لیے ناکافی تھی اور اس کے پاس تو یہیں بھی رات کا معمولی حصہ باقی تھا۔

وہ جب بھاگ بھاگ ٹاشٹے کے لیے کمرے میں پہنچی تو درختوں کی تنکوں اور خوف نے اس کو زور زور مار دیا تھا۔

جنگل والا کمرہ خاموشی سے اونگھ رہا تھا۔ ایک کونے میں بے بے کے ساتھ خان محل اپنی پلیٹ میں اکلوتا ملا کس بجائے بے تابی سے کورم پورا ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

”السلام علیکم۔“ اس نے ماسی کے سارے عذاب تک لے فطری بدشت سے دھونے کی کوشش کی۔

”وعلیہم السلام“ خان محل نے دانستہ منہ لہبا سا بنا کر لٹکا رکھا تھا۔ وہ شاید بیلا کو تین دنوں کا تھا۔

نہرا رہوں۔

131

”الحمد للہ۔ ہماری سابقہ نسلیں یہ کلام کرتی رہی ہیں۔ ہم اس کا پھل میا رہے ہیں۔“
”تم لوگوں نے بھی، بھی ساتھ کے جنگل سے چوری کی ہے یا ساتھ کے علاقے کی لڑکی کو۔“
”دیکھو لڑکی! میں خود کچھ کوں گا تو خود ستانگی ہوگی۔ لیکن حقیقت ہے کہ میں یہاں اتنا کام رہا ہوں کہ مجھے یہاں کے ماحول کا ذرہ اثر نہیں ہوتا۔“
”اور وہ آپ کے دانیال خان۔“

”میرے دانیال خان۔“ اس نے نظر بھر کر بیلا کی طرف دیکھا پھر جیسے کوئی نہ نکال سکتے پر محض ہنس دیا۔ ”ان کو میں سرٹیکلیٹ دوں؟ وہ تو جہاں بھر کو سندیں دیتے ہیں۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟ اچانک آپ کو دشمنوں اور دوستوں کی فہرست مرتب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“
”میں سوچ رہی ہوں۔ اپنا نام کس میں شامل کروں؟ دوستوں میں یا دشمنوں میں؟“ اس نے گہری غنڈی گئی تھی۔

”اس کا مطلب ہے ارادے خطرناک ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں تا آپ کی اروسوں۔ پتا نہیں کیا، حسنیوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔ لیکن جہاں بھی ہو گا آپ کا نام الینا اور حم کی طرح سرفہرست ہوگا۔“ اس نے پرانی سی انگلیش ورکر ہرائی۔
”اور ہاں۔ لیسٹ کون سا فرشتہ بتا رہا ہے؟“

”تم بہت بک بک کرتے ہو خان گل۔ اور عقرب تمہاری بک بک بند ہونے والی ہے۔“ وہ کرسی تھپتھپ کر کھڑی ہوئی۔ ”کیونکہ سنا ہے جنگلات میں جھپکے کی ذمہ داری تمہیں سونپی جا رہی ہے۔ ٹینڈر کا ہم بھی تمہی کو کرنا ہے۔“

اس کا چہرہ خیال ساموڈ ایک دم بگڑ گیا۔ جیسے دائرہ ال ایک کاپانی ایک چھتا کے سے نکل جائے۔
”میں وہاں نہیں جانے والا۔ بنانا دانیال خان کو بھی اور اپنی بے کو بھی۔“ وہ خفا خفا سا بڑبڑایا۔ وہ اس کا کپڑا توڑ دیکھ کر خراخراہوا۔ وہ اس کا ذہن سا کھلوانا تھا۔ بیلا بندر۔ برے موڈوں میں ہنسنا تھا۔ اور ہنسنے وقت خوش رکھنا۔ وہ کندھے اچکا کر ہنستی رہی۔
”میں کون بھی؟“

لیکن اس کا بگڑا موڈ سنورا نہیں۔ بہت سارا وقت اچھا گزارنے کی نیت سے بیٹھا خان گل پر ہم ہو کر گل گیا۔ کام کاج سے اس کی جان جاتی تھی۔ کتنی دیر تنہا کمرے میں بیٹھے بیٹھے وہ آگتا سی گئی۔ آج اس کا بھی کام میں دھیان نہیں چاہتا تھا لیکن وہ خاموشی سے آفس جا بیٹھی۔ کبھی کبھی انسان پر ایسی کیفیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جیسے سردیوں میں دھوپ تاپنے کے بعد کی سستی اور کالی۔ ایک ہی کرسی پر آگ ہی جگہ بیٹھے بیٹھے جانے کو کہتے زمانے گزار دیتی اگر پری بے بے کا بلاوانہ لے آتی۔

اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ یوں ایزی چیئر پر پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھ کر سوئے میں آرام بھی آ رہا تھا اور ہکا بکا نرہ بھی۔ وہ اس شے کے سرور سے اتنی جلدی ہاتھ دھو کر پھر بے بے کی کسی بھی کمائیوں کے موڈ میں نہیں کہہ سکتا۔ تھکا کر اس کو جانا تھا۔

سب سے کم سے میں دس بجے والا توہ پیش کیا جا رہا تھا۔ اور اس وقت گیا رہا ہے تھے کمرے میں قدم رکھنے ہی ماحول کی آلودگی کا ایک پھینٹا اس پر بھی پڑا۔

سارہ اور شیرس کھانے والے کمرے سے غائب تھیں۔ بے بے ایک کونے میں جیسے ایک مسلسل انتظار کی سی کیفیت میں تھیں۔ اس نے غائب شدہ لوگوں کے بارے میں استفسار نامناسب سمجھ کر اپنا سلاکس اٹھالیا۔

”خبردار۔ ابھی ناشتا شروع نہ کرنا۔“ خان گل نے حسب عادت چھری لہرا کر اسے ڈرا دیا۔
”ابھی سب لوگوں کو ناشتے پر آئے۔ وہ نہ بے بے بددعا میں دے دے کہ یہ خراب کرا دیں گی۔“
”کچھ تو خراخراؤنی کر خان گل۔“

”ایک کھٹے سے تو من رہا ہوں۔ میری شیرس کو آئے۔ وہ میری سارہ کو آئے۔ وہ اور وہ ہیں کہ سو سو کر گزریں گے مرنے لوٹ رہی ہیں اور وہ لانا دانیال خان۔ کوئی پوچھے وہ کیوں نہیں آئے کہ جتنی شیر جنگل کا بادشاہ ہے اس کی مرضی ماننے سے دے دے۔“

یہ کتنی عجیب سی چارواری ہے۔
جو اس کے اپنے کمرے کے مقابلے میں ہزار گنا وسیع اور بڑی ہونے کے باوجود محض تھپ تھپ اور تنک تنک تھی۔ اس نے ایک دایا سا نرس آڑا دیا۔ فضا میں ہر وقت نہ معلوم سا خوب چھلپا رہتا ہے۔ لوگ لوگوں سے تعجب رکھتے ہیں۔ محبت کے فطری مظاہروں کو ترسایہ گھر اسے اپنے کمرے کے مقابلے میں بڑا کم لگتا۔ بڑا حقیر سا لگتا۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا اس میز پر بیٹھ کر جہاں وہ ایک دو مرنے کے ساتھ خوش گاہوں میں مشغول ہیں وہ ایسے قالینوں سے گزر کر آئے ہیں جہاں ان ہی میں سے ایک کا مو قطرہ قطرہ پٹکا ہوا ہے وہی لمبو جو ان کی اپنی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ لیکن سونے والے بھی اور جاگنے والے بھی اس کمرے گزرنے والی قیامت سے کہتے خبر نہیں۔

بے بے ناشتے سے منٹ کر سارہ اور شیرس سے منٹے چلی گئیں۔
خان گل بڑے قریب سے اپنے ناشتے سے کھیل رہے تھے۔ بھی چھری اٹھا لیتے، کبھی کاتھا، نہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔

وہ بھی کبھی خاموشی سے پیالی کے کندھے سے کھینچتی رہی۔
”خان گل۔ میں نے سنا ہے پٹھان لوگوں کے مست دشمن ہوتے ہیں۔“
وہ توں میں کاتھا کھپو مار کر گیا۔

”دشمن تو کسی بھی ذی ہوش کے ہو سکتے ہیں۔ جس طرح دوست ہو سکتے ہیں۔“
”تم لوگوں کے کون زیادہ ہیں؟“
”دشمن بے شمار ہیں۔ اور دوست بے شمار۔ دشمن بنانا ہماری روایت ہے اور دوستی بھانا ہماری شان۔“

”جو دشمن ہیں وہ کیوں ہیں؟ جو دوست ہیں وہ؟“
”دشمنی تو معمولی بات پر شروع ہوتی ہے اور بڑی پر بھی ختم نہیں ہوتی۔ مثلاً۔“ چلانوئوں اور انوئوں کے باغات میں نکڑی چرائے۔ ساتھ کے شہر سے لڑی اٹھانے پر۔“
”آپ لوگ یہ کلام بھی کرتے ہیں؟“ اس نے گھر کا۔

آٹو کی ٹانگہ بیڈوں کے پس منظر میں بھاگتے شیشوں سے ٹیک لگائے سارہ اور شیریں کسی الجھن میں مبتلا تھیں۔
 بے بے کی تھکی تھکی افسردہ نگاہ بھی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔
 "خاموشی سے قہقہے کی ٹرائی کے پاس۔ چنے پالے میں قہقہہ اندھیلنے لگی۔
 "رات ایک افسردہ سا واقعہ ہوا تھا۔ تمہیں بتا چلا؟"
 "دھک سے رہ گئی۔ چور بنی، اسے آخر کار راز کا بھرم بھی رکھنا تھا۔ اس نے تھکی ہوئی دھک لگا دیں
 اسے سچ کر لیں۔
 "میں دانیال خان کا ذکر کر رہی ہوں" بے نے دھکے لیے میں اپنی بات جاری رکھی۔
 "وہ تاجر رو میں پھسل گئے اور ان کے شدید جوش آگئے۔"
 "وہ؟" آٹو پر سے دیلی ہار کی رسی سانس "آٹو" سے ہار گئی۔
 "اور انہوں نے رات میں کسی کو جگانا مناسب سمجھا۔ خودی الٹی سیدھی پٹی کر لی۔"
 شیریں جھپٹ کر ٹرائی کے پاس آئی۔
 "حالانکہ وہ ڈپٹری کے ڈاکٹر کو بتا سکتے تھے یہ تو اس کا فرض تھا۔ وہ اسی بات کی توجہ دیتا ہے۔ لیکن
 میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دانیال خان پر تکلف اپنے کندھوں پر اٹھا کر کیوں خوش رہتے ہیں۔"
 اس کا ہونچا ہوا تھا۔ اور انھیں انھوں کو روکنے کی مسلسل کوشش کی چٹکی کھا رہی تھیں۔
 پالے لہجہ بھر کے لیے اسے دیکھا۔
 کتنے خوش نصیب تھے یہ آٹو جن کی حرمت کا احساس دونوں طرف ایک ہی پتہ تھا۔ وہ بھی
 جوان کو بہانے سے باز رکھنے کے جتن کر رہا تھا۔ وہ بھی جوان کو ہٹا کر سوا نہیں کر رہی تھی۔
 "یہ لالا کی عادت ہے شیریں۔ اور تمہیں بتا بھی ہے۔" سارہ رب نواز نے شیریں کو شیریں کے
 کندھے کو پتہ چلا۔ شیریں ہل سی گئی۔ یہ سلی اس کی عزیز ترین دوست نے دی تھی اور دوستوں کی ہی ہر
 بات پر آؤں کو یقین آتی جاتا ہے۔
 کتنی دیر پہلے اپنے اچھا خیال سنہری چائے کی بھاپ پر مرکوز کیا۔ وہ اس محفل میں پڑنا بھی نہیں چاہ رہی
 تھی۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی بے سارہنگی سے اس کے منہ سے پھسل گیا۔
 "کیا وہ اب بھی کسی ڈاکٹر کو دیکھنے پر تیار نہیں؟"
 "دشمن کیسے تیار نہیں۔" شیریں نے پہلی دفعہ ہلاکی آگے دلوں میں دیکھ کر جواب دیا۔
 "خان گل کو بھیجا ہے ہم نے سیدو شریف وہاں سے سرجن ٹار کو فون کر کے وہ پلا گیا۔"
 وہ پہلی دفعہ اس سے یوں براہ راست مخاطب ہوئی تھی حالانکہ وہ اپنے اور اس کے درمیان کے تفاوت
 کو کبھی نہیں بھولتی تھی۔ لیکن یہ شاید غم تھا جس نے ان دونوں کو ایک مشترکہ پیٹ فارم پر لا کر لایا
 تھا۔ حالانکہ اس پیٹ فارم پر کسی کو بھی اشتراک ناقابل پروا امت ممل ہے۔
 بے نے شیریں کو پانڈو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔
 "حوصلہ جان۔ ہمت۔" انہوں نے سرفرازوں کے گولوں کو پیٹتے ہوئے کہا۔
 "ہمیں شیریں کو حوصلہ ہوا یا نہیں یقین پلا سکتے ہو گئی تھی۔ اگر سرجن ٹار آ رہے ہیں تو بہت سے

بھٹکے ہوئے کام راہ پر آجائیں گے۔ باوجود سرجن ٹار کے مصروفی رعب کے "اگر دانیال خان کسی کے
 رعب تلے آجائے تھے تو وہ سرجن ٹار تھے۔
 "تم ان کے کمرے میں کیوں نہیں جلی جاتیں شیریں۔" سارہ نے دھکے لیے میں نصیحت کی۔ "تم وہاں
 جا کر کمپریشن ہو گئی۔"
 "میں نے پوچھا تھا قیامت خان سے۔ وہ سوسے ہیں ابھی۔"
 پلا چلی رہ گئی۔ وہ اس کمرے کے دستوروں سے پکے ہی ٹالیاں رہی تھی۔ اس کلف اور تصنع کی زندگی
 سے کمزور رہتے بہتر تو ہم درمیانے طبقے کے لوگ ہیں۔ کوئی ہمارے ہاں غلطی سے بیمار پڑ کر تو دھک لگائے
 تیار دار اول تو اس کی چار پائی کا پتہ نہیں چھوڑتے اور کیس چھوڑ دیتی ہیں تو دروازے سے بھاگ
 بھاگ کر باہر رہتا نہیں ہوتا۔
 چائیں۔ لوگوں اور لوگوں کی سوچوں میں اتنا فرق کیوں ہو تا ہے۔ پھر بھی وہ ایک آسان کے پیچے رہتے
 ہیں۔ اور خوش رہتے ہیں۔
 اس کے پاس ان لوگوں کو کہنے ان کو قتل دینے کے لیے الفاظ تھے اور نہ ہی ان میں کوئی معنی۔
 کمرے میں ٹیکسیر کی چپ تھی۔ اور اپنے اپنے میں اٹھ اہل خانہ۔ چائے کے خاتمے پر اس کو ضرور
 اپنے کام پر لگ لیتا چاہیے۔ اس نے خلوص نیت سے اپنے آپ کو مشورہ دیا۔ پتا نہیں کہ وہ خود کو مجرم
 سمجھ کر آٹو میں جانا جاتی تھی۔ کوئی اس کو دیکھ نہ لے۔ کیس اس سے باز رہے نہ کر لی جائے۔
 لیکن اس کے بھانجے کے ارادے اور جو رہے رہ گئے۔ پری وردانہ کھول کر قیامت خان کے حوالے سے
 سارہ دانیال خان کا پتہ لاتی تھی۔
 "پلائی ملی کو سارا رنے کسی کام سے بلوایا ہے۔"
 تو ڈیو کے لیے پیسے کتنے سب کو اپنی لیٹ میں لے لیا۔ اس نے ٹینک کر بے کی طرف
 دیکھا۔ پتا نہیں اس سلسلے میں ان کا کیا حکم تھا۔ بے کے احکامات سے پہلے شیریں کی جھلانی ہی آواز
 اس کے کان میں پڑی۔
 "بے اس وقت ان کو کتنا چاہیے کام۔"
 "جان۔" بے نے اپنی مخصوص پرسکون سی آواز نکالی۔
 "یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ کتنے تیار ہیں۔ اور پتا بھی سمجھ رہا ہے ان کو کسی لیے چوڑے کلم میں نہیں
 الجھائے گی۔ جاؤ بیلا۔ اور ہاں ان سے یہ بھی پوچھ لینا کہ ہم لوگ ان سے ملے آسکتے ہیں؟"
 "اچھی بات ہے۔" اس نے ٹھنڈے سے ٹھیکے میں کہا۔
 پری اس کے ساتھ اخلاقاً چند قدم چل کر اجازت لے کر مر گئی۔ لیکن وہ ان کے رہائشی کمروں کے
 پاس خود سے ابھتی اور سبھی یہ مسئلہ حل کرنے سے بالکل غائب رہی تھی کہ انہوں نے اسے آخر کس کام
 کے لیے بلایا ہے۔ اب وہ نرم اور خون کا ٹھیل پھر سے نہیں کھیل سکتی۔ اب ان کو سرجن ٹار کو اعتماد میں
 لینا ہی ہو گا۔ ان دونوں وکیش بک کے سلسلے میں بھی مصروف تھے۔ وکیش بک کا کام اچھا دینے والا اور
 تھکا دینے والا تھا۔ وکیش بک کے جتن رہی تھی۔ اور انہوں نے بھی کچھ کم تکلیف نہیں کائی تھی۔ لیکن
 وہ دیکھ رہی تھی کام کے سلسلے میں یہ شخص ذرا سی رعایت دینے کا قائل نہ تھا۔ وکیش بک اور متعلقہ

کانڈرات ان کی آفس کی الماریوں میں رکھے رہتے تھے۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتی، ٹائلیں اٹھا کر ان کے دروازے کے پاس آکر روک جاتی۔

یہ دروازہ جس دن سے اس پر کھلا تھا ایک قیامت بنی رہا۔ وہ مصیبت اور خوف کی ایک طویل رات کاٹ کر پھر سے کام کاج کے لیے تازہ دم ہو گئے تھے لیکن وہ تازہ دم نہیں تھے۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ لیکن ہر کیف انہوں نے اسے بلایا تو تھا۔ اس نے مذہبہ گھمایا۔ دروازہ لاکھ نہیں تھا۔ شاید رات کے بعد اس کو کوئی لاک کر بھی نہیں سکتا تھا۔ بے آوازی چر خرابت کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی اور دھک سے رگ گئی۔

بیک کبل کنڈھوں تک تانے، وہ آنکھیں بند کر کے برسوں کے پیار لگ رہے تھے۔ وہ جاندار گھیر لینے والی ذہن آنکھیں پکوں کے پیچھے ہر جذبے سے خالی اور بند تھیں۔ ہلکی ملا چہرہ رسول کا ہمارا اور تھا تھا تھا تھا کوئی بھی شخص لئے بھر نہیں بھلا کر سکتا تھا کہ یہ شخص غسل خانے میں نہیں پھلکا۔ وہ بے دریغ بنے والا خون ان کے چہرے سے اس کے انٹری پین کی ساری کمانیاں ستا رہا تھا۔

وہ دم بخود کھڑی اس گھڑی میں بھی پرسکون انداز میں آنکھیں بند کیے دانیال خان کو دیکھتی رہی۔ وہ کبھی نروس ہونا یا گھبراہٹ نہیں جانتے۔ وہ ہر کام کر لیتے ہیں۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا۔“ ان کی آواز میں ملکی سی ثقاہت تھی۔ وہ لمحہ بھر کو چونک سی گئی۔ کیا وہ دنیائی خویوں کے باعث بند آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں۔

ان کے بستر کے نزدیک ہی آرام دہ میٹھی پڑی تھی۔ جس پر کچھ دیر پہلے ضرورت خان بیٹھا تھا۔ کیونکہ وہی اسے برآمدے میں بیچ و تاب کھاتا بیڑا تاملاتھا۔ اس نے سبکی تھیں لی اور کانڈرات اور فائل کالینڈر کو پیش رکھ کر وہ ان کے آرام میں غل ہوئے بغیر بیٹھ گئی۔ ایسے وقت میں ان کی خیریت دربارت کرنا بالکل رسوا تھا۔ حال تو ان کی بند بگلوں سے ظاہر تھا۔ جو انہوں نے بے ساختگی میں کھول دی تھیں۔

وہ ایک ملک ان کی طرف دیکھتی، کتنی دیر تک ان کے بارے میں سوچتی کھیاں سمجھا رہی تھی۔ اچانک جیسے پکڑے جانے کے تصور سے وہ گھبرا گئی۔ اس نے بوکھلا کر کمرے میں چاروں طرف نگاہیں گھمایا۔ کسی وقت انسان کتنا شرمندہ ہوتا ہے اور اس شرمندگی سے فرار کے لیے کوئی دلیل کوئی بہانہ موجود نہیں تھا وہ کچھ دیر ایک ملک اس کے چہرے سے کچھ بڑھنے کی کوشش کرنے رہے۔ کچھ اٹھ کر نے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن شاید وہ کسی آخری نتیجے پر پہنچ نہیں سکے۔ وہ پھر سے بیٹھیں اور بے چینی کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ وہ گھبراہٹ ہوئی تھی اور شاید اسی لیے پلکیں جھپک جھپک کر۔ ان کی زخمی سی بے تابی کو گزر کر نے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے ایک لمبا اور گرا سا سانس لیا۔

”تمہیں نے تمہیں تھکا ڈالا۔ ہیں نا؟“

”نہیں۔“

”جھوٹ نہیں بولو۔“ انہوں نے پست سی آواز میں کہا۔

”تم نے ایک عجیب رات گزار دی ہے بیٹا۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں ایسی مصیبتوں سے دو چار نہیں

ہوتیں۔“

”میں نے اس سے بھی زیادہ مصیبت کی راتیں کاٹی ہیں۔ سب کچھ کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس کی آواز میں اتنی نرمی اور اتنا ٹھہراؤ تھا جیسے اس نے اپنی زندگی کے کسی معمولی پہلو کا معمولی سا ذکر کیا ہو۔ جس کو وہ چند اہمیت نہ دیتی ہو۔

”ذرا اصل مصیبت کے بعد ہی راحت کا احساس ہوتا ہے۔ گویا اپنی کماوت ہے۔ اور ہاں لوگ اس سلسلے میں کیا رائے زنی کر رہے ہیں۔“ انہوں نے بات کو بدسلوکی سے پلایا تھا۔ وہ سمجھ بھی نہیں پاتا ہے تھے کہ اس سنجیدہ اور دلکھی کو سننے والے موضوع سے کیونکر نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

”ہمارا خیال ہے۔ کیونکہ آپ نے کسی کو بلایا نہیں۔“

”میں نے بلایا تو تھا۔“ انہوں نے بے ساختگی میں کہا۔ ان کی آنکھیں نیچے پکے کی شرارت سے چمکنے لگیں۔

”ایک ایسے شخص کو جس پر میں مکمل بھروسہ کر سکتا تھا۔ جس پر مجھے اعتماد تھا۔ اور جس کی میٹائی میں مجھے شفا مل سکتی تھی۔ تم نے انہیں بلایا نہیں۔“

”ان کا مطلب تھا کسی اکڑ۔“ وہ اچانک کرچ رہ گئی۔

”اگر کسی ہاتھوں میں اتنا آرام کہاں۔ تم نے مجھے کوئی ٹیکو لا نرود (مسکن دوا) دیئے تھے؟“

”وہیں کیسے دے سکتی تھی۔ میرے پاس تو۔“ وہ اچانک چپ ہو گئی۔ دانیال خان اس وقت سنجیدہ نہیں تھے وہ مذاق کر رہے تھے۔ اور خود کلامی۔

”تمہارے ہاتھوں میں سیٹھی ہے بیٹا۔ تم سب گورم بیٹوں کو چھوڑ دو تو وہ اچھے ہو جائیں گے۔“

(یہ آپ کے اجتماعی فقرے ہیں دانیال خان جن کی مستحق میں نہیں۔ میں نے کتنے لوگوں کو اپنے سامنے پکڑتے دیکھا ہے۔)

”یہ تم بھی جانتی ہو بیٹا اور میں بھی۔ کہ میں نے ٹھیک آدھی پر اعتبار کیا تھا۔ دیکھو، کبھی بھولے سے بھی اس واقعے کا ذکر کسی کے سامنے نہ کرنا۔“ وہ سامنے خلا میں گھورتے جیسے اس دردناک واقعے سے گزرنے لگے۔

”تمہیں معلوم ہے بیٹا وہ کون تھا؟“

”معلوم نہیں۔ کون تھا وہ؟“

”وہ میرا بھائی تھا کوئی۔ سو یہ بھی اچھا رہا کہ گولی اس کو نہیں لگی۔ اگر میں بچ جاتا اور وہ زخمی ہو جاتا تو قیامت آجاتی۔ بیٹا۔ پتا نہیں کیوں بیٹا۔ یہ بندوقیں یہ ہتھیار ہمارے زیور ہیں۔ جو اسلحہ حکومت نے آنکھوں سے دیکھا نہیں ہوتا۔ وہ ہم ہاتھوں سے استعمال کر چکے ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے انہیں چھوٹے ہوئے خوف آتا ہے۔ میں پتا نہیں کیوں شرماتا ہوں۔ شاید خان گل اور قیمت خان ٹھیک سوچتے ہیں کہ میں بزدل ہی ہوں۔ یا شاید۔“ انہوں نے بہت دور دیکھا۔ بہت دیر سوچا۔ ”میں بزدل ہی ہوں۔“ انہوں نے حتیٰ فصل بڑے فخر سے کہا تھا اور بے ہجج کی مرتبہ دہرایا۔

”میں بزدل ہوں۔ میں بہت بزدل ہوں۔“

پھر جیسے اچانک ہوش میں آکر انہوں نے آواز تار مل کر لی۔

"لیکن آپ بہادر ہیں یہ طے ہے۔"
 "ہاں۔ لیکن بیٹے میں نے آپ کا بدلہ لینے چاہوں۔"
 ایک بے ساختہ سا قہقہہ دانیال خان کے حلق سے پھلا۔ ان کے چہرے پر چھائی گہری رنجیدگی پر لمحہ بھر کے لیے خوشگوار کی چھپا لگ گئی۔
 "تم میں زندگی ہے۔ تم زندگی سے بھرپور ہو خالا نکہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ اور شاید تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ کوئی لمحہ ہوتا ہے جب کسی شخص کے سامنے انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔ شاید وہ شخص میں نہیں۔ یا وہ لمحہ یہ نہیں۔"
 ہنسی سے ادا کیے گئے الفاظ کا اثر دانیال خان نے اس کے چہرے پر رکھنا چاہا۔ لیکن اتفاق سے اسی وقت اس کی گود میں رکھی فائلوں میں سے ایک کانڈ سرک کر نیچے گرا۔ جسے اٹھانے کو وہ بے ساختگی میں جھک گئی۔ گرنے پر دانیال خان نے اس کو جھکے دیکھا۔ وہ سیر محسوس ہوئی تو اس کا چہرہ جھکے سے ہنسنے لگا تھا۔ لیکن شاید وہ ہر کیفیت کو آتی تھی۔ نہ نہ شکاری کے دعوے عموماً "یوے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ایک لمحے کے لیے یہ کانڈ نہ گرنا تو شاید۔ شاید وہ زمانہ شکاری کی بدولت ہی کسی بات کا کوئی مطلب نکال لیتے۔
 "منویہا۔" انہوں نے آنکھیں بند کر لیں جیسے زخم کے کسی حصے میں کوئی ٹیس سی اچھی تھی۔ "اگر یہ ساری دنیا مل کر ایک طرف ہو جائے۔ وہ مجھ سے نفرت کرے۔ مجھے ہر تھو تھو کرے۔ تو تم کیا کرو گی بیٹا؟"
 وہ خاموشی سے ان کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ یہ سوال ایسی افراتفری میں کرنے والا نہیں تھا۔ نہ اس کا کوئی جواب اس کے پاس تھا۔
 "تو تم ہی ان کے ساتھ مل جاؤ گی؟" کسی ایسے شخص کی طرف سے یہ سوال جس پر جان پھلاور کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں ہو۔ عجیب سا تھا۔
 "خوب سوچ مجھ کو اب دینا۔ مجھے کوئی ہلدی نہیں ہے۔"
 "میں کسی سے نفرت نہیں کر سکتی۔"
 "میں کسی کی نہیں۔ اپنی بات کر رہا ہوں۔"
 "تپ سے نفرت کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں بنتی۔"
 دانیال خان کے چہرے پر ہلکی سی بے بسی کے سامنے لڑے تھے۔ پھر وہ بے ساختہ ہنس دے۔
 "یہ بالکل بھلا لالچ ایک جواب ہے۔ اگر آپ سے براہ راست پوچھنے کے بجائے تصور میں پوچھا ہوتا تو یہی شاید مجھے بھی جواب موصول ہوتا۔ کیوں بھی مجھ سے نفرت کرنے کی وجہ کیوں نہیں بنتی؟ اس لیے کہ آپ میرے علاقے میں ملازمت کرتی ہیں۔ آپ کے عجیب و غریب نظریات سے "کسی بات سے کوئی اجیر نہیں۔"
 "شاید اس لیے بھی۔"
 "کبھی۔؟"
 "آپ کو اس وقت زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہیے۔"
 "کیا پھر کسی وقت مجھے یہ باتیں کرنی چاہیں؟"
 وہ آنگ گئی۔ بعض اوقات انسان پوکی اپنی جھٹکی ہوئی ہچکچاہٹ پھیل جاتا ہے۔

"چھوڑو کرو۔ پھر کسی وقت تم مجھ سے ضرور باتیں کرو گی۔"
 "جھٹ۔" اس نے بی بی سی آواز میں کہا۔
 "جی بے کسی سے اچھا۔" نہیں وعدہ کرو، کمبوش وعدہ کرتی ہوں۔ کوئی وعدہ کرتی ہوں۔"
 "میں طوطا نہیں ہوں۔ اور اب وہ بے لے وغیرہ کا بیخنام ہے۔ وہ آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔" وہ خاموشی سے تکیوں کا سہارا لے کر نیمہ راز سے ہو کر بیٹھ گئے۔
 "اوکے۔" دانیال اس کو۔ میں بھی ان لوگوں سے ملنا چاہتا تھا۔ اور ہاں پلیز یہ فائلیں وغیرہ آپ واپس رکھ دیں۔ مجھے کچھ دن کام نہیں کرنا۔"
 اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ سردار دانیال خان کے اس مزاج کی تو وہ عادی ہو گئی تھی لیکن اس نے مزاج نے تو اس کے اوسان خطا کرنے سے تھے۔ وہ بے ساختہ ہنسی خوشی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 دانیال خان اچانک یہ مزار سے ہو گئے تھے جیسے خطاب کی گفتگو سے اکتا کر وہ اس کو کمرے سے دھکیل دینا چاہتے ہوئے۔ یہ جڑے سرداروں والی تلون مزاجی ان کی کلاس کا تقاضا تھی۔ کبھی زہم کبھی گرم۔
 "اور ہاں پلیز۔ آپ کو ایک رحمت اور وہی تھی۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ذرا ان لوگوں کو یہاں بھیج دیں۔"
 "اوکے سر۔" (ہاں اب ٹھیک ہے)
 اس نے اپنے پیچھے روانہ نہ کیا اور دو شیڈوں کے ایک دوسرے جہاں میں پہنچ گئی۔ سارے رب نواز وقت گزارنے کے لیے ایک بوسیدہ سے ہارمونیم کے سروں سے کھیل رہی تھی۔ وہ ابھرے جانے کی ایک ہسیانہ سی آواز کے بعد کالے سفید سروں سے آواز بلند ہوئی۔
 "واہ وا۔ جگ جگ۔ جگ جگ۔"
 اس کے پاس کہن سالہ پیلے اور اراق والی ایک گائڈ بھی تھی جس میں اپنے وقت کے مشہور گانوں کے سرورج تھے۔ وہ ان کی رکھ کر دیر تک کانٹھوں میں سر جھکا کر تو سر ہل رہا ہوتا تھا۔ "جلا۔ جلا۔ دی۔ دی۔ جلا۔"
 اس نے بیٹا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر سہل کو بخش کر اس کی اندر کو کچھ سکون پہنچایا۔
 "ہاں سناؤ۔ سناؤ۔"
 "وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔" وہ ہنسی گئی۔ وہ مالک مختار تو نہیں تھی لیکن پیغام ایسے لائی جیسے وہ اس کی اجازت کے بغیر کمرے میں قدم رکھنے کے مجاز نہ ہوں۔
 شہر میں سوالات کیے بغیر ایک چپ میں باہر تھی۔ بے اپنے گفتگوں پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے انھیں تو اس کو شرمندگی سی ہوئی۔ واقعی بغض اوقات بے تاب کی اچھی نہیں ہوتی۔ خاص طور پر بوزھوں کے لیے۔ اس نے پار سے بے کاناؤ کچلا اور ان کو سہارا دے کر باہر لے جانے لگی۔
 "وہ اچھے ہو گئے ہوں گے۔ میں تالے بے۔" بھی تو انہوں نے نہیں بلایا ہے۔"
 "ہاں۔" بے وقت سے شکر اویں۔
 وہ خاموشی سے حوائی اور برصاے کو ایک سرحد پر اکٹھے ساتھ روانہ ہوتے دیکھ کر قہقہے کا سانس لے رہی تھی کہ سارے رب نواز نے اس کو بلا دے۔
 "تم یہاں کیا کرو گی آگلی۔ چلو تمہارے ساتھ چلو۔"

کبھی کبھی اس بڑی کی ہے۔ تکلفی انسان کو ابھین میں مبتلا کر دیتی۔ بلاشبہ اس لئے وہ اپنائیت کے اس اظہار پر خوش نہیں ہو سکتی تھی۔

"میرا خیال ہے میں کوئی کام نہ کر سکے۔"

"کام کام اور اس کام ہاں کر لیتا۔ ہیں یہ۔ پہلا لانے تمہیں کام میں لکھا رکھا ہے۔ لالہ بے نہیں ہیں۔ بلا صرف ان کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔"

وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ سارہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

"اب دیکھو، لکھا ہے انہوں نے تمہیں تھا کر لالہ اب انہوں نے کچھ تمہیں کہا ضرور ہے۔ اور یقین کرو جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ ان کا مطلب ہی نہیں ہوگا۔"

وہ جی پی ہوئی۔ کبھی کبھی انسان مصلحتوں کی پوچھو روں میں بھی کچھ بے کام سے قلعہ تعمیر کرتا ہے۔ وہ سمجھ رہی تھی اسے ان محفل اور قلعوں سے پناہ ملتی ہے۔ یہ راستے اس کی منزل کو کھوٹا کرتے ہیں لیکن پھر یا پھر سے ایک شخص اگر اس میں دراڑیں ڈالتا ہے۔ اس کے بازو کے ساتھ کھینچی مشینیں انداز میں کھینچتی جاتی ہیں۔ اور اگر مار دے لالہ اسے اس عجیب و غریب رویے کی اتنی عجیب و غریب توجہ پیش نہ کی ہوگی۔

وہ چونکی تو وہ غیر محسوس انداز میں اس کے ساتھ چلتی چوروں کے اس غار تک آگئی تھی جس کے دروازے کا اسم اسے بھول گیا تھا۔ بے نے نہ سنا۔

دانیال خان دو تکیوں کے سہارے آہستہ سے اوپر کوہے جسے ان ہی کے منظر تھے۔

اور کچھ سے بھی پہلے بیلانے اس شخص کا چہرہ دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا۔ یہ کئی اور ہی شخص تھا۔

شیر سے سانس لیتی میں کسے بڑھی۔

ان کی طویل فراخ دلانہ مسکراہٹ قطعی نظر انداز کیے وہ جھلملاتی آنکھوں سے ان کے اوپر جھک گئی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟ آپ ٹھیک ہیں؟" آپ۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" انہوں نے اس کے ہر مرتبہ بے تلی میں کچھ فقرے کو دہرا دہرا کر اس کا اطمینان کرنا چاہا لیکن وہ بے چین سی رہی۔

"آپ کیسے سب کر گئے تھے؟ آپ کا ٹائٹل تو بالکل ٹھیک ہو آہ۔"

"جی کو، ہم ایکسپڈنٹ کہتے ہیں۔" انہوں نے مسکراتی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "ہو اچانک ہو جاتا ہے بغیر کسی وجہ کے۔"

"اور آپ کو تو بخار بھی ہے۔" اس نے ان کے ساتھ بے تکلفی سے اپنے منہ پر ہاتھ جما دیے۔

"آپ بے شک بر لا میں۔ لیکن ہم نے خان گل کو بھیج کر سرجن بنا کر لیا ہے۔ آپ سے پوچھتے ہیں۔"

"تھا تو یہ بات ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ "تو آپ نے سرجن بنا کر لیا ہے۔ یہ اچھا کیا۔" وہ ان کی نظروں کی عجیب سی معنی خیزی سمجھنے سے قطعی قاصر کوئے میں سمجھی میز کے پاس ایک کرسی، سنبھال کر بیٹھ رہی۔

"کیا بات ہے لالہ۔ آج کل بہت لڑکھارے ہو؟" سارہ زہرہ دلی سے مسکراتی۔

"ایک تو مجھے تم لوگوں کی باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔" بے نے آگاہی سے کہا۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے بے۔"

"نی الحال کام کا بڑا کچھوڑا۔ تھوڑا سا آرام کرو۔" بے کی نگاہیں بیلانے کی طرف اٹھیں۔ لیکن راستے ہی میں رک کر مڑ گئیں۔

"جیسا حکم ہے بے۔ ویسے کام کے بغیر خود کو باقاعدہ بیمار محسوس کرنے لگوں گا۔ اور آپ وہاں کیوں بیٹھ کر نہیں ہنساتے آئیں۔"

بیلانے پناہ زور سے "معمل کی طرح اس کرسی سے اٹھ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھی۔

"میرا خیال ہے اس خوشی میں ایک فنکشن ہو جائے۔ بہت اچھی چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔ پیک لیزر آپ میں سے اچھی چائے کون بنا سکتا ہے؟"

"سب سے اچھی چائے میں بنا سکتی ہوں۔" سارہ نے خوش دلی سے کہا۔

"لیکن انہوں نے بھی بتائی نہیں۔" شیر سے نے لقمہ دیا۔

"میں مہم کو آواز دیتی ہوں۔ میں بہت کچھ کھاؤں گی بھی۔ صبح سے آپ کے ایکسپڈنٹ کی خبر نہ مجھ کو دلا رہا تھا۔"

"نہ کھانا ہے بے۔ یہ کتنی تالاق لڑکیاں ہیں۔" ان کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی۔

"بے کی بات نہ کر لالہ۔" سارہ ہنسی پٹی کی۔

"بے کو سوال بیلانے کے کسی کہتا ہے کچھ پیند نہیں۔"

"تو کیوں نہ ہم بھی آندہ بیلانے سے درخواست کریں۔"

بیلانے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ شدید سنجیدگی نے ان کی آنکھوں کی شوخی کو بالکل سامانہ کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ لیکن بالکل بھلایا نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رے اتنے جتن کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف پری کو اطلاع دے دینا۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" سارہ نے جلد بازی میں اسے کی کوشش کی۔

بیلانے کا منہ دہرا دہرا رہا۔

"آپ بیٹھیں سارہ۔ گپ لگائیں۔ یہ ایسا مشکل کام نہیں ہے کہ اس میں کسی کمپنی کی ضرورت پڑے۔"

اور جب پری لوازمات کے ساتھ بے لگا کر پہنچی تو سارہ کی توقعات کے عین مطابق بیلانے کے ساتھ نہیں تھی۔ البتہ معذرت کے دو تین فقرے تھے جو پری کی زبان سے اس نے کھلوا کر اپنے کانڈھوں سے سارا بوجھ اتار دیا تھا۔ اس کو ڈیکٹریشن کے سلسلے میں کچھ کام تھا۔ ایکٹریشن آگیا تھا۔ اور اسپاٹ لائٹس لگوانے کا مشکل کام ہنوز باقی تھا۔ اور نہ معمولی سی غفلت سے مجسموں کی ساری خوبصورتی جاتا ہوا جاتے گی۔

غالباً وہاں موجود کسی شخص سے چچا نہیں رہا کہ بیلانے اس خوبصورتی سے ہمانہ بنا کر محفل سے فرار ہو چکی تھی اور اس کے فرار کی وجہ بھی کسی سے چھپی نہیں تھی۔ دانیال خان کئی عرصہ طبیعت کے آرمی ہیں۔ اور بھی کبھی تو وہ بدلتی کی حد گزار دیتے ہیں۔ بے نے کروٹیا کی بنائی ہر ہاتھ پھیر کر اپنی تسلی

اس کا رنگ لکاسا سرخ ہو گیا۔ یہ بے باک بھی عجیب بد خواہش ہیں نہ ابھی ہڑالی پہنچا تھی نہ لوگ اور اس کو حکیل دھکیل کر خواجہ احمد وہ سرخون ٹار کی پیش کی، ہوشی کر رہی کے ایک کونے میں دھنس گئی۔ اپنے حیلہ آنے کی کوئی مقفل یا مقفل وجہ ملنے کی بات سوچتی وہ کبھی سرخون ٹار کو کہہ تن متوجہ دینے رہی تھی۔ اور کبھی انیال خان کو۔ جو سرخون ٹار کے ساتھ آیا اخبار اپنے سامنے پھینکا کر لیتے تھے۔ ”آپ کی کتابیں مجھے ملی نہیں۔ آپ کا بہت شکر ہے۔“

اس ذکر سے غالباً وہ انجان تھے۔ رفعتاً؟ خاریٹ کر انہوں نے گفتگو سننے کی کوشش کی۔

”آپ نے پڑھ لیں۔ واقعی؟ ایسی کتابیں میں اسے بھی دیتا ہوں۔ اس کی ایچری میں اس آہمی کتابیں میری ہیں۔“

چند لے وائیاں خان کی آنکھوں نے سرجن بشار کے اس کلمے جھوٹ کے خلاف احتجاج کیا۔ پھر لنگھو کو لایا۔ ”اے معیار سے مگر ابواسمہ کو بارہ اخبار کھول لیا۔“

”کیوں“ یا ”تکلف ہے؟“ انہوں نے اخبار والے کو کھرکا۔ ”اچھا چلو میں اعلان کرتا ہوں۔ اس کی لائبریری کی ادھی کڑیاں میری نہیں ہیں۔ آپ بیچنا ہی پڑھ لیتی ہیں۔“

”مشکل سے۔ لیکن بیوقوفو الی کتا ہیں بالکل سمجھ میں ہیں آئیں۔ اصل میں مجھے پتہ نہیں آتی۔“

”اور یہاں ابھی تک کسی نے آپ کو سکھایا ہی نہیں۔“ انہوں نے ایک نظر ہلکے ہلکے بٹے اخبار کے پیچھے کھد کیا۔

”پہلے میں سکھانا گا۔ لیکن میری ایک شرط ہوگی۔“

”کہ پہلے آپ مجھے سر جڑی سکھا سکیں گی۔“
 سارے جسم سے خون اٹکھا ہو کر پیلا کے چہرے پر جمع ہو گیا۔ اخبار میں ہلکی سی کپکپاہٹ ہوئی تھی۔
 انیال خان نے سمیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔
 ”بہتر ہو گا اگر تم پہلے یہ پتا کر لو کہ اب تک کتنا اور کتنا نوالے کیوں نہیں آتے۔“
 ”جب وہ پہلے توئی حصول علم میں مصروف ہیں تو زبردستی نوالے جانیں گرا رہے جاتے ہیں۔“
 ”اسی سخت اردو لول کر تم کیا سمجھا سکو گے؟“
 ”سمجھا جاہل سمجھے جاتے ہیں۔ اب تو بی بی بیلا میں حیران ہوں آج کی دنیا میں کوئی اتنی قربانی کرنے والا اتنا
 بہادر نہ ملتا Loving کیا کوئی ہو سکتا ہو گا۔“
 وہ اپنی کرسی پر اسی جگہ جی بٹش کرسی پر۔

”فکاش آپ اپنی جو جیوی جھوڑی منجات اس گھر کے لوگوں میں تقسیم کریں۔ یہ بہت دولت مند ہیں لیکن اندر سے بھی دوست ہیں۔ سبہ جا رہے غریب، مفلس۔ میں سوجھا ہوں اگر ہم دونوں کا محبت بھرا ہاتھ ان لوگوں کے گھر پر نہ ہو تا تو یہ کیسے جی سکتے تھے۔“

وانیال خان نے ایک نظر دی محبت سے اپنے دوست پر ڈالی۔

”اب بچو سکھانے جا رہے تھے۔ جناب۔“

”ہاں سکھاتا ہوں۔ تاسو نہ پڑے۔ یہ لاور انگیں حصولِ علم کی راہ میں رکوٹیں۔“

کہ میں ضرور دانیال کی کسی ملکید تہذیب کے خلاف اس کو تفتی ہوں گی۔ انہوں نے اپنا طینتان کر لیا۔ لیکن جب یہ بے بنے دکھادے تھے، الیکٹریشن آتا ہوا تھا۔ ار وہ اس کے ساتھ کوئوں کوئوں میں مغربی کرتی پھر ہی تھی تو انہوں نے معذرت کا پروگرام فیصل کر دیا۔ اسٹال لائٹ اس محنت کش کے مجھے کو چکاری تھی جو سرے بلند ہاتھ میں کھڑا اٹھائے گا۔ کسی لکڑی کو ٹھنسنے ہی والا تھا۔ اس نے کن انجینوں سے دیکھا۔ کوئی اس سے خفا نہیں تھا۔ غنیمت ہوا کہ کوئی نہیں۔ سارا اس کو دیکھ کر حسبِ حالت خوشدلی سے ہنس دی۔ وہ اس کے ساتھ اس کی شرمندہ بھری چوری میں شہر کرتے ذرا نہیں بچھا رہی تھیں۔

لیکن دفعہ سر کا کھانا کھوڑا سائیت ہو گیا۔
 اول تو اس لیے کہ سر سرجن شارجہ پہنچ گئے تھے اور وہ کب سے وانیال خان کا کمرو بند کر کے مرہم پٹی کے
 انتظامات میں مشغول تھے۔ قیمت خان یا مہر آدھے میں ہاؤس بیٹھا چہرہ ہاتھانہ غصے میں بھرا بیٹھوں میں کچھ کچھ
 بریدہ رہا۔ اس کو قیمت خان سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بلکہ وہ اس کو کھوڑا بہت برا ہی لگتا
 تھا۔ لیکن مالک سے اس کی وفاداری پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ سر سرجن شارجہ نے اس چابکدستی سے
 کمرے کا چابن سنبھالا کہ وہ خیم کی نوعیت کے بارے میں اشارے سے بیٹا کا رہ گیا۔
 خدا خدا کر کے کمرہ کھلا تو سارہ روپ ٹوڑا بیڑا۔ چاروں جگہ جگہ تک کے انہی سروں میں ابھی تک
 غلطی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ بار موشی نے بھولے سے ایک مرتبہ بھی ٹھیک سر نہیں پڑا۔
 لالہ نثار اور لالا وانیال خان کا ایک وقت حکم تھا کہ وہ کھانا ایک ساتھ کھا کر کے لیکن وانیال خان
 فی الحال چلنے پھرنے سے محذور ہیں لہذا ڈالو ان کے کمرے میں کھینچو لی جائے۔

نرالی کے ساتھ ہی آسمان بھلا کی روح کھینچ لی گئی۔
وہ دنیا ال خان کی موجودگی میں مرجن نثار کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگی۔
لیکن اس کے پاس نہ ہمارے نیچے تھے نہ لیت و لعل۔ اور وقت کی تنگی کا رونا رو کر بے نے بھلا کی
جان خشک کر دی تھی۔
”نرالی، کمرے میں چلی جی! اور تم لوگ بیسیں دناتے پھر رہے ہو۔ میں ذرا چار رکعت پڑھ لوں۔ تم
چل کر بیٹھو۔ یہ مہمان تے اتنی بے پروائی؟“
ری۔ ری۔ ری بجا جانا۔ بنگ بنگ بنگ۔

”اچھ جائیریں۔“
 ”علیٰ جاسارہ۔“
 ”وزرا ایک نظر دیکھ لے لو۔“
 وہ خود بھی جانتی تھیں۔ ان سارے احکامات میں سے صرف ایک ہی علم ہا جاسکا تھا۔
 شیریں شرارت میں سارہ کے سرگرم بد کر کے خوش ہو رہی تھی اور سارہ نے قسم کھالی تھی جب تک
 سہل خود کو توبہ نہ کر لے وہ معاف نہیں کرے گی۔
 ”آخا۔ آتے پہلا۔ ابھی آپ ہی کاؤنٹر پر تھیں۔ تشریف لائیے۔“
 آ امر کر رہی تھی جسے سر جوڑ بھرا احساں ”کھڑے بھی ہوئے اور بیٹھ بھی گئے۔“

”میر کی بات ہو گئی ہے۔“
انجی دانت میر اس نے بوسے تیر ارے تھے لیکن ہے۔ ایک انجی میں سر ہلا کر اس کی ساری
حقیقت پرانی جو میر کی رہیں۔ کئی دیر لڑکے دوپٹے سے اکھیں خشک کر تیں اور چٹکیاں ضبط کرتی
دیں۔

[illegible]

کتنی دردناک طرح قباہہ و سرحد گائے اپنے آپ کا بچاؤ کر رہی ہے۔
 ”تمہیں معلوم ہے انارٹل خان غسل خانے میں نہیں پہنچے۔ کسی ڈان پر حملی چلائی ہے۔“
 بہت دیر بعد وہ بچس تو ان کی آواز باری بھاری تھی۔ شدت کریم سے لڑکھائی ہوئی۔
 بیٹا شہسارہ ہو گئی کسی محسوس اور کمرے آئی کے ساتھ جوتھ بھاننا کتنا مشکل کام ہے۔ اس کے کوئلے
 راز رکھنا کوئی بات چھیانا۔ کتنی بڑی روح کے کی بات ہے۔ جبکہ وہ شخص خود آسمان کی طرح شفاف اور
 روشن ہو۔

”میری تو بہت محسن چلا قیمت خان کو خود بھی نہیں معلوم۔ ورنہ وہ ان کی پشتوں کو بھونک کر رکھ دیتا۔ لیکن راجا ایل خان جانتے ہیں۔ پڑھو زبان میں کھولتے۔“

”میں چپ چپ میں رہوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی تم سے پیارانی ہوگی۔ وہ جب تک اس معصومہ کو چاہے۔ لڑکھائیں گا تو چپ نہیں چھوڑے گی۔ سب کے سب جو اگر گویا۔ اگر۔۔۔“

کسی مکتبہ شگونی سے پھر ان کی آواز بندھ گئی۔

بیٹا ابھی نہیں بتلا ہے کی آنکھیں پھر رہی تھیں جتنی دلی

ہمیشہ خطرہ لگتا رہے گا۔
 بے ناک فخر نور سے بھلائی آنکھوں میں دیکھا جیسے وہ اعتبار کے جانے پات کے جانے پر کھٹکتا
 کاغذ کار ہوں۔

”موت پرانی کہانی ہے“ انہوں نے کسی متنی فیصلے پر پہنچ کر انھیں صبر کا اظہار کر دیا۔

تھام دیوں میں بڑھائی سال کا فرق تھا اور ان میں بہت سی بات تھامی ہو سکتی تھی۔

﴿ ۱۹۵ ﴾

”ابھی ہم پہلا سبق ہی پڑھ رہے تھے، وہ اصرار کیا ”اٹھ کھڑے ہوئے۔
 سارے رب نواز کے ہتھے مسکراتے چرے کے پیچھے تیس تیس خان کا واس سا مرغیلا چڑھا۔
 ”خیال رہے انشا اللہ“ وہ کھلکھلا کر کہی۔ ”ان کو چھٹی نہ ملی۔ پہلا سبق ہی اراصل آخری ہوتا
 ہے“ شمر اس کو کج ہنسی میں اٹھ چھوڑ کر انیل خان کے پاس جا بیٹھی وہ دونوں آنکھوں سے کسی
 شخص پر مضمون کو زیر بحث کرانے سے دیر تو گزرتی تھی۔

سجدہ پر صوفیوں کو زینہ شکار اتران کے وار ہوئے۔
 ”میاں الف تمہارا درکار۔“ لالا اشارہ کر کے مزید ارشاد کیا۔
 ”صرف گھانا درکار ہے۔“ انیل خان نے ٹوکیا۔ معلوم نہیں جب انیل خان اپنی توجہ سے کسی کی
 بات سن رہے ہوتے ہیں تو کسی کو اور اور کے تقاضوں کی ہچک ان کے گلن میں پڑتی رہتی۔
 ”میرے پھل آؤ گے۔“ جبار گھٹ دھڑکتا تھا۔

اس لیے کہ بے گناہوں کے لیے عذاب ہے اور گناہوں کے لیے عذاب ہے۔
 اس لیے کہ بے گناہوں کے لیے عذاب ہے اور گناہوں کے لیے عذاب ہے۔
 اس لیے کہ بے گناہوں کے لیے عذاب ہے اور گناہوں کے لیے عذاب ہے۔

معلوم نہیں ہے بے کی نماز اتنی لمبی کیوں ہو گئی کہ ان کو کھانے کی طرف سے معذرت جمہورانی پر دے پھر ان کو جو بھی ہلائے گیا۔ ان کی نمازیں اتنی طویل ملیں کہ وہ مر بھی نہ اٹھا سکیں۔

یہاں سے چلائے خاموشی سے کچن میں ٹرلی چمائی بہت شام ہو گئی تھی بڑے اس طرح تو کبھی نہیں کرتی تھیں۔ وہ ٹرلی لے کر کمرے میں توجہ دینا نہ دیتی۔ وہ جانے نمازی کی ٹیٹی ضرور تھیں لیکن نماز نہیں پڑھ کر بھی نہیں۔

روئے تو ان کی پہلی ہمدی کسی اور دہوں کا تھا۔ ان کی طرف سے سب سے پہلے یہ کہہ دیا کہ
اس نے بڑے کھلم کھلا کر شرابی و دغاؤں کے پاس روکی اور بے گے کے عین سامنے شہنشاہ کی لکڑے کو مار جانے
تھما۔ مری میٹر رہی۔
توجہ اوقات اپنی حیثیت کتنی استقامت کتنی بیکارسی لگتی ہے جب سامنے روئے لو ادا کوئی نہ بھی نہ ہو کہ
میں نے اس کا جواب دیا کہ اگر وہ مار بھائی تو وہ مار بھائی جائے۔ عقیدہ بالوں والے اس چارے کے مرکز کو

اسے ملے لگا کر سوٹ رہے والے اندر در بھانڈی ہاتھوں میں چاکے سے کھانے لگا۔ انہیں چپ بھی کرواتا
ملل کی ملی گئی تو اسے لوہے سے ڈھکا چمکیاں کھارہا تھا۔ وہ ہلایا کہ کتنی بھی۔ انہیں چپ بھی کرواتا
تھکے؟
تھکے ہیں بے ساختہ ہی اس نے رونا ہوئی ہے بے کو گئے لگا لیا۔

کہا ہوا ہے کہ ”ہرگز ناہوا شخص اس لئے تو پیدا ہوا ہے کہ اس کے کندھے سے اقبال کا جیسے کچھ بولے کے قابل ہی نہیں رہیں۔“

”مسی نے یہ کھانا کھا ہے۔“
”خاکن کھانے پر تمہاری کیا ہے؟“

تھا۔ درمیان درمیان سے اس کو بے بے کے ریل سے فخرے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کہیں کہیں کوئی کوئی مانوس آواز کانوں سے ٹکرائی ہے پھر ایک طویل وقفے کے لیے خاموشی سب کو گھل گئی۔ اس کے اوپر جیسے ایک وزنی بوجھ آپڑا تھا۔ جس کی طاقت سے اس کے کندھے آہستہ آہستہ جھکتے چلے گئے۔

”اے“
 انیت کی ایک بھٹی بھٹی سی آواز جیسے ایک مہری سانس کی شعل آہستہ سے نکلی۔
 ”ہاں“

”جانتیں اس نے کس کو پکارا تھا۔ گڑھی کے مالک کو۔ یا اس مالک کو جو ایسے سارے انکول کا مالک ہے بے کسراغ لگانے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ وہ تو شدت سے گریہ میں مشغول تھیں۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔“

یہ نہیں پھٹی نہیں اور آسمان حیرت سے نکلے نکلے نہیں ہوا۔ کید نکلے یہ سب کچھ ہوا نہیں کرتا۔ ظالم ظلم کر کے سکون سے اپنی تعیش چاہوں گی طرف پلٹ جاتا ہے اور بے نام مظلوم کی ذات سے کبھی کسی کو لگا ہی نہیں ہو سکتی۔

”قبا ہے چار تو معصوم ہے، مظلوم ہے، شہنشاہ ہے اس کو کہ اس نے اپنی روایات کی پاسداری کی۔“
 بے ہوش کئے نماز پر قبلہ رو بیٹھے فیصلی اس کے دو چوپڑے کوڑے برسے لگے۔

”لیکن شاید میں بزدل ہوں ہاں میں بزدل ہوں میں بہت بزدل ہوں۔“
اس کے کان سے بالکل نزدیک ایک بھاری سی آواز کی سرگوشی بہت سے طلسم توڑ رہی تھی۔ وہ ایک کمزور سالمہ تھا جس کی گرفت میں آنے سے پہلے اس نے خود کو پایا تھا۔ وہ آواز کے سحر کا شکار ہوئی تھی۔
”نہ ان بڑی آنکھوں کے جادو کی اسیر نہ تھی، لیکن پھر بھی ہوتا نہیں کیوں ایک روانی سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے۔“

مستلوم نہیں وہ کس پر روئی تھی۔

مرنے والے پر یا مارنے والے پر۔

بعض اوقات انسان زمین پر چلتا پھرتا ہوتا ہے۔ اچانک کسی کے دل میں مرجاتا ہے۔ وہ اپنے دل میں بڑی اس مہیت پر آج اتنے آنسو بہانا چاہتی تھی ساری کدورتیں ساری لگندیاں اپنے دکان سے دھو ڈالے۔

اس کا خیال تھا کہ باپ کی موت کے بعد کوئی غم اس کو اس شدت سے کبھی رلا نہیں سکے گا۔
لیکن رونا بڑی عجیب چیز تھی۔ (گو تم بدھ ٹھیک کہتا تھا)

رجحہ چاہا کی کوٹھری سے کوٹھی میں خانہ کے اس محل تک اس نے ذرا قدم پر لوگوں کیواسے وکھوں میں گرفتار دیکھا تھا کہ اس کے اپنے پیٹ کی موت ایک گزرا ہوا مقبول سا واقعہ بن کر رہ گئی تھی۔
دوستے دوستے لہجہ میں اس کا جی چاہا وہ بھی کوٹھری سے کی طرح فیصلہ کرے کہ دنیا و کھوں کا گھر ہے اور دنیا سے بڑا کج حاشیہ۔

تم نے وانیل خان کو دکھا ہے لیکن اس کا پاپ۔ اف خدایا۔ جب وہ غصے سے بلبلاتا تو ساری عروسی کو بچ بچاتی۔ وہ اسی کی طرح حسرت و تاور میں یہ کی طرح بچتا رہتا تھا۔ اس میں اتنا غصہ تھا تھا غصہ تھا کہ کیا تائیں۔ وانیل کو دیکھ کر کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اس شخص کا بچہ ہو گا۔ یہ اس کی خلد ہے اس سے اللہ نرم خور مان۔

”ٹھیک ہے۔ یہ میری محبت میں ہر طرح کے مبالغہ کی منتخاض رہتی ہے“
 ”وہ چھان بچہ تھا۔ وہ کوئی چلانی پر آتا تو کوئی اس کا ہاتھ نہ روک سکتا۔ وہ خیر ساما تو دنیا پاہا آگتی۔ خدایا،
 اس کا ایک رعب تھا۔ دیدہ تھا۔ جلال تھا۔“

اور پھر ان دنوں اس کے بھائی نے بیٹی عجب خد چھڑی ہے وہ بھی اپنے باپ کا تھا۔ وہی غلطی وہی بدبہ
 وہی خد۔ وہ اس کے دشمن کی بیٹی تھی۔ ان انگوٹوں نے ہمارے گاؤں کی بہت سی لڑکیاں اٹھائی تھیں۔ یہ
 بھی ان کی لڑکی اٹھا لایا اصل میں لڑکی اٹھانے میں کوئی برائی نہیں۔
 جسے جب ہو کر حالات کا مجریہ کرنے میں معذور ہو گئیں۔

”جبرانی توبہ، نکل کر شہر کرنے لگا اس کو عزت سے پکارے گا۔ اور جانتی ہو بلا اس کے باپ نے کیا فیصلہ کیا؟“ انہوں نے کہنے میں فخر سو کر بڑی شان سے بیلا کی طرف دیکھا۔

”ہماری آن اور عزت کے لیے بالکل درست فیصلہ۔ حالانکہ ایسے فیصلے ہمیں سینے پر پتھر رکھ کر قبول کرنے پڑتے ہیں جس دن اسے بیاہ کر گڑھی لایا۔ اس کے باب نے اس کو گڑھی کے محافظ چیتوں کے آکر ڈال دیا۔ انہوں نے جو کچھ اس کے پاس اور عمل پر آئندہ کرنے کی کیا۔ یہ اپنے دانیال خان نے

آفرین ہے اس پر۔ تاجدار اُری اور فرض شامی کی اس نے ایک مثال قائم کر دی۔ اس نے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر بھائی اور اس کی محبوبہ کے بھوکے چہرے کے حوالے کر دیا۔ اسی لیے تو بھوتہستی کے لوگ دانیال خان کو پوچھتے ہیں سوچو یہاں اس نے اپنی روایتوں کے آگے بھائی کی محبت کو آٹھ منہ نہیں آنے دیا۔ وہ روایتوں کی اسان اور درضہ داری کا تکرار ہے۔“

اس کے کان سامنے سامنے کر رہے تھے۔ بھیا نک کو بچے سنائوں کی مہیشاں اس کے کان کے پردے

ہے بے گنج کہہ رہی تھیں۔ وہ کیسا سہی ایک سکتے نے جیسے اس کے سوچنے کے سارے
نظام کو باؤں کر دیا تھا۔

وہ اہم صحت جادہ جہاں کی تہاں بیٹھی خالی خالی نظروں سے بے بسی کی طرف دیکھتی رہی۔
یا خدا یہ کون سی نفس ہے؟ اور اس پر کون سا آسمان ہے؟“

جوانی قیامتیں دیکھ کر ٹوٹ نہیں پڑتا۔
 دیکھو اس غم کو کہ ۱۱۱۱ء کے طغیانِ شہنشاہِ عالم کی سسرال اس کی جانی دشمن ہو گئی۔ وہ

”میں اس عرب کو کیا ملا؟ بدے میں تو کسی رسولؐ کی طرف سے کسی بھی چیز کی طرف سے کوئی موقع اب بدلے کا ہاتھ نہ جانتے تھے۔ دیتے وہ سارے جنگلوں میں اگ لگا دیتے ہیں۔ ہمارے علاقے کی لڑکیاں لیتے ہیں اور ہمارے گائوں جاڑو پتے ہیں اور۔۔۔“

یہ بے باتی دیر سے کیا۔ بول رہی ہیں اتنی دیر تک اس کے دماغ نے کچھ سمجھنے سے انکار ہی کیا۔

سے کہڑوں میں تھی۔ بالوں کو برش سے ہموار کر کے اس نے جوتے کئے۔ چہرے پر پانی کے چھینٹا مارے۔
ہاں اب وہ حالات سے نبھو آ رہا ہونے کے لیے تیار تھی۔

وہ باہر آمدے میں آئی تو معمول کے مطابق طویل ستانوں نے اس کا رخ مقدم کیا۔ صبح کا وہ خوش گوار سا
شور جو ہر گھر کا خاصہ ہے یہاں نہیں ہوتا تھا۔ ناشتے کی تیاری میں جو افراد قری اور ہنگامہ شیروں کے
درمیانے طبقے کے گھروں میں نظر آتا ہے وہ بھی یہاں نہ تھا۔ یہ نہ تھا۔ یہاں تک ناشتے سے بھری ہوئی
توتہا ہی نہیں جتنہ یہ کون جن بتا رہا ہے اور کب یہاں رکھ گیا ہے۔ ملازم یہاں سے وہاں گھومتے پھرتے
بھی نظر آتے تھے۔ لیکن بغیر چائے کے قدم اور بغیر الفاظ کے زبان۔
وہ سیدھی جگہ میں تھی۔

خستہ خان اپنی مخصوص مہارت سے پراٹھوں کی شکل موڑنے کی کوشش کر رہے تھے اس کو ایک دفعہ
پھر یاد دہانی کی گئی۔ وہ بیٹھ ان کے لیے مصیبت انگیزی تھی اور خاتون خانہ کی اتنی
سرپرستی کہ وہ اپنی بد مزاجی کے مظاہرے اس کے سامنے کر بھی نہیں سکتے تھے۔
وہ بڑا کھلا ہوش میں کیا کیا بیل رہے تھے وہ سمجھ نہیں سکتی۔

وہ سیدھی گئی سے کاؤنٹر کے دو سرے طرف کھڑی ہو گئی۔ "ایک کپ چائے۔"
خستہ خان اس کی جلد بازی کی وجہ سمجھنے سے قاصر "الیکٹرک کیبل کا پلگ لگا کر اس کے لیے اسٹول
تھپتھپ لگے اس نے وہیں کھڑے کھڑے چائے کی پالی حکم کی۔
"اور ہاں" اس نے دروازے پر واپس جاتے پھر نصیحت کی "اگر کوئی میرے بارے میں پوچھے تو بتا دینا۔
میں نے تمنا کر لیا ہے۔ یہاں اس باورچی خانے میں۔"

اس نے نہایت سرور میں سے قدم باہر نکالتے ہوئے کہا "سن لیا خان، یہاں اس باورچی خانے میں۔"
وہ باہر نکلی اور سینکڑوں نگاہوں کی پروا کے بغیر پھاڑی کے اس موڑ سے وادی کے چلے حصے میں اتر گئی۔
"ہاں۔ آج روایات سے بھارت کا دن ہے۔"

اسی لیے اس نے خان گلی کی علاقائی لباس والی نصیحت کو قطعی غیر ضروری سمجھ کر روک دیا تھا۔
وہ دن اور وہ لوگ اب گزر گئے جو روایات سے پاسداری کا مجرم رکھ کر زندگی سے جوا کھیلے تھے۔
پہاڑی کی قدرتی سیر حیاں وادی کے مختلف حصوں میں جا کر اترتی تھیں۔
پہاڑوں پر کدال سے کھرا لائی کرتے والے مزدوروں نے نہ کام روک کر اسے دیکھا۔
چشمہ پر پائی بھرتی کپڑے و عورتی عورتیں رک گئیں۔
بچے ناشتے کے سوراخ پر دروازے سے سر نکال کر ہنسنے لگے۔

یہ سب کچھ فطری طور پر ہی ہوتا تھا۔ جیسے جگہ بیل اسے دیکھ کر سے ڈانے کی کوشش میں لہلہا رہے
تھے یہ جانور بھی عجیب شے ہے۔ انسان کی طرح وہ بھی بیکر برداشت نہیں کرتے۔
ابھی کے دو سرے طرف گھوڑوں کا استعمال تھا۔ کسی خوش وقتی میں خان گل نے اس کو گھوڑوں کی میر
کراٹے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب وہ باتیں اس کو برسوں پرانی لگ رہی تھیں جیسے وہ اسی پہاڑی کے اوپر
اوسے چڑھ کر کا حصہ بنی رہی ہی نہ ہو طویل اور چمکاوا رنگہ نڈیوں پر جس جگہ کی اسے تلاش بھی اس کے لیے

لیکن اس کے اندر وہ ناگ کرکڑاں جاتے ہی سہہ ڈپٹے اور بڑا سہہ بڑا سہہ تھک گئی تھی۔
ایک طرف سناٹا پڑتا ہے تو دوسری طرف کراٹھ لگتا ہے۔

یہ وہ سہرا تھا۔ جو اس نے ریت میں پاؤں ڈال کر تعمیر کیا تھا اور ایسے گہراؤں نکالتے ہی سہرا ہوجاتے
ہیں، ڈنٹے جاتے ہیں۔

وہ سہرا اس کے باپ کا گھر تھا۔ تاش کے پتوں کا گھر جو ہوا کے معمولی جھونکے نے تس نرس کر لیا۔
کتنی شام بیک رہی تھی۔ سوچنا بھی رکھ کی شعاعیں بکیر کر چکا تھا۔
وہ اس حالت اور اس شکل سے لوگوں کے سامنے جا کر بیٹھنے چلائے سے باز نہیں آسکتی۔ وہ ستر میں
منہ اونٹھائے کتھی دیر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ کتھی ہی مرتبہ اس نے پری اور مریم کو اپنی آواز میں
واپس چلے جانے کی ہدایت دی۔

رات گئے چوب دار نے بلند آواز میں پکارا تھا۔

چیتہ چھوڑ دینے لگے ہیں۔ کوئی شخص رات کے اس پریشاں باہر نہ نکلتے۔

یہ ترجمہ ایک مرتبہ اسے پری نے سنایا تھا۔ وہ جب بھی چوب دار کی آواز اپنی کھڑکی کے نیچے مٹی دیوار
جاتی تھی۔ یہ چوب دار اور پھرے دار آگلی سلاخوں کے سامنے میں رات بھر بھرتیاں بلند کیے کڑھی کی
حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

یہ گڑھی جو محبت جیسی معصوم چیز کو چیتے جیسے بھیا تک درندے کے آگے بھیجنا کر روایات کی
پاسداری کرتی ہے۔ لیکن وہ ان روایات میں حصہ دار نہیں بنے گی۔
وہ نہ چھوڑ کر فرار بھی حاصل نہیں کرے گی کہ بھانجا بڑی ہے اور اس میں کوئی نواں نہیں۔
اس نے صبح سے پہلے ایک حتمی فیصلہ کر لیا۔

یہاں ان لوگوں میں وہ گروہ ان سونے ہوئے مڑوں کو برسوں کی نیند سے بیدار کرے گی۔
یہاں وہ ضرور ٹھہرے گی۔ اپنی مرضی کرے گی۔ اپنی من مانی کرے گی۔
تو قہقہہ وہ لوگ اس کو بھونکے پیتوں کے آگے ان کے خواہناور پیٹوں سے بھنبھوڑے ڈانے کے
لیے بیٹھنے ڈالیں لیکن وہ یہاں بیداری کا انقلاب لانے کی ایک بھرپور اور آخری کوشش ضرور کرے
گی۔

وہ ایک مرتبہ یہاں کے لوگوں کو یہ احساس دلا کر ہی جائے گی کہ یہ روایات اور ان کی جھوٹی پاسداری ان
کو دولت کے کس کڑھے میں ڈال سکتی ہے۔

جی کہ ایک آخری گولی اور اس وادی میں برسے۔

ابھی صبح شروع ہونے ہی کو تھی۔

رات کی تاریک گھٹائوں کے بعد ایک چمپا چمپا سا سورج بادلوں کے پیچھے آسمان سے نکل رہا تھا۔ سورج
بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کی کمزور لیکن طاقت ور کرنوں کی روشنی کو زمین پر پھیلنے سے کوئی
خبریں روک سکتا تھا۔

اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ تازہ ہوا اور خوشگوار روشنی نے کمرے کو جگمگا دیا۔
اس نے الماری میں نصب قد سے طویل آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ وہ سیدھے سامنے عام

اسے کچھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔

نہیں کی تہیچھی پھٹوں کے نیچے گورنمنٹ پرائمری اسکول گڑھی پھلی خان کا محرابی کھٹ جا بجا چاروں

ہو گیا تھا۔ بچوں کے پھینکے پتھروں نے اس پر جی بھر کر چاند ماری کی تھی۔
وہ عمارت کے اندر داخل ہوئی تو بہت سی عورتیں پاؤں پیارے دھوپ تاپ رہی تھیں۔ ان کے

سامنے کسی ساگ کا ڈھیر تھا جس کو چاہکندہ سی سے درختی سے کاٹنے ہوئے وہ ہاتھ اور زبان افراط سے
چلا رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر ان کی لڑکیاں اخروں سے بے ہیل رہی تھیں۔
وہ خاموشی سے تختہ سیاہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جس کی سیاہی روقت نے پوچھا پھر دیا تھا۔ بھاگتے

اور شرماتے بچے آئے اور ایک دوسرے میں گھس گھس کر ناٹ رہے تھے۔ لگے اس نے ان سے اردو اور
پشتو میں سلام علیک کی۔ ان میں سے کچھ اس کو پہچانے کا شرف رکھتے تھے۔ اس نے ان کو بیٹہ مستی کورٹ
کے اس کچھ سبق پڑھا۔ پھر وہ گم ہو گئے۔
عالم! ان کے گھر والوں نے بے راہ روی سے محفوظ رہنے کے لیے مزید تعلیم سے روک دیا تھا۔

لیکن اب وہ تختہ سیاہ اور کرسی کے درمیان جی کڑی تھی۔ اٹل ارادوں کے ساتھ۔
تاؤتیکہ کوئی بھوکا چیتا۔ کوئی چٹی گولی اسے ٹھنڈا نہ کرے۔ اس کو اپنے ارادوں سے کوئی نہیں روک
سکتا تھا۔ وہ میل کے لوگوں کو درس دے گی۔ علم سکھائے گی۔ انقلاب لائے گی۔

میل تک کہ ان کی اگلی سٹپیں پچھلی سٹپوں کے کروتوں سے آگاہ ہو کر ان کو نیست و نابود نہ کر دیں۔
اس کے ساتھ طالب علم تو خوشی خوشی شریک ہوئے تھے۔ کچھ بچے جو بھاگ لیے تھے بعد ازاں
اور بچوں کے جم غفیر میں بنگلہ دوس دوڑتے دوڑتے شامل ہو گئے۔

اس سنی کرنی سردی میں نہ ان کے پہروں میں جو آتا تھا۔ نہ جراب۔ ان کی ناک کے نختوں سے گندگی
بہتے بہتے جم گئی تھی۔ اور گالوں پر شدید سردی کی سرخی نیلی پڑ گئی تھی۔
اسکول کا آواز ہوا تو عورتیں اپنا سامان اٹھا کر نکل گئیں۔

ان میں سے کسی بچے کو کوئی پھونکی صوفی سورہ زبانی یاد نہیں تھی۔ اس نے خودی سورہ پڑھی۔ ترجمہ کیا
اور دعا میں ان سب کو شریک کر کے اس کے آسمان کے نیچے دھوپ میں نئے علم کا آواز ہوا۔
تھوڑی دیر کے لیے کوئی راہ چھا اور واڑے میں رک کر اندر ہونے والے تماشے کا خوب مزہ لیتا۔ پھر

بد مزہ ہو کر اپنی راہ بولیتا۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد اسکول تھا۔ یا شاید ان علاقوں میں ایسے بہت سے اسکول
ہوں جو اس نے نہ دیکھے ہوں۔

ایک بوسیدہ ی کمن اکوڑا لہاری میں جانے کب کب کے اور کس کس وقت کے قاعدے کتابیں پڑے
تھے۔ اس اسکول میں ایک ہی کمرے میں مختلف جماعتوں کے طالب علم تھے۔ اس کو مغرب ماری تو بہت کرنی
پڑی لیکن وہ ہر طالب علم کو حتی المقدور سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ ان ہی بچوں نے اپنی شکستہ اردو میں

بتایا تھا کہ پچھلے سال یہاں ایک سرائے تھے۔ بتائیں کہاں چلے گئے۔ شاید چیتے کے بیٹوں میں (بعد وہ پھر
جب وہ گھر آئی تو اسے معلوم تھا جس طوفان سے اسے ٹھنڈا ہو گا۔
سوائے سرجن ثار کے کوئی بھی اس کے اس اقدام سے اتنا خوش نہیں تھا۔ بے اس کو اوھر
اُوھرے فقرے نکال کر محنت سے جو ڈکریہ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔ کہ یہ بستی آزاد پھرنے

والی عورتوں کو بند نہیں کرتی۔

"کیوں نہیں کرتی؟" اس نے کج بھٹی سے کہا "میں نے خود دیکھا ہے عورتیں ہر وقت ادھر ادھر پھرتی
رہتی ہیں۔" بے لے کچھ دیر کو چپ ہو گئیں۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ وہ بچ ذات ہیں۔ تمہارا مرتبہ اور ہے۔"

"میں بھی بچ ذات ہوں۔" اس نے خجل سے کہا۔ "اور میرا مرتبہ کچھ اور نہیں۔"

بے لے نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ اس طرح کی نہیں تھی۔ شاید گڑھی کی تنہائی نے اسے اتنا ڈالا
ہے۔ حالانکہ اب تو اس گھر میں اس کی ہم عمر لڑکیاں بھی موجود ہیں۔ ان کی نماز کو پور ہو رہی تھی۔ انہوں
نے حیرت میں دیر تک غرق رہنے کے بجائے نیت باندھ لی۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ انہیں یقین تھا۔

لیکن اگلے روز صبح آٹھ کر پھر اسکول چلی گئی۔ اس نے چھٹی کے وقت تک نہایت دیانت داری اور
دل لگا کے انہیں پڑھایا۔

پھر وہ پری کو ساتھ لے کر بستی کی عورتوں میں شامل ہو گئی۔ المیہ یہ تھا کہ وہ ان کی اور یہ اس کی زبان
سمجھنے سے قاصر تھیں۔ پری بھجکتے بھجکتے آئی۔ اتنے عرصے کے ساتھ نے اس میں بیلا سے
وفا داری کا احساس بھی پیدا کر دیا تھا۔ وہ گڑھی کے مالکوں سے بھی غدار ی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بچکا کر چپ ہو رہی۔

"یہ کئی ہیں ہم پوڑھی ہو گئی ہیں۔ ہمیں کام کاج سے فرصت نہیں۔ ہم کیسے پڑھ سکتے ہیں۔" پری نے
خواتین کا بھجکتے بھجکتے ترجمہ کیا۔

"تیر کئی ہیں ہمیں کوئی شوق نہیں۔"

"یہ سچی ہیں ہمارے موبہ سے تھا ہو جا میں گئے۔"

وہ خاموشی سے واپس آئی۔

ہر کام کی ابتداء میں انسان اسی طرح جایوسی کے گڑھے میں گرنا ہے لیکن اگر وہ اٹھنا نہ سکے تو لوگوں کی
نظروں میں عبرت کا نشان بن جائے۔ اس نے خود کو خاموشی سے کمرے میں بند کر لیا تھا۔ ان دنوں زندگی
پر دگرگم رہتا تھا اور ان کو توڑتے گزر رہی تھی۔ بچوں کا نصاب عورتوں کا نصاب، کشیدہ کاری۔ ان

سلاخیوں کو شیا اور ان جلاوطنی کے دنوں میں اس کی کس کس سے جھڑپ نہ ہوئی۔ بے لے سے شمارہ
سے ٹھان گل سے ہاں لیکن اگر جھگڑا نہیں ہوا تو دنیا ال خان سے۔

انہوں نے جیسے اس کو من مانی کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اور کتنی مرتبہ وہ ان کے سامنے چیلنج
کرتی وندائی گزری۔ لیکن ان کی نظر میں اس کا یہ اقدام نہ قابل تحسین تھا نہ قابل مذمت۔

کہ اگر ایک گڑھی کی زندگی میں وہ انقلاب آگیا جو کم از کم بیلا کی نظموں میں ناقابل قبول ہی تھا۔

اگر یہ کسی بالکل اجنبی شخص کا معاملہ ہو تا تو تب بھی شاید اس میں مداخلت کرنے سے باز نہ آتی۔ یہ تو
پراس کی دوست راست پری کل کی کل زندگی کا سوال تھا۔

وہ صرف چودہ سال کی تھی اور قیمت خان نے اس کی شادی اڑتیس سال کے اپنے قبیلے کے ایک فرد
سے طے کر دی تھی۔ اڑتیس سال کا تو وہ اپنے منہ سے کہتا تھا لیکن دیکھنے میں پینتالیس سال سے کم

میں لگتا تھا۔ اس کی پچھلی بیوی سے اولاد نہیں تھی اور قیمت خان اپنی نسل کے خاتمے سے خوف کھاتا

تھا۔ وہ اس کا اکلوتا بقیہ تھا۔ اور ظلم یہ ہوا کہ پرنی نے اپنے تمام تر ضبط کے مظاہروں کو شان سے ٹوٹا رکھ کر بیلا کے سامنے بھی زبان نہیں کھولی۔ وہ بچے کو بشکل لفظوں سے روٹھاس کر رہی تھی کہ اس کی سبکی روٹی دعویٰ فرما لے کر آج بھی۔ وہ روٹی جاتی تھی۔ ناک پونچھتی جاتی تھی اور بڑی مشکل زبان میں بولے لفظوں کا وہ ایک مطلب بھی سمجھ نہیں پاری تھی۔ کہ پرنی نے ٹیپ رائٹر سے اگلے لفظوں کی طرح کھٹ کھٹ ترجمہ شروع کر دیا۔

"یہ کہتی ہے پرنی پر ظلم ہو رہا ہے ہم یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔"
"وہ سمجھاری ہے کہ پرنی کی شادی بے جوڑ ہو رہی ہے۔ اس کا باپ ظلم کر رہا ہے۔"
"وہ کہتی ہے آپ جا کر سردار کو سمجھائیں۔ بے بے کے ہاتھ پاؤں جوڑیں۔ یہ لوگ چاہیں تو یہ شادی رک سکتی ہے۔"

وہ جب چاہ پرنی کو دیکھتی رہتی۔
ہر لوگ ظلم سنے سنے استے ملادی، ہو جاتے ہیں کہ ظلم برداشت کرنے کی عادت بھی اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے صلا حقیقتیں لے آتے ہیں۔ پرنی نے اس سے کچھ شکایت نہیں کی تھی۔ بیلا نے اس کو ترجمہ کرنے کے لیے اپنے ساتھ رکھ رکھا تھا۔ لہذا وہ کسی بے ایمانی کے بغیر ایک بہت بڑے ٹرانسلیٹر کی طرح بے لاگ رو بہ رو پیش کو ہوتی۔

ایسا کرتے ہوئے نہ اس کی آنکھیں جھکیں، نہ چہرے کا رنگ اڑا، نہ ہی وہ ہسٹیبو یک ہو کر روٹی جیسے ہر روز ایک دوڑے آدمی سے شادی کرتے رہنے کی عادی تھی۔
شاید جو روز ہر روز اسے ارد گرد ہوتے دیکھتے ہیں اس کے اسی طرح ملادی ہوتے ہیں اور ہنسنے رہتے ہیں کہ کس دن یہ واردات ہم پر گزرے گی۔
وہ جانتی تھی کہ بے سے بے بات کرنا بالکل ضائع جائے گا۔

انہوں نے بات تفصیل سے سنی بھی نہیں کے کات دی۔ "بیلا میں دیکھ رہی ہوں تم بہت حساس ہو اور ضرورت سے زیادہ حساس انسان اپنی ذات کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ لوگ اسی طرح خوش رہتے ہیں۔ یہ کوئی ظلم بھی نہیں۔"

اس کا اندازہ بھی تھا۔ اسے اس سے زیادہ جواب کی توقع بھی نہیں تھی۔ ظلم کے خلاف احتجاج کرنا تو آسہ تب تک نہیں گئے جب آپ ظلم اور انصاف کے درمیان تفریق کر سکیں۔ بے سے بے کے علاوہ کسی سے بھی کچھ کہنا بے کار تھا۔ کوڑھی کے معاملات میں صرف بڑی لوگ وکیل تھے اور دوسرے شخص سے اس نے غیر محسوس طریق سے کڑا شروع کر دیا تھا۔ اور اتفاق ہی تھا کہ انہوں نے بھی کسی ضرورت یا کام کے سلسلے میں اسے طلب نہیں کیا۔ ورنہ شاید اس طلبی کے جواب میں وہ اس باجدار کی کامظاہرہ کر بھی نہ سکتی جو اس کی شخصیت کا فائدہ بن گئی تھی۔ خان گل مستحکم آدمی تھا۔

اور جب سے اس کو اپنی ذات میں ایک نئے انسان کا وجود ان ہوا تھا۔ جس وہ اور لوگوں سے کئی تھی خان گل سے بھی کٹ کر رہ گئی۔ باقی ماندہ لوگ اس کی اس بے توجہی کا شکار نہیں ہوئے۔ مرجن پٹار ان کے زخم کو تسلی بخش باکرہ پسہ ہی جلد روانہ ہو گئے تھے۔ ساتھ اور شہر میں اپنی زندگی میں مصروف تھیں۔ کبھی سارہ نے کو شش بھی کی تو دوسرے شخص کو دوسرے سمجھ کور مڑوا کر لیا۔

ایک۔ بے تھیں۔ رات سونے سے پہلے وہ کچھ دیر کو ان کے پاس آجاتی۔ وہ رات بھر لی تو اس میں دیکھ رہی تھیں لیکن یہ سمجھتے تھے کہ قاصر تھیں کہ یہ انقلاب ان کا اپنا ہی لایا ہوا ہے۔ وہ وائیل خان کی سختیوں سے بھی واقف تھیں ضرور اس نے سخت سزا دے کر بھی کو بیلا مان کر دیا ہے۔ لیکن خان گل اندازوں کا عادی نہیں تھا۔

اس نے تھوڑے دن حمایت صبر و برداشت سے بیلا کے اس رویے کو برداشت کرنے کی کوشش کی پھر وہ سیدو شریف چلا گیا۔ صرف جانے سے قبل اس نے ایک آخری ٹیپ بیلا سے لی۔ وہ بھی بیلا کے سرد سرد سے خاموش رویے نے اسے جیسے کسی نے اسے راستے کا چارہ دے دیا۔
"ابھی تو میں نے تم سے کیسے وعدوں کو پورا بھی نہیں کیا تھا کہ تم آگیاں گی۔"

"ہائیں۔ ہائیں۔ کوئی شے گاؤں کی سوچے گا خان گل۔" اس نے شرارت سے جواب دیا۔ "یہ وعدے ہیں بھی کون سے کھڑ سواری۔ بہتی کی سیر جنگل اور جنگل کے جانوروں کا دیدار۔ چلو خیر تمہارا کام زیادہ ضروری ہو گا بھی تم جا رہے ہو۔" اس نے بڑے رساں سے تمنا چاہا۔ لیکن خان گل طبیعت کے اس رساں کو ہضم نہیں کر سکا۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ اور یہ تو جنگل کے جانور بھی سوچ رہے ہیں کہ تمہارے اندر ایک بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔"

"میں سے۔" اس نے خوش ہو کر کہا "تو جنگل کے جانوروں نے سوچنا شروع کر دیا۔ دھا کو اسی طرح ایک دن انسان بھی سوچنے لگے۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ اگر انسان سوچنے لگا تو تمہارا کیا بے گا۔" وہ لڑنے کے بجائے خاموشی سے اسے دھمکتا رہا۔
"کیا تم نے اپنے راستے بدل لیے ہیں؟"

بیلا سے اس کے لہجے کی متنی تیزی نہیں تھی۔ اور وہ اس قصور کو طول بھی نہیں دیتا چاہتی تھی۔
وہ اس کی ہمیشہ ہنساتا رہا تھا۔ جس نے والے گڑی کے چہرے پر تلخ کایہ اذیت ناک قصور و مستوں کو بہت تکلیف دیتا ہے۔

"جناب خان صاحب میں نے تو ابھی اپنے راستوں کا انتخاب بھی نہیں کیا۔ آپ بدلنے کا بہتان باندھ رہے ہیں۔"

"راستوں کا انتخاب بہت مشکل کام نہیں۔" خان گل نے اپنی سخت قسم کی سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

"ہاں واقعی۔ یہ ایک پگڈنڈی ہے جو جنگل کی طرف کل جائے گی۔ یہ راستہ بہتی کی طرف جاتا ہے جہاں ایک رات ہی اسکول ہے۔ وہاں پر یہ پڑھانا آپ کے لیے کافی معیوب ہے۔ اور یہ ایک راستہ ہے جو براحتہ کی گڑھی کی طرف۔"

"گھوٹا آب کوڑھی کے چوک پر کھڑی ہیں اور آپ کو راستہ نہیں مل رہا۔ اور آپ بھول گئیں بیلا بیلا۔ یہ ایک راستہ گھوڑی کے سردار گل کی طرف بھی جاتا ہے۔"

وہ جب سے ملا تھا زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اس کو اصلی نام سے پکارا تھا۔

پھر وہ اگلے تہہ میں پلٹ گیا۔ پانچ نہیں گزری تھی کہ محل کی طرف اشارہ کر کے وہ اسے کیا جتا رہا تھا۔ اس گزری میں اس نے سمیت بہت سے کہیں کیا تھا۔ لیکن وہ چلا گیا اور پری کے سلسلے میں جو اس کو رسی سی بات کی امید تھی ساتھ لے گیا۔ شام تک وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ پری کی زبانی ہی اس کو بتا چلا کہ وہ سارا اور سیریں کو خوش چھوڑنے چلا گیا ہے۔ اور وہ اس کی رپورٹ موصول ہوئی کہ وہ چند روز سیدو شریف میں قیام کرے گا۔ اب گفتگو کے لیے صرف ایک شخص باقی تھا۔ اور اس سے گفتگو کرنے سے خیر کھا کر مر رہا ہے تھا۔ اس کا لہجہ اس کے طور کسی تلوار سے کم نہیں تھے۔ وہ اس کو ملاقات کے لیے دھوڑتی پھری اور وہ اس کیل کے پاس گھونڈوں کے سلسلے میں کسی سامیہ پر برس رہا تھا۔

”قیمت خان“ اس کے ٹھہرے ہوئے بعد پر وہ چونک کر گھوم گیا۔ اس نے اپنی ذات کے گرد خوف کا جھوٹا طاری کر رکھا تھا اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا یہ مصیبت سی لڑکی اس کو یوں چونکا دے گی۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ قیمت خان۔“ اس کے ہاتھ پر بڑی بوٹی تھی۔ بھنوس دوہل کھا کھاتے سے جا کر اس کی آنکھوں میں حیرت اور اس کی جھڑپ پر تنبیہ سی تھی۔ لیکن محلوں میں اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ اس نے پشتو زبان میں اپنے سامیہ کو غالباً ”چلے جانے کے احکامات دیے۔“ کو تک وہ فوراً ہی غائب ہو گیا تھا۔ سوالیہ نشان؟ ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کے ماتھے پر تھا۔ اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے چہرے پر تھا۔

”مجھے پری کی بات کرنی ہے؟“ اس کے سوالیہ نشانوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی حیرت زدہ تھا۔ وہ پری کی آخر کون سی بات کر سکتی ہے۔ کسی بڑے کھٹے کوئی سے لمبی چوڑی تقریر کرنا۔ اور کسی ان پڑھ آدمی کو الف بے پڑھا دیا۔ ایک اور کام تھا ایک بالکل ہی اجنبی شخص کو اپنے نظریات میں پتھر کی طرح سخت ہو۔ بلا تا بہت مشکل امر تھا۔ وہ اسی طرح اس کے راستے میں بٹا ہوا تھا۔

”پری کی بات؟“

”تم پری کی فلاح جگہ شادی کر رہے ہو۔“

قیمت خان کی آنکھوں میں سرخ رنگ کا خون لڑا۔ اگر اسے وائیل کا لحاظ نہ ہوتا۔ اور اگر وہ وائیل خان کی مہمان نہ ہوتی تو شاید محلوں سے پہلے اس کی جھڑپ اس کی گردن اڑا دیتا۔ انسان اور جانور کے غصے میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ اور جانوروں کے غصے میں سب سے بڑا فرق انسان ان سے وفاداری تو کھینچتا ہے کہ نہیں لیکن ان کے جارحانہ طور ضرور یکساں ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اعصاب سمجھنے ہوئے تھے اور غصے کے بارے اس کے منہ سے کف نکلا رہا تھا۔ لہجہ بھر کو اس کو لگا اگر قیمت خان کی کوئی دم ہوتی تو وہ ضرور کھڑی ہو جاتی۔

”مجھے پری سے محبت ہے۔ اور میں اس کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمہاری شکایت وائیل خان سے لگاؤں گی۔ اور سب سے پہلے تمہاری۔“

حالانکہ وہ اپنی و مسکائی کے بے اثر ہونے سے خوب آگاہ تھی۔

پھر اسکول میں دو مرا انتخاب آیا۔
وہ جو ایک مدت سے چٹاؤروں کا مسکن تھا۔ جہاں آوارہ لڑکے اخوت کھیلنے کے سوا کچھ نہیں کرتے تھے۔ ایک اسکول ماسٹر آیا۔ وہ محکمہ تعلیم کی روایات کے عین مطابق اسکول بستر کے مخمیں لکھا اس پر سنہری دھوپ کا لطف لیتے سب بچوں کو ایک سرکل میں بٹھائے ان کے کمر کا کام چیک کر رہی تھی کہ اس کو اطلاع ملی کہ وہ محکمہ تعلیم کی طرف سے نامزد کر کے ایک ٹرینڈ ٹیچر ہے۔ اور متعلقہ ڈائریکٹر نے اس کی باقاعدہ تقرری کر کے یہاں بھیجا ہے۔ وہ بحر میں سمجھ گئی۔

یہ سب دانیال خان کی محنت کا ثمر ہے۔
پس اسکول میں لوہا پھرنے سے بچانے کا غالیہ ایک ہی حربہ تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اس کو اپنے ان اراہوں سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن وہ کہتے کہینے شخص تھے کہ درپردہ بڑی مہری قسم کی سازشوں میں ملوث تھے۔

اس نے نئے ٹیچر کے کاغذات کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔
"یہاں کوئی اسکول نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ہے بھی تو اس کا چارج آپ کو نہیں دیا جائے گا۔" اس نے بے مہری سے کاغذات لٹا دیے۔ اس کو شاید جواں کرنے کا زیادہ شوق بھی نہیں تھا۔ اتنی مصیبتیں جھیل کر اتنا سہرے طے کر کے وہ اتنی دور درجہ آگاہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو سکون سے چلا گیا۔
اور رفتار زندگی میں اس دن واپس آگیا تھا کہ اس واقعے کے چند ہی روز بعد دانیال خان کے کمرے میں اس کی طبیعت ہو گئی۔

پندرہ سو پندرہ سو زنیس اس نے اس طرف کا رخ کیا تھا۔ کوئی ہلاوا آیا تھا۔
اس خود کو گوشت کے کھیل کی کہانی کے گرد یہ سلامتی قح تھا کہ اس کے روز بچا تھا۔ یہ نہیں وہ اپنے چہرے ان کے لیے چینی نفرت روک سکے گی۔ یا کل کر اٹھا کر آئے گی۔
پتا نہیں ایک شقی قاتل اور ایک سپر رستم خونی کے چہرے پر وہ کہانی دوبارہ پڑھ بھی سکے گی جو اس نے اور جری ہمارا کر بھیجے تک دی تھی۔

وہ متشخص خوب صورت، دروازہ۔ جو لوگوں کی زندگیوں سے بے رحمی سے کھیلتا اور ان کی تقدیر کے بدترین فیصلے کرتا رہا ہے اس نے بے آواز آہستہ سے کہلا۔

چند روزوں میں پندرہ برسوں کے قاصد کیسے آجاتے ہیں؟
یہ وہ ہی جگہ تو تھی جہاں ایک مرتبہ ایک مرتبہ دم شخص نے آخری راتوں میں اس کو کھارا تھا۔ موت کتنی خوفناک ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ آپ کو اپنے سامنے نظر آ رہی ہو۔ اس موت کے فیصلے ہم کہتے ہیں وہ وہی ہے۔ وہ سروں پر ٹھوس دیتے ہیں۔ وہ شخص اس کے سامنے ہی آرام کر رہی ہیں وہ نہا۔
میلوں اور ٹکیوں کا ایک جھڑک رہا تھا۔

کاش میں نہیں سمجھتا سکوں دانیال خان۔ زندگی اتنی آرام دہ نہیں۔
لیکن وہ بے مکان اس کی آنکھوں میں دیکھتے اس کو جو اس باختہ کرنے کے لیے جیسے ہرگز آزار ہے تھے۔ اس نے سامنے پر کھمبے بالوں کو دو ٹول ہاتھوں سے سمیٹ کر پیچھے کیا۔ اور ہاں ساتھ ہی ساتھ ایک شہر بھی کہ وہ اتنی کمزور اور اتنی بےست نہیں۔ وہ نہ لفظوں کے گھماؤ میں آئے گی نہ لفظوں کا یہ سحر اس کا کچھ بگاڑ

تھے گا۔

"آپ نے مجھے بلایا تھا۔" اس نے سامنے کھڑے ہو کر صاف اور کھلی آواز میں ان کو پوچھا۔
"تشریف رکھیے۔" انہوں نے سارے آواز میں کہلا۔

وہ خاموشی سے سونے کے پاس پہنچی ایک کرسی پر بیٹھ رہی۔ اسے بلایا گیا تھا۔ اور وہ اپنے عرائسے ہر جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کی بجائے خاموش رہی۔ اور اس کے یہ عرائسے دھکے پیچھے بھی نہیں تھے۔ وہ تیار تو اس کے چہرے سے برس رہے تھے۔
"جی؟"

انہوں نے کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھا۔ اپنی گود میں بکھرے کاغذوں کو انہوں نے الٹ پلٹ کر کے کھڑکایا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی اس کی طبیعت کے سلسلے میں یہ کاغذ بھی ایک اہم دلیل ہیں۔ شہوالوں نے اس کے خلاف کوئی عرضی دی پر اہل شر کے تو یہ بس کبات نہیں لگتی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں یہ پچھلے تیرہ دنوں میں آپ کی سرگرمیاں کیا رہی ہیں۔"
"ڈیگریشن کا نام کھل بھلا کر اڑھا رہی ہیں۔ فریج کے سلسلے میں جو کپ نے۔"
انہوں نے مشین کی طرح بولتے اس کے لیے کو ٹوک دیا۔
"میں گھر کے اندر کی نہیں باہر کبات کر رہا ہوں۔"

"باہر کبات کون سی بات؟" اس نے اپنے ہاتھوں کو مسلا۔
"حقائق سے آپ حقیقت میں بھی اتنی ہی انجان ہیں۔ جتنی آپ اس وقت ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ازراہ گرم مجھے صحیح صورتحال سے آگاہ کیجئے۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کے بیٹے کو دانیال خان سے جھگڑا کرنے کا پروگرام بنانا روایات ان کی آنکھوں کے سامنے بیٹھ کر ان سے کچھ بچتی کرنا اور۔
"میں غور توں کے پاس بیٹھ کر عام طور پر ان کو بڑھانے کی۔"

"میں اسکول کی بات پوچھ رہا ہوں۔ آپ نے اسکول ماسٹر کے ساتھ کیا کیا؟"
"وہ جو امن کرنے جو گیا تھا۔" جھوٹ بولنے کے سارے ہنر اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔
"اسے جو امن کیوں نہیں کرتے یا گیا۔" ان کی آواز تندرست تیز ہو رہی تھی۔

"وہ یونہی آیا تھا۔ وہ یہاں رہتا بھی نہ۔ اس کے اراہوں سے لگتا تھا وہ تھوڑے دنوں کے بعد نوکری چھوڑ کر چلا جائے گا۔ جیسے وہ ہمیشہ یہاں رہے گا بھی نہیں۔" اچانک ان کی آواز تیزی تیزی آہستگی میں بدل گئی۔

"اور آپ۔ آپ کو ہمیشہ یہاں ہی رہنا ہے؟"
بے ساختگی کی ایک لہر کے ساتھ پٹا کا منہ چپ کیا۔ واقعی اس نے یہاں تک تو سوچا بھی نہیں تھا۔ دانیال خان نے غالباً اس کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس اسکول ماسٹر اور گورنری عیسیٰ کی بیلا میں کوئی خاص فرق بھی نہیں۔ ان دونوں کو یہاں ملازمت کے لیے بلایا گیا ہے۔ مدت ملازمت کے خاتمے پر دونوں ہی کو جانا ہوگا۔ کتنی دیر وہ کچھ بولنے کے متحمل نہیں رہی۔ کاش اس فرش میں اتنی ہی عجائبات نکل آتی کہ وہ آہستگی سے اس میں سما سکتی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے لگا جیسے اس کے پاؤں میں بھاری پتھر

پڑے ہیں جیسے ایک قدم اٹھا کر بھی ان کے سامنے سے گزر کر کہیں نہیں جاسکتی۔
 ”سوری“ ایک طویل خاموشی کے پل سے گزر کر آہستگی سے اس کے منہ سے پھسلا۔ آپ دنیا کو بمل نہیں دیکھتے جب تک آپ کے پیروں کے نیچے زمین مضبوط نہ ہو۔
 ”سوری؟“

”اتفاق سے میں اتنا خود مختار نہیں رہتا۔ یہ اسٹیٹ حکومت کی نیکس رہنمائی ہے۔ یہاں قانون حکومت پاکستان ہی کا چلتا ہے۔ ملازم بھی ان ہی کا آتا ہے۔ دیکھو ایجوکیشن والوں نے میری لکھی سخت باز پرس کی ہے۔ تم نے ان کا آدمی بھجوا دیا۔ اگر تمہیں اس اسکول میں نوکری کرنے کا شوق ہے تم مجھ سے کہیں۔ میں تمہارا تقرر کرواؤں گا۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ اچانک دنیا نے ایک بڑی کوٹ لی تھی۔ اور کہنے کو اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔

”میں تمہیں صرف ایک نصیحت کروں گا بیٹا۔ تم عورتوں کو پردہ عاؤ۔ بچوں کو تعلیم دو۔ جہاں دل چاہے جاؤ۔ جن کے درمیان رہنا چاہو رہو۔ لیکن خدا را قیت خان کے معاملے میں دخل نہ دینا۔ وہ اپنے دل کا آؤی ہے۔“ جلتے جلتے رک گئی۔

”لیکن قیت خان نے وعدہ کیا تھا وہ آپ سے۔“ اس نے زبان انہوں سے روک لی۔
 ”قیت خان بہت ظالم ہے۔“ حالانکہ وہ طے کر گئی تھی وہ آج رانیال خان کے قلم خا کر م لے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی قیت خان بھی آج بے گناہ تھا۔

”لیکن قیت خان کی تمہارے بارے میں اتنی بری رائے نہیں۔ اور وہ ظالم بھی نہیں۔ بس تم نے اس کو جتنا نہیں ہے۔“

”آپ اس کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ وہ پری کی شاوی وہاں نہ کریں۔ وہ بڑھا لکھا ہے۔ اور...“
 ”نہتے لکھے آدمی کو کون سمجھا سکتا ہے۔ آپ بہتر جانتی ہیں۔ ان آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں۔ میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ آپ اگر ان میں انقلاب لے آئیں تو...“

وہ ساکت رہ گئی۔ اس انقلاب کا ٹارگٹ کون سے سردار رانیال خان۔ شکر کرو کہ تمہیں نہیں جان سکے وہ مجرموں کی طرح قدم اٹھا دیں۔ روانے کی طرف بڑھنے لگی۔

”بیٹا بیٹی! آپ نے ایک بات کا تو جواب دیا ہی نہیں۔“
 ”جلتے جلتے ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک سیکنڈ کے لیے ہی دیکھا تھا۔

”کیا آپ کو یہاں پتہ نہ ہے؟“
 پھر جیسے وہ پتھر کی ہو گئی۔ لفظوں کے انداز بات کے انداز کو بدل ڈالتے ہیں۔ اور اس کے پاس دفاع کے لیے نہ وسائل تھے نہ کوار۔ اس نے آہستگی سے دو واہ بند کیا اور تیز تیز قدموں سے بیڑھیاں اترتی ہوئی۔

وہ جاگتا نہیں جانتی تھی۔ لیکن سونا اس کے لیے دشوار ہو گیا۔
 وہ آنکھیں بند کر گئی تو جلتی چنگاریاں اس کی پکلیوں میں چپتے لگتیں؟ گرم گرم راکھ جیسے پوٹوں کے درمیان آجائی۔ وہ کن لوگوں کے درمیان رہتی ہے؟

کیا خفیہ جاتی نیلے رحم شخص اس قدر پرسکون انداز میں کسی کے اندر اتنی اٹھل پھٹل کر سکتا ہے۔ وہ بچوں کو پرستاتی یا عورتوں کے درمیان مغز باریقی اس کی آنکھیں جیسے ایک سی کمانی اور ایک سی منظر راہی رہتی تھیں۔

”بھئی، بھئی، اسی تواتر سے گزرنے والے منظر سے گھبرا جاتی۔
 پھر وہ بچوں کے ساتھ ان کو بندہ منٹن کھانا کھاتی۔
 ان کو پتہ نہ ہوئے تھے نازہ بانی کے دروازوں میں تیرنا کھاتی۔
 چھوٹے بچوں اور تیز رفتار گھوڑوں پر گھڑسوار کی کادرس دیتی۔
 شاید ایسا ہی ایک کام دن تھا۔ جس دن بچہ بانی میں ڈوبنے سے بچا۔ اور وہ سرابند منٹن کی شام سارے پہاڑی سے لاکھڑا ہوا۔ اور وہ تیز رفتار جن گھوڑا اس کو لے کر بے قابو ہو گیا۔
 لکھ کر اس کو لگا آسمان الٹ کر نیچے آیا ہے۔

پہاڑ اور پتے سب آپس میں گڈھ ہو گئے۔ اس نے ہانگوں کی طرح دوڑتے گھوڑے کو مضبوطی سے پکڑنا چاہا۔ لیکن اس نے منٹن کی جھٹ میں ٹھوکریں کھا کر اس کو گرادیا۔

گرا گئے کے بعد بھی گھوڑے کا اشتعال خیم نہیں ہوا۔ وہ پہاڑی راستوں پر جھنگلے کھاتا اس روانی میں بہت آگے نکل گیا۔ اونچائی سے گرنے کے کئی دیر اسے جکڑ آتے رہے۔ شاید اس کے سر میں چوٹ بھی آئی تھی۔

گھوڑا بہت آگے نکل گیا تھا۔ وہ اسی طرح سر پہلے دونوں جھٹوں کو سارا دیکھ اپنی چوٹیں سہلائی رہی۔

یہ کون سی جگہ تھی۔ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔
 پتا نہیں وہ ابھی بہتی ہی میں تھی یا بہتی سے پار نکل گئی تھی۔ دو منٹوں میں تھی یا دھنوں میں۔
 اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور چلا کر گری۔

کتنے منٹ اس نے آنکھیں بند کر کے تھکے ہوئے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔
 ”آہ“ وہ سانس ہی گھر نظر آ رہا تھا۔

گھر اور اس جگہ کے درمیان صرف سیب اور خوبیتوں کے بارغ ہی تھے۔ ان باغوں میں اس نے کتنی مرتبہ چل قدمی کی تھی۔ کتنی مرتبہ قیت خان کو اس نے اس طرف دوڑتے دیکھا تھا۔ کتنی ہی مرتبہ قیت خان نے اس کو بمل سے دھچکا کر بھاگا تھا۔

اس کے سارے جسم میں سوری کی ایک لہر دوڑ گئی۔
 یہ اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ جتنے کے ٹھکانے کے عین سامنے چاروں شلے جت لیے لیٹی تھی جیسے

دلوں سے اس آرزو کی تکمیل کی خواہش کرتی آ رہی ہو۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شدید چوٹ کے ہاتھوں وہ پکڑا رہی۔

لیکن پکڑا کر گرنے سے پہلے کسی نے اسے سنبھال لیا۔
 ہوش اور بے ہوشی کی اس کیفیت کے درمیان اس کے منہ سے ایک بے یاک جھٹ نکلی۔ پھر آہستگی سے اس پر خیر غلب آ گئی۔

کرنے سے سنبھلا لیتے لیکن اس نے کسی کو خود پر جھکاؤ دیا محسوس کیا۔ جھٹکنے والا کچھ بڑھاپا بھی تھا۔ لیکن وہ ہوش میں تھی ہی کہاں۔

اس کے اوپر جھٹکا ہوا نیلا آئینہ پھر جھٹکا گیا۔ آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔

”رے یہ جنگل میں پھول کہاں سے کھلا؟“

بلاشبہ اس فقیر کی ساخت کو اگر وہ ہوش میں ہوتی تو بھی برداشت نہ کرتی۔ اس اجنبی سے ویرانے میں بچے میں شائستگی اس کو برہنہ ہوتی آنکھوں میں بھی محسوس ہوتی۔ یہ بوجہ یہ انداز اس نے کہاں سنا ہے۔ اس نے دل پر زور دینا چاہا۔ بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل اس پر مرکوز کیا لیکن طویل سانس کے سوا اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ پھر وہ سایہ بھی اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ وہ دنیا بے باطل بے خبر ہو گئی۔ ایسی بھی اور خوبصورت خیزدیں گود گودوں سے وہ ترس رہی تھی۔ اس کے ذہنی سرادر آنکھوں پر طاری ہو گئی۔

وہ پتا نہیں سکتی یہ سوئی ہوئی۔

اس کا آنکھ کھل کر اس کو گوارا رات بھر کی طویل اور پرسکون نیند کے بعد بیدار ہوئی ہے۔ لیکن وہ کہاں

سوئی رہی تھی۔

کیا یہ لاہور والا کمر ہے؟ لیکن اس کی بستی پر سرور ہے ایسے براق پائل تو نہیں اترتے یا یہ رجم چاچا

کی بستی ہے یا وہ بستی کمر نکالنے کو گوشے کے بستر پہنچی تھی اور سوئی رہ گئی۔

حالا نکدہ وہ کوئی شراوی نہیں تھی۔ نہ اس کی آنکھوں کی سرکیاں نکالنے کسی کو اتنا تھا۔ بوجھل سر سے

اس نے ذہن سے بہت کچھ جھٹکنا چاہا۔ یہ سب کچھ وہ نہیں تھا۔ پانچ چورندہ چھاپا تھا اس کی سمائی آواز

شاید وہ شہر کے دنگل میں بھی سن کر بچان لے لی۔ ایک بھی آواز گروسی کی گوار تھی۔ جو آزادی سے

درختوں پر چھپاتی پھرتی تھی جس پر کوئی کوئی اس کو خاموش رکھنے کے لیے آج تک نہیں گوی تھی۔

لوہے کی سلاخوں والی کمری کے اس طرف چپک چپکے کپڑے کا پردہ سلاخوں سے سرگرا کر پھینکا تھا۔ باہر

کوئی پورانا تھا کہ برتنوں کی بے شمارنی آوازیں سکوت کو توڑ کر ماحول کو بالکل اجنبی بنا رہی تھیں۔

یہ گروسی عیسائی زبان ہے۔ لیکن گروسی کا یہ کون سا گھر ہے یہاں تک وہ پیسے پہنچی؟

اس نے بستر سے تھوڑا سا اٹھنا چاہا۔ پاؤں چارپائی سے نیچے اتارا۔ لیکن نذر کا ایک چکر آیا اور سر کی

ٹیس نے اسے اٹھنے کے قابل نہ چھوڑا۔

”نندہ۔ یہ غلطی نہ کرنا۔ تمہیں چوت آئی ہے۔“

اس نے بے ساختگی میں آواز کی سمت کھٹے دروازوں میں ایستادہ اس شخص کی طرف دیکھا اور

آنکھیں جھپکائیں۔ بلاشبہ وہ اتنی مضبوط اعصاب کی مالک نہ ہوتی تو اس وقت ضرور بے ہوش ہو جاتی۔

جالوں پر بھروسے وارو می کے سیاہ پل مچھوٹے اور سر کے کالے سیاہ بے ترتیب سے بالوں کے سوا

اس کے چہرے پر اگر کچھ تھا تو ان جڑی ہوئی جھنڈوں کے نیچے بڑی واضح روشن آنکھوں میں دیوانگی کی

گوندی سی لپک تھی۔

ایک نظر میں وہ شفا خانے سے بھاگا کوئی ادائیگی مریض لگتا تھا لیکن وہ بڑے مستانہ انداز میں مسکراتا بھی

تھا جس سے اس کے چہرے پر بھیلی ہوئی بے پناہ کرتلی ملی ہی ماند پڑ جاتی۔

”یہ لڑکھٹے ہوئے آپ کہاں سے آرہی تھیں۔“

پتا نہیں وہ کہاں سے آرہی تھی۔ اس وقت کسی کام میں مصروف تھی اور یہاں تک کیسے پہنچی۔ شدید

چوڑ کا درد اسے میں ابھرا۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے ہاتھ چھو کر جیسے یاد کرنے کی کوشش کی۔

”اوہ او کڑ جھٹکے کچھ یاد نہیں آرہا۔ رت ہوئی کوئی غلام بھی نہیں دیکھی۔“

اس نے حیرت سے اس اجنبی شخص کی طرف دیکھا۔ وہ کتنے سکون سے اس کے ساتھ مذاق کر رہا تھا۔

جیسے وہ اس کو برسوں سے جانتا ہو اور یہ بھی سمجھتا ہو کہ وہ کس مذاق پر پس دے گی یا کس مذاق پر امان لے

گی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دھکا سر تھا کہ کچھ منٹوں پر روک لیا۔

”تم کوئی غور ہو شایدا رخص ہو۔ اور کتنی بے تکلفی اس جنگل میں آئی ہو۔“

(یہ تو شاید وہ جھپک ہی کہہ رہا تھا وہاں اگلے دو اپنے غور کی تلاش میں جھپک رہی تھی۔)

”اور تمہارے سر میں بھی دوسرے کھمو میں تمہارے لیے کافی بنا کر لایا ہوں۔ تاکہ تمہارے حواس

ٹھکانے لگیں۔“

”کیسی جنت ہے جہاں دودھ اور شہر کے بجائے کافی ملتی ہے۔“

”ہاں۔“ وہ دواڑے تک واپس جاتا جاتا ہے ساختگی میں ایڑیوں پر بیٹ گیا۔

”کڑی سڑ جو شخص اتنی تکلف اور بداحواسی میں بھی حس مزاج نہیں نہایت کرتا۔ اس سے میری

دوستی ہو سکتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے ہماری آپ کی بہت بلی دوستی ہو جائے گی۔ ٹھہرو! ابھی ہم ایک کپ بکلی

پر کچھ مذاکرات کرتے ہیں۔“

وہ لحوں میں پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے بھی متقی تھی۔ اس میں رکھے کب بھی نام گاؤں سے مختلف

تھے اور شہری کافی سے بھاپ دیتی خوشبو بھی لذت آمیز تھی۔ اس نے ایک گھونٹ پیرا اور جیسے دماغ کی

رگوں سے جسم کے ذرے ذرے تک تھکان اتر جانے والی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس وقت واقعی اس کو

چاہے یا کافی کی شدید ضرورت تھی۔ وہ اپنا پورا کمر ٹھہراتے کئے گھونٹ گھونٹ خالی کر لی اور اس کی حلاوت

کامزوں کی رہی۔ وہ جھپکی جھپکی، ”مٹی اور پیاز آدمی اپنی اپنی ترقی زبان کو بمشکل لکام دے اس کے کب کے

خاستے کا انتظار کرتا رہا۔“

”جھنی اچھی تھی۔“ اس نے ہاتھ پر دھا کر کے ٹہرے میں رکھائی تھا کہ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ

شرمندہ سی ہو گئی۔

اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔ ورنہ پوچھنے سے پہلے یہ بات تو اسے خود کو کہنی چاہیے تھی۔ وہ تو پھر کھٹ پر

شزاوہوں کی طرح بیٹھی اپنی خدمت کے مزے لوٹ رہی تھی۔ خصوصاً ہی کام کے لیے پیرا کی تھی۔

”شکر ہے۔“ اس نے خفیف ساہو کر کہا۔ ”بہت اچھی تھی۔“

”اور کوئی؟“

”نہیں شکر ہے۔“

”کلفت نہیں۔“

”نہیں کوئی کلفت نہیں۔“ اس نے خال سے کہا۔

”شکر ہے خدایا۔ اگر تم کلفت کوئی تو مجھے کلفت ہوگی۔“ وہ بڑی دیر سے کھڑا تھا اس نے کہنے سے

گواہی اس طرف اور اس طرف سے چل چکی ہوں گی۔
 ”مگر تم کھانے تک روکو تو میں تمہیں بہت شائد ار کھانا کھلاؤں گا۔ اپنے ہاتھ کاٹنا۔ میں بہت کمال کا آدمی ہوں۔“
 ”مجھے یقین ہے۔“ اس نے سلاخوں کے پیچھے دو دو رو تک پہاڑی کے دامن میں پھیلے کھیتوں کے اس طرف خیالی اور یادام کے باغوں کی طرف دیکھا۔ آپ بہت کمال کے آدمی ہیں۔ لیکن میری تھوڑی بہت یادداشتیں ابلیس آگئی ہے۔ اور جو مجھے یاد آیا وہ بہت خطرناک ہے۔“
 ”بلالہ۔ زروہ۔ سر۔ ٹرکے چال۔ طری۔ جو کچھ کہو۔“
 ”دھار۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے خوشی سے کہا۔ ”اس کا مطلب دوبارہ آؤ گی۔“
 ”معلوم۔“ اس نے بے خیالی میں کھیتوں سے پرے دیکھتے کہا۔ ”یہ وہی جگہ تو نہیں جہاں کہیں چھپتے بھی رہتے ہیں؟“
 ”تم سے کس نے کہا؟“
 ”قیمت خان نے۔“

”تب تو تمہاری معلومات بہت قیمتی ہیں لو کی۔“
 ”جانتے ہیں یہ جگہ محل سے کتنی دور ہے۔“
 ”یہاں سے تیرے گلو میں ہے لیکن ایک خفیہ راستہ بھی ہے جو صرف میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔“
 ”وہ پھر خوشی سے ہنس دی۔“ برا سرا ہو گی۔“
 ”صرف مجھے کاراز۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں یہ دیکھو یہ سانسے پہاڑ کے دامن میں۔ ایک چھوٹا سا غار ہے جو میرا محل میں قیمت خان کے گھر کی طرف کھلے گا۔ آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اس میں تو تیرے گلو میں ملے لگتے ہیں یہ اس راستے سے تیرے منسلک ہے۔“

”کھا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔
 ”لیکن اتنی رازداروں کی ضرورت کی کیا ہے؟“
 ”ضرورت ہے نا۔“

”کیا ضرورت؟“ اس نے مضحکہ لہجے میں پوچھا۔
 ”تم بہت جلدی ہو۔“ اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔ ”میں یہاں نیوی ہوں قیمت خان کا اور قیمت خان بھی اچانک میرے پاس آتا ہے۔“

”کتنی دیر حیرت اس کے چہرے سے جگہ جگہ برقی رہتی۔“
 ”وہ عجائبات اور طلسمات کی عجیب دنیا میں نکل آئی تھی۔ ہر لمحہ ایک نیا حادثہ مینا واقعہ اس کو جو نکلتے رہتے تھے اور یہ وہاں جو محاورے کے معانی فرماؤں سے زیادہ عکس کی باتیں کرتا تھا کیا اس کی کو اس کو شخص ایک بڑے عجیب اعتبار لے آئے وہ تو بات کر کے فکر ہو گیا تھا۔“
 ”قدی۔ قیمت خان کا۔“ اس نے اس کے اہوں سے لیا ہوا تھا۔
 ”کیا کوئی نہیں کہی اور جانتا ہے کہ ایک آدمی میں تیرے ہے؟“

کری اٹھائی اور اس کے ہلکے کے نزدیک ٹھہرت کر بیٹھ رہا۔
 ”ہاں تو اب جانتے ہو ڈاکٹر۔“ مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔ کیا فلموں میں اب بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔“
 ”وہ سائنس کی شے نہیں بڑی۔“
 ”تمہاری اپنی بہت دلکش ہے۔ اور دیکھو میری کسی بات کا برامت منان میں جنگلی سا آدمی ہوں اور سچ کہتوں سچ کے سوا کچھ نہیں۔ چاہے بات اچھی ہو یا بُخ۔ میں تو سیدھے اور براہ راست الفاظ لیا کرتا ہوں۔“

اس نے بہت تھوڑی سی دیر میں اس کے آثارات سے بہت کچھ جان لیا تھا۔
 ”دیکھو یہاں میرے ارد گرد ایک فرضی سی دنیا ہے لیکن وہ دنیا جنت ہے کیونکہ یہاں کی سب سے بڑی حقیقت سچائی ہے۔“
 ”میں نے آپ کو پہچان لیا۔“ وہ ستر تھوڑی سی سیدھی ہو کر بیٹھی۔
 ”آپ خلیل جبران ہیں۔“
 ”آپ کا کیا نام ہے؟“

”خلیل جبران۔“ انہی نے خور تو لیا ہے چلو اب اپنا نام بتاؤ۔“
 ”میرا نام۔“ وہ ہلکا ہلکا۔ ”میں خیر جو بھی ہو گا۔ آپ میرا نام لیں ہی نہ۔ آپ۔۔۔“
 ”یہ ٹھیک ہے خور از تھی۔ میں خود ہی تمہارا نام رکھ دیتا ہوں۔“
 ”وہ چپ سے ہو گئی۔“ اس کا مطلب ہے آپ خلیل جبران کو جانتے ہیں۔ یہ یہاں اس بستی میں عجیب دستور ہے ایک تو میں نے نام ڈالنے کا رواج ہے دوسرے یہاں عموماً ”نام فاضل لوگ جاہل فخر آتے ہیں اور جاہل لوگ قابلیت کے زعم میں بڑے خود گمان ہوتے ہیں۔“
 ”تو تم اس بستی کی نہیں ہو۔ میں بھی جبران تھا اس بستی میں یہ خوشگوار ہوا کا جھونکا۔ تم کئی کہاں سے تھیں؟“

”ملا۔ دور سے۔“ اس نے استغنی سے کہا۔
 ”ملا دور سے گھوڑی پر دوڑتی۔ نا ممکن۔“ اس نے معنوی حیرت سے آنکھیں چڑھائیں۔ اسے اس کے جنگلی چہرے پر یہ شائستہ سی شرارت بہت بھی لگی۔ کم از کم وہ شمنوں میں سے تو نہیں لگتا تھا۔
 ”میں دراصل سردار وانیال خان کے محل میں ملازم ہوں۔“
 ”آؤ۔ تب تو سردار وانیال خان بڑے حسن نواز آدمی ہوئے۔ کیا ملازم ہووہاں؟“
 ”ملازمت تو ملازمت ہوئی ہے۔ بس کیا اور کہاں نہیں ہوتی؟“

”ارے غلط لو کی۔ شکر کہ ملازمت ہو قیدی نہیں ہو۔ قید ہونا ملازم ہونے سے بدتر ہے۔“
 ”وہ چپ ہو گئی۔ یہ پائل آدمی عجیب عجیب منہ لکھتی تھی جہاڑ آ رہے اور بے تکلفی سے دوسروں کو بے خوف بناتا ہے حالانکہ انہی انہی درجہ ہونے کا سخت دعویٰ کرتا تھا۔ اس کے سر کی لہجہ بھی ٹھیک ہوئی تھی اور آنکھوں کے سامنے ناخن والے مارے بھی کہیں ڈوب گئے تھے اس نے ہلکے سے پاؤں اتار کر کھٹن پر رکھا تو اس کے قدم لوکھڑائے تھیں۔“
 ”پری نے تو اب تک اس کی گھڑی پر محل میں دہائی ڈال دی ہوں۔ اور معلوم نہیں اب تک کتنی

”لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ اس گھر میں ایک چیتا ہے خطرناک اور خوراک۔ جو دشمنوں کو چیر بھاڑ کر کھا جاتا ہے۔ بلکہ تمہیں چاہیے کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ دشمنوں میں خوراک ہی نہیں کر سکتا۔“

”اوہ۔“ وہ دیر تک خاموشی کے غلبہ میں گھری رہی۔

”تو وہ جتنے آپ ہیں۔ اور اعلیٰ جیتے؟“

”اعلیٰ جیتے۔ میں یہی ہوں۔“

”لیکن آپ تو خطرناک نہیں لگتے۔“ اس کے بچوں ایسے معصوم لہجہ پر ہنس دیا۔

”مجھے گھر میں قید چیتا خطرناک بھی ہو لڑکی تو کسی کو کیا نقصان پہنچائے گا۔ سوائے اس کے کہ اپنے بچوں کو سلاخوں پر بار بار گرز دیتی کر لے۔ تم مجھے سے ڈرو نہیں سکتے۔“

”وہ ڈرنے کے بجائے چپ ہو گئی۔ اسے اس مظلوم سے آدمی پر ترس آنے لگا تھا۔

”گھر میں رہنے والے لوگ اس بات سے آگاہ ہیں کہ آپ۔“

”خشش۔ خشش۔ کسی سے اس بات کا ذکر بھی نہیں کرنا دیکھو۔“ اس کی دیر لگی سے سوچتی آنکھیں کھیں اور جی ہوئی تھیں۔

”ایک رات بعد ایک ایسے شخص کو دیکھا ہے جس کو کوئی کرل خوش ہو گیا ہے اور میں تمہیں گنوا رہی نہیں چاہتا۔ کسی سے مت کہنا مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ سوائے ایک نقصان کے۔“

”نقصان؟“ اس نے پھر سادگی سے سوال دہرایا۔

”ہاں نقصان۔ موت بڑا نقصان۔ تمہیں گھوڑے کا نقصان۔ پس نا۔ کاروبار میں یہ کتاب بڑا گھانا ہے۔“

”آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟“

”گھسانے کے میں دیکھ رہا ہوں اور ذہنی طور پر تیار ہو رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہاں بھی میرا نقصان ہو گا۔“

”آپ کو اس قید خانے میں نقصان کون پہنچاتا ہے؟ یہ قیمت خان؟ میں سوار کو تاروں کی یہ ضرورت کی لا عملی میں ہو رہا ہے۔ وہ اس قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ وہ اگر نہیں گئے۔“

”وہ جوش بیان میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مخالف اس کی بات پر دھیان دیتے تھا اور اس کا شفقت سے بدلتا رنگ جیسے نقابوں سے پردے اٹھا رہا تھا۔

”اے ناو حیان رکھنا چھٹی لڑکی۔ تم بھڑکی طرح معصوم ہو اور دنیا میں جیتے جیسے اور بہت درد مندے ہیں۔ میں تمہارا ضرور اظہار کر دوں گا۔ تمہارے آجائے سے تھوڑی دیر کے لیے تو یہ قید خانہ بھی بیگمنا اٹھا تھا۔“

”وہ ابھی پہاڑی سے بہت اوپر بھی نہیں پہنچی تھی کہ اسے گھوڑا لے ہوئے پری مل گئی۔

”آپ کہاں جا رہی تھیں؟“ اس نے تشویش سے کہا۔ ”میں اتنی پریشان تھی لیکن مجھے نہیں سکی کسی سے کہوں یا۔ گھوڑی خالی واپس گئی اور تھان پر بیٹھنے پر آمادہ ہوئی۔“

”کسی کو یہ نہیں چلا ہے۔ اچھا، وہاں۔“

”جہ نہیں کیوں مجھے لگا تھا آپ تھکے ہیں۔ میرا دل کہتا تھا۔ لیکن اب آپ تھوڑی دیر اور میں آتیں تو میں ضرور سوار عمل میں کسی سے کہہ دیتی۔ آپ کہاں تھیں؟“

”اس نے لپٹ کر دیکھا۔ وہ اچھے اچھے لیے ہاتھوں میں گھرا شخص تھوڑی دیر پہلے پلٹ کر دیکھنے پر نظر آ رہا

قیاب کہیں غائب تھا۔

”یہاں ایک دیوانہ بھی رہتا ہے۔ مجھے فکر تھی کہیں وہ آپ کو پکڑ نہ لے۔“

”اس نے غور سے پری کو دیکھا۔ کیا اس سے پہلے کسی کو پکڑا ہے؟“

”ہاں کوئی جانتا ہی نہیں۔ جی تو ہاں چیتے کی تو ہیں اور وہ مجبور ہے۔ وہ بددعا سے کمر باری دینا کر پتہ تک سکتا ہے۔ سب اس سے ڈرتے ہیں۔“

”تم ایسے باتوں کو مانتے ہو؟“

”مانتی تو نہیں۔“ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”لیکن ڈرتی تو ہوں۔“

”مجبور ہے سے ڈرتی ہو؟“

”نہیں بابا۔ اس نے صداقت سے بچ بولا۔“ اگر انہوں نے سن لیا ہم میں سے کوئی بھی وہاں گیا تھا تو وہ ہمیں اڑا دیں گے۔“

”لیکن کوئی کہنے نے گا۔ جب تک ہم دونوں میں سے کوئی زبان نہ کھولے۔ اور ہم دونوں نہیں کھولیں گے۔“ وہ کمال کی بناؤا رہی تھی۔ اس کے لیے کسی وعدہ الہی کے الفاظ کی ضرورت بھی نہ تھی۔

”اور یہ شاید اتفاق کی تھی کہ ایک حصہ تھا جب وہ محل میں بیٹھی تو کسی کو کانوں کان اس جاوے کی خبر نہیں ہو سکی۔ وہاں دونوں اتنی مصروف تھی اور گہرے اتنی اتنی دیر تک کے لیے باہر رہنے لگی تھی کہ کسی کو اس کی اپنی بات سے اتنی دیر کی گنجائی پر شبہ نہیں ہوا۔ وہ بے کے پاس آکر بیٹھی تو انہوں نے اس کے کونے کونے پر ہن کو محسوس بھی نہیں کیا۔ وہاں غم اپنے آپ کو جھکاتے رہنے کی جاوی ہو گئی تھی۔

”سے دیر تک اسکول میں رہا تھا۔ پھر غور قریب کی طرف نکل جاتی۔ وہیں کہیں جہاں بھوک لگی پھر کھانا کھانے کے کھینچ کر کھانا کھانے کی شام کو بچوں کو سکھانے پر دھانے بیٹھ جاتی۔

”آپ نے چاہے لی لی ہے۔“

”کتنی مدت بعد اس نے اتنی اپنا بیت سے فرمائش کی تھی۔ بے نے ان سلاخیوں میں ہر دھڑکے اور ان کے علم میں بھی نہیں تھا کہ اتنی محبت سے وہ اس کے بچائے جال میں پھنس چکی تھیں۔

”بے کے کجاں۔ تمہارے ساتھ اور بی بیوں کی۔“

”وہ جلدی جلدی چائے گرم اور اچھی لائے کے لیے مریم کو سمجھا رہی تھیں۔ وہ گردن نہ ہونے سوچتی رہ گئی۔ ہم معصوم لوگوں کو کتنی بددعا سے دھوکا دے ڈالتے ہیں۔ یہ اس گڑھی کی دوا بہت ہے شاید کہ ہر ظالم ظالم کے ساتھ دھوکا دہی کی واردات ضرور کرتا ہے۔ وہ بھی شاید گڑھی کا حصہ بن کر انہی روایات کا شکار ہو رہی تھی۔

”بے کے پاس چوکی پر کبھی بیٹھ لائی کہیں تھی۔ وہ اب اس سے بھی عروسی کا شکار ہو چکی تھیں۔ آج وہ کتنی مدت بعد ان کے پاس آئی۔ گہرے چار سے بیٹھی تھی۔ اور اپنے من سے چائے کو پوچھا تھا۔ واقعی ہر میں بیٹھی کہے اتنی شوق خانوں سے اتنی مدت کے لیے دور دور ہو گئی تھی۔

”چائے کی قطعی خواہش نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنا بال بپرا کشمیری قہوے کا لیا۔ گہرے گھونٹ پینا شروع کر دیا۔ وہ آئی تھی اور ان کی چیخوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اخلاق بھانے میں بے کے کا بھی ثانی نہ تھا۔

سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں شل ہو کر بند ہو جاتیں لیکن ان رازوں کا کوئی بھی سرا اس کے ہاتھ نہ آتا وہ خاموشی سے فیست خان کا تاج زیب کرتی رہتی ہے۔

جیسے ایک زمانے میں وہ خود بلا کے پیچھے تندو تیز لکڑیوں میں غرائق لیکن پھر اس نے بلا کو بے ضرر سمجھ کر قاتل احمد سمجھ کر چھوڑا تھا۔

نیمت خان دن میں ایک مرتبہ چیتوں کے مکان کی طرف ضرور جاتا تھا اور کوئی روک ٹوک بھی نہیں کرنے والا تھا کہ کوئی کڑی میں اس کا شہر چیتوں کے شہر کی حیثیت سے بھی انتہائی مسلم تھا جتنا کہ اسی کے نیک خوار کی حیثیت سے گویا پہلے واقع کی طرف حرمہ مراجعت بھی قابل اعتناء نہیں۔

باقی کا بیشتر وقت وہ گھوڑوں کے قریب میں گزارتا۔ اسے گھوڑوں سے شدید پیار تھا۔ وہ ایک ایک گھوڑے کو علیحدہ علیحدہ بہت وقت دیتا۔ کبھی دیتا ان سے باتیں کرتا جاتا۔ جیسے وہ ان سے اپنی غیر موجودگی کی خبریں سہمہ کرتا، لیکن چونکہ وہ بہت روائی ہے بشمول تھوڑا سا لڑائی اس کا پورا سمجھ میں نہ آتا۔ پھر وہ ٹال پر چڑھا جاتا۔ جمال پر اس کی موجودگی بہت ضروری اور اہم تھی۔ سی آئی ڈی کا انتظام مجسٹکٹ اور کڑی کی مشائی کا سارا کام اس کی عمرانی میں ہوتا۔

یہ وقت سب سے محفوظ تھا۔ کیونکہ وہ جب جنگلات کی طرف جاتا تو یہاں سمجھنے بڑھ کر تھا۔ اور معلوم نہیں وہ انبال خان کو کھل کہاں دھوکا نہیں دے رہا تھا۔ دانیال خان خواجہ بھی۔ لیکن بیشیٹ سرور سے دھوکا نہیں دینا چاہیے۔ بے غدار ہوں گا۔ اور غداروں سے کسی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

اس کے پاس اس مسئلے کے حل کا صرف آخری تیرہ چاقوا۔
اگر یہ تیرہ ہی ناکارہ رہ گیا تو وہ نئی دست و بوجلے کی اور نرسا آوی کتابے بس کتابے چارہ سال لگتا ہے
لیکن اس کا کوئی اور علاج بھی نہیں تھا۔

اس نے جب دانیال خان کی اسٹریٹ میں قدم رکھا اس وقت بھی اس کے علم میں تھا کہ جینے کے گھر میں وہ اس وقت داخل ہو رہی تھی۔ ذاتی طور پر وہ اس کی ہر ہاؤس پر سر چہرہ کی یاد ہر کسی کی تصحیک سے نہ ہو نہ ہونے کی تیاری کر کے چل سکتی لیکن اسٹریٹ میں قفلوں میں غریب کھپ کی یاد دہانی میں ان کو بے پناہ صوفیہ دیکھ کر اس کے سارے ہتھیار ہاتھ سے ایک ایک کر کے چھوٹ گئے۔

الحمد بحسب اس نے سوچا، وہ واپس لوٹ جائے لیکن ذاتی کے ارادے کا وہ لمحہ بھی جیکے سے گزر گیا۔

دانیال خان نے چمن فاکلر پر ہر روز کیا تھا۔ گواہوں نے دیکھا کہ وہ نہیں کیا تھا۔ اور بھنوس اٹھائے منتظر تھے کہ وہ بات کرے۔ تو ان کا نام دوبارہ شروع کر دیا۔ لیکن کہنے کو اوار کرنے کو اس کیس بجای کیا تھا۔ جس کے چپکے سے یہاں تک لے گا۔ تاں ابھی اب خام ہی تھا۔ ان کی مستقل بھی سوائے انظرین اس پر مبنی تھیں۔ اور اس کو ان سے اب کچھ نہ کہہ کر ہی بچھا چکا تھا۔

وہ حالت سے دورانے میں کھڑی اپنا ٹھکانہ انتظامی کی کیفیت میں منتقل میں دیاری تھی اور وہ
نئے تجربہ پہچانی اندازہ صرف اس وقت اختیار کرتی ہے جب وہ کسی نئی الجھن میں مبتلا ہو۔ وہ یہ بھی
نئے تجربے انہوں اس نے خود کو کیسی کیسی الٹی سیدھی مشکلات میں پھنسا رکھا تھا۔ انہوں نے فائل
بہ طرف کھینچ کر پڑی تھی اس کی طرف دھچک۔

167

”تم سب کو لگ رہی ہو۔ میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے اتنی جان مت مارو۔“
”جیسے اچھا لگتا ہے بے برابر آپ کو برا تو نہیں لگتا۔“

”ہر اتو خیز نہیں لگتا ہے تمہاری محبت ہے بلا۔ لیکن۔۔۔“ وہ ہنسی مچائی گئیں۔
 ”مجھے معلوم ہے تم دونوں ہی بہت شہد ہی ہو۔ تم میں سے کوئی بھی میری بات کو مستحید کی سے نہیں لیتا۔
 لیکن بہت سی لوگ نہیں، اس نیکی کے صلے میں کوئی بھی مجھی بھی۔۔۔“ وہ ہر شکیں کی کوئی بات منہ سے
 نکالتے نکالتے چپ ہو گئیں۔

”تو کون ہو؟“
 ”تم بھی اور انا بھی۔ اگر ذرا بھی عقل استعمال کرو۔ اگر ذرا بھی۔“ وہ جیسے خوف کے صحرا میں دوڑتے دوڑتے خواب سے بیدار ہو گئیں۔ انہوں نے اون سلاخیل ہو بارہ اٹھائیں۔
 ”تم سارا کام کیسے جا رہا ہے؟“

”کام بہت اچھا جا رہا ہے بے بی۔ میں صدی نہیں ہوں۔ میری خواہش ہے جب تک میں یہاں ہوں
تو مجھ سے ایک قائد پیدا ہو، یا...“
”جب تک تم یہاں رہو گا اسٹاکس کم کم جا رہی ہو؟“

”میرا مطلب ہے جب بھی میں جاؤں گی۔ آخر ایک دن تو مجھے جانا ہے بے بے“

”جو تمہارا بچہ چاہے کہو۔ میں تو اس لیے کہتی ہوں کہ کہیں۔ دیکھو جو جوئے کا منہ دگر ہے یہ تا ابوال
چیتے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو اور بچوں کو اس علاقے سے دور رکھنا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں خوبانی کے ابوال
سے اس طرف جوئی چاہے کہو لیکن۔ اوہاں لو اپس جانے کی بات کہ تو میں ایک لنگو کی۔“
بے نے کی بھر لی اس آواز نے اس کی آنکھیں بھیسوئیں۔

اگر بے بہت ہو تیں تو شاید زندہ نہ ماردوار ہو جاتا۔
 ”ٹھیک ہے۔ بے بہت آپ جو کہیں گی اور جس طرح کہیں گی۔ میں ہمیشہ آپ کی بات مانوں گی۔ صرف
 آپ مجھے یاد دلاتی رہا کریں۔“ چنانچہ میں نے رشتہ باندھ لیا۔ چیتے کے راز میں اس بستی کا دور
 کون کون آدمی شریک ہے۔ اور کوئی نہیں تو کم از کم خانہ کل کو اس واقعے سے ضرور آگاہی ہوتی۔ اور اگر وہ
 ذرا بھی آگاہ ہوتا تو سادی خصلت کا مضمون آدمی اس کو ضرور شریک راز کر لیتا۔
 وہ رات کو دیر تک بستر پر لیٹ چھت بکتی رہی۔

گو اس وقت وہ اس سے ناراض اور کوسوں دور تھا۔ وہ اس کو بلا کر اس مہم میں شریک کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس کے حق میں نہ رہتے۔ وہ تھوڑی بہت واقف ہوئی تھی کہ وہ اس سے کیوں ناراض ہوا تھا اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے کہیں اس سے اسے اتنے دور جا کر رہنے لگا تھا۔

بے گھر کبھی کسی نے اصرار نہیں کیا۔ دہرہ وہ پتہ دل کے ذکر پر اس طرح سے لرز جاتیں۔

رہے، انیل خان۔
اور کون جانے جو یہ سارا جہل اور اس کے سامنے پائے ان کی قات کے ارد گرد الجھ رہے ہوں اور کیا
معلوم قیامت خان برفواری اور محبت کے قریب میرا پرپر ونداری اکامر تلب ہو۔

”یہ وہ بات نہیں ہے۔ کچھ اور ہے۔“ اس نے اپنی عجیبی کو کھانے نہیں دیا۔ ”لیکن آپ فی الحال میری بات پر اعتبار نہیں کریں گے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے ہو گا۔ پھر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور مان لیں گے۔ بالی او اے۔ جو چار پانچ الزام آپ نے مجھ پر لگائے ہیں ان میں سے کسی میں بھی میرا قصور نہیں۔ اسکول ماسٹر تو واپس آیا ہی نہیں۔ ہے۔ ہے۔ مجھ سے خفا ہو ہی نہیں سکتے۔ خانہ مالک کی جاؤ فنی سے میرا کیا مطلب اور قیمت خانہ نے تو خود میرے غصے کو ہوا دی ہے۔“

وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

”کیا خان اکل کے یہاں سے چلے جائے میں واقعی تمہارا کوئی دخل نہیں رہا۔ لیکن ہر صورت وہ تم سے ناراض تو تھا اور جو محنت خاں نے تو تمہارے غصے سے ڈر کر اپنی بیٹی کی شادی کافی صلہ بدل ہی دیا ہے۔“
وہ گاہک بڑھ کر۔

یقیناً یہ فیصلہ دانیال خان کی بد اخلاقت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ ان کا ہر روپ اس کو حیران کر دینے کے لیے لکھنؤ، مہران، آفاقہ، شفی القاب، بھائی، تھے فرماں بردار اولاد تھے۔ سخت معزنا تھیں تھیں۔ لیکن ان سب سے ادا ایک مرتا ہیچ دوست تھے۔

لیکن ان میں سے ان کا اصلی روپ کون سا تھا۔ شاید اس کو بھی پتا چل سکے۔
وہ اپنا ایک کئی بات پر خوش ہو گئے تھے اس کو یہ خبر ہوئے بیانات میں سے جانے کون سا ٹھیک ان
کے اندر جا کر نہیں ہوا تھا۔ چل ایسی بے ساختہ تھی۔ وہ اس سے جلد قدم روہ گئے۔

”آپ زندگی میں پہلی مرتبہ از خود میرے کمرے میں تشریف لائی ہیں۔ فرمائیے آپ کی خاطر کیسے کیا جائے؟“ دو سکون سے مہمان داری کے اصولی نبھانے لگے۔ اس کاغذ ہانکا سامن میں بوجھ گیا۔ وہ کچھ بہت جیسے غراٹم کے ساتھ تو آئی نہیں تھی۔

”بہت بہت شکریہ۔ لیکن میں چائے پینا نہیں چاہتی۔“ اس نے راجی کے ارادے پر قدم اٹھائے۔

اسے کہ ان کی تیر توارے اس کو چپ ساکن کر دیا۔
 "مفسر چاہے آپ جو بات کرنے کی ہیں، دیکھ کر کہیں نہیں جائیں گی۔ شغل بجائیے اور اس کری پر
 غور فرما دیکھیے۔" کوٹھوں کی دھکی اورچی اگس کے شغل اس کی حدت سے دیکھنے دھسا دل پر جھلکنے

وہ پہچاننا نہ ہوئے معمول کی طرح جان کی پیشکش کر دے پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔
وہ بھڑک اُڑا اور لوہے کی تختی کے منہ میں دھنکے اس بھٹ میں کراہا اور گری تھی کہ وہ

وہ حکم منوانے کے عادی تھے اور بات منوانے کے بعد ان کے چہرے پر کوئی قاتحانہ رنگ بھی نہ آتا تھا۔

وہ ان کے احکامات کی پابندی کی خاطر ہی نہیں بلکہ جاننا چاہتا تھا کہ ستم توڑنے کے لیے اپنے آپ کو ان کے ایک اور ٹارگٹ کے طور پر پیش کرے۔

”آخر آپ یہ تک بہت سی لکھی رہیں گی۔ مجھے کوئی کام ہے۔“ وہ جواب نہیں دے سکی لیکن وہ دم اٹھا کر کمرے کے اندر آئے کی بہت کڑی چٹائی۔

”یقیناً“ اس کی بڑی بات ہوئی۔ فرمایا۔ ”ان کے چہرے کی کچھیریں کاساتھ ان کی آنکھوں کا تاثر نہیں دے رہا رہتا۔ وہ جانتی تھی وہ کچھ بھی کر لے اس کا راز اٹھا لیا جائے گا ابھی تک اس کے کسی عزم کسی ارادے کے کسی بھی کام کو کسی نے زرا سی بھی اہمیت نہیں دی تھی کسی نے اس کو سچیدگی سے نہیں لیا تھا اور دانیل خانہ مستقل اس کا پیٹھ پیڑی بناتا رہے ہیں۔“

وہ ان کے بھٹے کے دوواڑے پر روانہ ہوئی۔ ایک سے دو چار چھ رہی تھیں۔ وہ اس حصے کے پاس فریاد لے کر آئی تھیں جس کے لئے اس چمے میں عیوب و عجز بہ قسم کی نفرت تھی۔ وہ نفرت جو کسی بھی ایسے مغرب اور قرونِ صفت آدمی کو دیکھ کر پیش کسی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جو لوگوں کی تقدیروں سے کھینچا ہو اور اختیار ہوئے کی وجہ سے ان کی زندگیوں کے بارے میں بہرحال فیصلے کرنا ہوا ہو۔ وہ بھی ایسے سب سے رحمانہ فیصلوں کے نتیجے میں بنیں۔ یہ اس میں ہر قسم کی شک و شبہ نہ ہو۔ وہ وہی ہے ان کے منہ پر کھڑے ہو کر کہتا جا رہی تھی۔

لیکن یہ ایسا ہیال خان تھے جنہوں نے اس کو شہرِ بیدار بخشوں میں چلا کر کے کرکری چھوڑ دی تھی اور اس سے چھوڑ دے فاصلے پر اس کے زہر و کڑھ سے اس کے اہل خانہ کے شہر تھے۔

میں وہ بھی کو ان سے ہے سے مجاز ہی کہ۔ یہ ہے، ہے قربت ہے واپس جان۔ ان کی حیرت و غرت کہ
شاید وہ نہیں، بھی کسی نے کی اور ہے۔ لیکن قربت میں ان کی ہے چار کی کو نہیں، ہو کر ہے۔
اور شاید وہ ان سے واقعی اتنی قربت کرتی تو میں ان کو پہنانے کے لیے بار بار سامنے ٹوٹ کر کھڑی ہوں۔

”بیٹے جاؤ۔“ انہوں نے دونوں باقیوں کی تعظیم اس کے ذریعے ہوئے کہ لڑتے کمزوروں کے جھک کر نکلیں۔ ”اور آرام سے سو سب کچھ کرنا جو کہنے آئی ہو۔ میں تمہارا باقیوں نقصان اٹھانے کا

اس نے کمرے کی خفیہ سی جھڑ سے ان کے ہاتھ جھپٹنے کی کوشش کی۔

دو اس کے جنگ کر گئے ہاتھ سے دو مرنے لکڑے پر کر کے ہاتھ کی انگلیوں پر الزابت کی غمِ رست
 مکن کرمانا لک

وہ ان کے بہرے سے بھٹائی اور ہندوستان میں رہ کر ان کی اور وہ دوا ہوئے
ایک جنگل سے دانیال خان نے ہاتھ کھینچ لیا۔

والے تھے کو اپنے اوپر طاری نہ کروں گا۔ تمہارے خلوص پر کسی کو شبہ نہیں۔ لیکن...

کرتے۔
 ”میں جرات کرنے آئی ہوں۔ بھول گئی ہوں۔“ اس نے احمقانہ لہجہ والی سے آگ کی طرف دیکھتے اپنا رخ بدلا۔ اور اس طرح خود کو ان فتنوں سے محفوظ کرتے تھی۔ جو آگ سے گرم اور بارش کی پھوار سے نرم تھیں۔
 ”میں یاد کرادوں گا۔“ انہوں نے چراغ کے جن کی طرح حاضر ہونے والے شخص کو پشت میں شام کی چائے کی پالیات دیں۔
 ”مہم بہنے کو بھی بلا لیں۔“ اس نے اپنی بڑی کوپڑوں میں چھپایا۔
 ”میرا مطلب۔۔۔ اس نے ان کے امیو اٹھا کر گھورنے پر وضاحت کی۔ ”مگر چائے میں کوئی خاص اہتمام ہے۔“
 ”اب آپ فرمائیے کہ قیمت خان کے بارے میں کیا کہہ کر بھول جانا چاہتی ہیں۔“
 اس نے تھوک مطلق سے نگلا۔ ”فدہ بری ہی کے سلسلے میں۔ اب اگر اس نے۔ انہوں نے۔ وہ اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کا مزہ لیتے رہے جیسے ان کے سامنے اسکرین پر کوئی نہایت دلچسپ منظر دکھایا جا رہا ہو۔
 ”بات یہ ہے بی بی۔ وہ جھوٹ بولنے والے لوگ اور ہی ہوتے ہیں۔ جب وہ بولتے ہیں تو ان کی زبان نہیں لڑھکتی۔ رنگ زرد نہیں پڑتا اور اس طرح وہ پکڑے نہیں جاتے۔ تم سن۔ مجھ سے رکھو اور سچ بولو۔“
 کیا واقعی وہ مجھ سے کر لے اور سچ بولے۔
 وہ آخر کیا سوچ کر یہاں تک آئی تھی۔ کیا جیتے کے مکان میں اس آدمی نے اس کی ذات پر اتنا بڑا اعتماد اس لیے کیا تھا کہ وہ پرچہ اڑا کر اسے کسی انت میں بٹھا کر دے۔ یا اس کا راز رکھ لے اور دانیال خان کو کسی مصیبت میں پھنسا ڈالے۔
 ”جلد بازی کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب بھی تمہیں میرا اعتبار آجائے۔ اطمینان سے سوچ لو اور جاؤ۔“ انہوں نے گفتار میں ایسا اس کے چہرے سے مسائل سلجھانے کے لیے اور وقت دیا تھا۔
 وہ سوچ تو نہیں رہی تھی لیکن چپ چاپ ہو گئی تھی۔ دانیال خان نے اسی وقت میں لوہے کی سلاخ سے انگاروں کو کپڑ کر آگ تیز کی۔ اس کی پشت کو بہت سارے کٹھن سے سہارا دیا۔ چھوٹا سا پیروں پر ڈالنے والا کھیل اس کے نوالے کر کے وہ اس کے لیے چاہتے بناتے گئے۔
 یہ عجیب بات ہے۔ وہ یہاں خدمت کی غرض سے بلائی گئی تھی۔ اور وہ موقع محل سے اس کو جتنا بھی کبھی کبھی بھولتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اس کی خدمت اور خاطر و رات اس کو ان ہی کی طرف سے ملتی تھی۔
 یہاں میں چھپ جا کر انہوں نے بڑی عزت سے اس کے سامنے ایک غلی پتائی پر رکھی۔ پھر جیسے ڈور لٹائی سا وقفہ بھی ختم ہو گیا۔
 ”جواب۔“ وہ اس کے نزدیک زمین پر پڑے کٹھن پر آرام دہ حالت میں بیٹھے ہوئے۔ ”فرمائیے۔“
 ایزی نیز بہت سارے کٹھنوں کے سہارے کھیل کھیلوں پر ڈالے سکون سے بیٹھی تھی۔

اسے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ اس کے قدموں کے بہت نزدیک تھے لیکن بے دھیانی میں یا شاید آرام کی غرض سے وہ اپنی کسی بھی پسندیدہ جگہ پر جا بیٹھے تھے۔ یوں جیسے کوئی بہت خائے کاٹنے والا دیوی کے چہرے میں۔
 وہ آہستہ سے کھسک کر نچاڑ آئی۔
 ”کو اس طرح محنت سے اترنے میں ان کے درمیان کا وہ تھوڑا سا فاصلہ بھی برائے نام ہی رہ گیا لیکن احمرا۔“ اس کے اپنے ہاتھوں خوفناک غلطی ہو گئی۔ اب وہ اسے نزدیک ضرور تھے کہ اس کے ہاتھوں میں لڑوٹ کے سبب پرچ پتائی کی کھنکھ سن سکیں۔ اس کی لڑوٹ رگت رگت ہو کر کچھ سکیں۔ اور بے تحاشہ دھڑکنے دل کی تباہواری آواز میں صاف صاف محسوس کر سکیں۔
 اور ان کے ذہن رسا سے کچھ عید نہیں۔ وہ لڑوٹ چڑیا کے برعکس لینے کے علوی ہیں۔
 انہوں نے پتائی بغیر کھنٹ بھرتے ایک طرف صر دی۔ وہ بالکل سنجیدہ تھے۔
 ”قیمت خان اس بہت کاسب سے بڑا خیر خواہ ہے۔ وہ محبت کرنے والا آدمی ہے۔ وہ بھی مجھ پر کوئی آج نہیں آئے دیتا۔ تمہاری طرح۔ ہاں میں انہوں کا تمہاری طرح۔ تم نے کتنی دفعہ میری زندگی بچائی ہے۔ بلاشبہ اس کے لیے تمہارا اور بھی احسان مند ہو گیا ہوں۔ تم دونوں ایک جیسے ہو۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ ناراض نہیں ہوتا لیکن تم ناراض ہوتے پڑتے ہیں کس سے اور کیوں؟“ وہ خاموشی سے چائے کے گھونٹ پھرتی رہی۔
 ”تم قیمت خان سے ناراض ہو؟“
 ”نہیں۔“
 ”خان گل سے یا بے بے سے۔“
 ”نہیں۔“
 ”مجھے ہے۔“
 وہ چونک کر سی گئی۔ ان کے لیے کی مٹی خیزی دھکی چھپی نہیں تھی۔
 ”میں کسی سے بھی۔“
 ”آگ بال۔ جھوٹ نہیں بولنا۔ میں نے تمہیں سمجھایا ہے۔ جھوٹ بولنا تمہیں راس نہیں آتا۔“
 وہ خاموش ہو گئی۔ واقعی جھوٹ اسے راس نہیں آتا۔ اور سچ سنانا اس کے بس سے باہر تھا۔ کتنی دیر وہ خاموشی سے چائے کے گھونٹ پھرتی ایک تواتر سے اپنے اوپر کرتی ان فتنوں کو ناپتی رہتی۔
 ”شاید بہت سی کے معاملے میں تمہیں میری روک ٹوک پسند نہیں آتی۔ میں تمہیں سمجھانیں سکتا ہوں۔ لیکن میں تمہارا نقصان نہیں چاہتا۔ شاید میں زندگی میں تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکوں لیکن نقصانات سے تو محفوظ رکھ سکتا ہوں نا۔ اور قیمت خان کے بارے میں بھی یہی ہے۔ اگر قتل تمہارے وہ مجھے کوئی دکھ دینا چاہتا ہے تو میں جانتا ہوں تم مجھے اس کو کھتے بھی پہنچاؤ گی یا کھالو گی نا؟“
 میں آپ کو کون کون سے دکھوں میں گمراہ چاہتی ہوں اور کون کن دکھوں سے بچانا چاہتی ہوں۔ سردار دانیال خان یہ نہ کوئی سمجھ سکے گا نہ میں سمجھا سکوں گی۔
 ”پتا نہیں۔“ اس نے افسوس سے کہا ”کیا آپ قیمت خان سے کہہ دیں گے وہ میرے معاملے میں

وہاں نہ دیکھ کر کہہ۔ "وہاں شہ کٹھی ہوئی تھی اور جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔
"میں تو کہہ ہی رہی ہوں گا خاتون۔" وہ طنز آمیزہ طور پر کھڑے ہوئے "لیکن ماننا اور نہ ماننا اس کی
وفاقی پسند ناپسند پر مشتمل ہے اب تو اس کا حق بن گیا ہے وہ خلیہ رہا۔ آپ کہیں جا رہی ہیں؟"

"ہاں۔"
"مگر صبر؟" چند لمحوں کے لیے دانیال خان کے چہرے پر اتنی بڑھڑکی سیلے بھی چھپی نہ رہی۔
"شیر۔۔۔ انہوں نے کمر اساس کیا۔" یہ بہت عجیب بات ہے۔ بہت دن پہلے ایک دفعہ آپ نے وعدہ کیا
تھا۔ لیکن شاید آپ وعدہ اپنی اپنی کی قائل نہیں کیا شاید آپ وعدے سے بھی بچوں کے ہموارے کے طور پر کرتی
ہیں کیا میں آپ کے لیے اتنا اہم نہیں کہ۔۔۔ خیر۔۔۔"

انہوں نے بات اور صورتی چھوڑ دی۔ "آئیے میں آپ کو رخصت کر دوں۔"
وہ جب چاہا پھر نکل آئی۔ چند ہی عرصے میں ان کے پاس نے دیکھا وہ کشادہ دروازے پر پہنچے۔ ہمیشہ کے لیے اس
پر بند ہو گیا تھا۔ لفظوں کا وہ اسم بول بیٹھی تھی۔ کیا لفظوں کے ان اسرار کو وہ اسی طرح سمجھتی ہے جس
طرح وہ کہانی دیتے ہیں کیا لفظوں کا وہ کائنات ان کے ذہن کو بھی قریب دیکھنے لگتا ہے۔
قیمت خان راشن کے سلسلے میں پشاور گیا ہوا تھا اور کل شام سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔
اور ان دونوں کو کہاں جانا چاہتی تھی دانیال خان کو یہ کچھ پتا نہ تھا اس کے بس میں نہ تھا۔

وہ اس سے وہ کہہ کر آئی تھی اور اسے بھولی بھی نہیں تھی۔
بہت سی کے معمولات میں یہ ایک عجیب و غریب سرا تھا۔ اس کو جتنا سلجھا تا پتا جتنی ریشمی بھولوں کی
طرح اچھے اچھے کر مرنے اس کے کچھ سے بالکل ہی نکل جاتے تھے۔
اصطبل میں صرف ایک ہی گھوڑی قائل اختیار تھی۔ کو اس نے بھی ایک دن دھوکے میں اس کو کہاں
سے کہاں اپنا چٹا کلاب پری کو نڈاری پسند نہیں تھی مگر ستم ظریفی سے وہ بھولوں کے ٹھمن میں دو ٹولوں کی یکساں
وفا دار تھی۔ اس نے دیکھا آج پھر بیلائی بی نے قیمت خان کے شہرے پا کر ہونے کا سن کر چونکے کامنڈا ہوا کیا
تھا اور بہت جلد ہی نواب خان کو اس نے اپنی پسندیدہ گھوڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔

"آپ کہاں بائیں کی؟" پری بھر کر سامنے آئی۔
"جیتنے کے لیے مری۔" اس نے سکون سے گھوڑی کو چتھپاتے ہوئے کہا۔
"جیتنے کے لیے؟" اس کا رنگ فق ہو گیا۔ "وہاں اور کون سے بیلائی بی؟"
"پھر پناہ پری وہاں اور کون کون ہے؟" وہ پری سے پاؤں بجا کر گھوڑی پر چڑھ گئی۔
"شاید تم لوگ جاننے ہو لیکن مجھے پتا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں تم میں سے نہیں۔ پری مجھے اس
مناقت کی امید نہیں تھی۔"

"نہیں جی۔" وہ زور زور سے دو قدم پیچھے ہٹتی۔ "صرف بابا کو پتا ہے جی۔ وہاں قیدی بھی ہے ایسے
قیدی اس علاقے میں بہت ہوتے ہیں۔ جو ہمارے علاقے سے جنگل سے نکلی کاٹا پڑا جاتا ہے یا ہمارے
علاقے میں کوئی اور واردات کرتا ہے۔ اوگ ان کو پکڑ کر بند کر دیتے ہیں۔ پھر ان کی تلاش میں دشمن
چھاپے مارا ہمارے علاقے میں آتا ہے اور مزید لوگ قیدی بنا دیے جاتے ہیں۔ لیکن بیلائی بی اس نے

۱۶۲

آپ کو پکڑ لیا تو؟ یا یہ غل بھالیا اپنی رہائی کے عوض۔ میں لوگوں کو خبر کدوں کی بابت۔ میں آپ کو جانے
نہیں دلوں گی۔"

"جیسا تھیک ہے۔" اس نے سلجھو۔ "مجھے میں کہا۔" کر سورن بادام کی اس شلخ تک آگیا تو تم لوگوں کو خبر
کر دینا لیکن اس سے پہلے میرا انتظار کرنا۔"

گھوڑی کے ٹاپوں نے سخت زمین پر بھی تھوٹی سی دھول اٹھائی۔
بیلا کو زمری میں پڑھی سنڈر لای کی کمانی یاد آئی۔ اس کو گنڈہی نے کہا تھا جو نہی شہر کا گھڑیل بارہ کا گھبر
بجائے اور وہاں لگائی دوڑ گئی۔

یہ عجیب بات تھی کہ راست اس سے زیادہ گھوڑی کو ازبر تھا۔ وہ مناسب اور معقول قدموں سے چلتی آئی
اور دیر سے میں کھڑے ہونے کے اس سفید گھر کے سامنے گویا دوڑا نو ہو کر چھک گئی۔ گویا چڑیا جیسے اس
دن سے لگا کر چھک رہی تھی۔ پہاڑی کو اپنی کرخت آواز میں چلایا۔ اور اس کی پکار دیرانے میں دور تک
نکلا کر واپس آئی رہی۔

پتا نہیں یہ قدم اس کا ٹھیک تھا یا غلط۔ معلوم نہیں اس کے اس اقدام کو دانیال خان معاف کر دیں
گے یا گولی سے اڑا دیں گے۔ ویسے تو وہ گولیاں چلانے اور انسانی جانوں کو دردوں کے حوالے کرنے کے
عادی سے ہو گئے ہیں اور وہ خود سے بھی کیا نہ ان کی بدلت کا کوئی حصہ نہ نہ ہو ملن۔ بند ہم زیادہ۔

گھڑی کے پرانے دروازے پر دستک کی بازگشت خود اس کے لیے شاید اتنی ہی انجمنی تھی جتنی کہ اندر
سننے والے کے لیے جیٹا طبع شخص نے دروازہ کھولنے میں کچھ وقت لگایا۔ شاید کوئی رتن یا بھری اس
مقصد کے لیے بنائی تھی۔ کہ آئے والے کی نیت کو نہیں سے جانچ لیا جائے۔ گھڑی کا لہسا سا ڈنڈا جو دو
کو اڑوں کے درمیان مائل تھا کھڑکی کی سولت سے اس کے اندر آئے کی جگہ بنادی تھی۔

"یہ پہاڑی کو سے بھی جھوٹ نہیں بولتے۔ خاتمہ میں ابھی اس کو ڈانٹ رہا تھا کہ میری منڈیر پر بیٹھ کر
بہت بڑا بول یہاں کون آتا ہے؟"

"میں آتی ہوں یہاں۔"
"آپ کو تو میں ماضی کا خواب سمجھ کر بھول بیٹھا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے وہ زور پلاؤ زورہ آج نہیں ملے گا۔"
"ضرور ملے گا۔ کیوں نہیں ملے گا۔ اگر اپنی شادی پر آپ نے مجھے بلایا۔ بہترین حجام ثابت ہو گا۔"

فی الحال کافی سے گزارہ چل جائے گا۔
"گزارہ تو چل ہی جائے گا۔" وہ اندر آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"لیکن اس کا تم تاحیات رہے گا۔"
"آہ کتنی لڑکی۔ تم اور تمہارے غم۔" وہ معصک خیر نہیں سے بولا۔ "ہم تو بڑے بڑے غم بھول جاتے

ہیں۔ آپ کن غم نے غموں کو رو رہی ہیں۔"
"بڑے بڑے غم تو ہم بھی بھول جاتے ہیں۔ البتہ چھوٹے غموں کا پچھتاوا نہیں جاتا۔"

وہ چلتے چلتے ٹھیک کر گیا۔
"میں نے یہاں اس قید تھائی میں خدا سے صرف ایک دعا مانگی تھی۔ کہ فرمایا مجھے صرف ایک ہمدرد

نے ایک دوڑ لگائی اور منہل مقصود پر تھی۔ بحفاظت اور محفوظ۔
شاید بستی کے گھوڑے بھی پیشو سمجھتے تھے۔

اگلی صبح اس کے لیے ایک حیران کن خبر لائی۔
سردار وائیل خان منہ اندھیرے ہی بستی سے کہیں چلے گئے تھے۔ اور درخصت کے وقت صرف بے بے
سے ہی مل کر گئے تھے۔ اور بے بے ٹاشنے کی میز نوکروں کو ہدایات دے رہی تھیں جو کام سردار کی غیر
موجودگی میں ان کو نمٹانے تھے۔ کیونکہ اب ان کی ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ اور وہ سردار کی کچھ عادی سی
ہو گئی تھیں۔

سو کھانوسٹ ہڑا کے طاقی میں اٹک سا گیا۔ اس نے پانی کے بوتل سے گھونٹ سے ڈالا آتا اور مری
مری آوازیں پوچھا تھا۔
”بے بے“ وہ کب واپس آئیں گے۔ اور پوچھ کر شرمندہ سی ہو گئی۔ اس کی اپنی آواز اس کے لیے
بالکل اجنبی تھی۔

”ہاں۔“ بے بے نے خستہ خان سے وحیان بٹا کر اس کو دیکھا۔
”پھر معلوم نہیں جان۔ بے بے اب اتنی مدت تو وہ بھی کڑھی نہیں ٹھہرے۔ اب گئے ہیں تو ان کو سال
بھی لگ سکے ہیں اور مینے بھی۔“
روشن روشن ڈانٹک مال اس کی نظروں میں آہستہ آہستہ دھندلا گیا۔ اس نے میز کے کنارے دو دونوں
ہاتھوں سے پکڑ کر ایک لہا اور گہرا سانس لیا۔
”تم اپنے کام نکل کر لیتا بیٹا۔“ وہ کبھی بھی آجاتے ہیں۔ اچانک اور اوجھڑے کاموں پر بہت ناراض
ہوتے ہیں۔“

”میں جہاں تک میرا خیال ہے اس مرتبہ وہ بے بے عرصے کے لیے باہر نہیں رہیں گے۔“ بے بے
لہروانی سے اپنے قریب اور جھوٹے ہنس رہی تھیں۔
”شعبان رمضان“ وہ انگلیوں پر گنتیوں لیں۔

”عید وہ ہمیشہ گڑھی میں گزارتے ہیں۔ رمضان شریف اب دور نہیں۔ شعبان پھر رمضان۔ شوال۔
ایک مرتبہ تو امریکہ کے دور دراز شہر سے عید کر کے وطن آئے تھے۔“
بے بے کو سہانہ عیدوں کی یاد بے ہوش لایا۔

”میری دنیا ان کا مذاق کر رہی تھی کہ دنیا جہاں کی آسائشیں چھوڑ کر یہ تہ خانے میں عید منانے آئے
پیر۔“

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر الجھتی سی رہی۔ بے بے کا اطمینان ہر مشکل چیز کے
مقابل قائل رہا۔ وہ آج شہر ان کا یہی بہت طرز فکر ان کو دنیا کی بہتر چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔
وہ کی طرف سے ناامید نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ ڈیڑھ دو ماہ کی۔ کسی ایسے شخص سے طویل جہاں بھی ان کے
لیے ایسا عجیب نہیں۔ وہ پر امید ہیں۔

دوست چاہیے۔ عورت ہو یا مرد۔ بالغ ہو یا نابالغ۔ مائل ہو یا پاگل۔ چٹا نہیں کتنی مدت سے خدا سے اور
درازا اس سے بندگیاں اور ناراض مسلسل ایک ہی سگڑا سے ایک ہی دھماکتا کیا ہوں۔ لیکن وہ بچپن میں
جوسا تھا قبولیت کی گھڑی کے بارے میں وہ شاید۔ میں تمہاری زبان سے خوفزدہ ہوں خانم۔ یہاں زبان کا
انجام موت ہے۔ اس نے بے زبانی سے بات کے بہت سے پہلو بدل ڈالے۔

”آپ کون ہیں؟“ دوست کہہ دشمن؟
اس نے الماری کھول کر کافی کے مک ڈونلڈ پر کیلینڈر میں کافی کے موٹے دانے ڈال کر پلک آن کر دیا۔
”کس کے؟“ تمہارے؟“ پر کیلینڈر کی گھڑی میں اس نے آہستہ سے پوچھا تھا۔

”بستی کے؟“
”تمہیں بستی سے کیا علاقہ؟ تم خود بستی کی کیا ہو۔ دوست کہہ دشمن؟“
”میں بستی کی وفادار ہوں نہ وہ کرسی پر آگئی یا لٹی مار کر تھکتی ہوئی۔
”واہ۔ تمہارا یہ پوز بہت شاندار ہے۔ میں تمہارا مجسمہ بناؤں گا۔“
”آپ مجھے بھی بتا لیتے ہیں؟“
”بہن سے کیا مراد ہے بی بی؟“

وہ سیاہ کافی مک میں پھر کر اس کے سامنے لے آیا۔ ”افسوس کہ بازو ملک ختم ہو گیا ہے۔ شام تک
آجائے گا۔ تم گزارہ کر لو؟“ مجھے پتا ہے تم کر لوگی۔ لگتا ہے تم ہر طرح کے حالات میں گزارہ کرنے کی عادی
ہو۔“ اس نے گھونٹ بھر کر مک پیچ کر دیا۔

”تم نے کیا میں کتنا چور ہوں۔ آج قیمت خان کو میری رچہ سے منڈی جانا پڑا۔“
”وہ اپنے قیدیوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔“
”ہاں۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔ ”کیونکہ قیدیوں کو زندہ رکھنا ان کے مفاد میں ہے۔“

”میں آپ کی بتائی ہوئی چیزیں دیکھتا جا رہی ہوں۔“
”ضرور۔ ان کے لیے تمہیں کسی آرٹ گیلری تک نہیں جانا۔ صرف یہ ساتھ کارروازہ کھولنا ہے۔“
”نہیں آپ کی تصویریں دیکھنے کے لیے تفصیلی وقت نکال کر آئیں گی۔ فی الحال میں چری کو ناراض
نہیں کر سکتی۔“

”جنرل پر یوں پر بھی اعتبار ہے آپ کا؟“
”کیوں نہیں۔ آپ کا نہیں ہے؟“

”پر یوں پر تو ہے۔“ وہ مٹی تیزی سے ہنس بڑا۔ ”حالا کہہ پر یوں نے ہم پر بڑے جادو کیے ہیں۔“ وہ اس
کے ساتھ باہر آیا اور گھوڑی کو گھیر کر خوش ہو گیا۔ گھوڑی ہنسائی اور اگلے بچوں کو لے نالی سے زمین پر
مارتی رہی۔ اس نے گھوڑی کو چھکی دی اور پستول میں کچھ ہدایت دی تھیں۔

وہ غور کرنے کے باوجود صرف اتنی ہی سمجھ پائی۔ وہ گھوڑی کو کہہ رہا تھا۔ یہ زنانہ مہمان میری مہمان
ہیں۔ ان کو حفاظت سے پکارتا ہے۔

سورج اوپر کو جا رہا تھا۔ اور وہ سڑ رہا نہیں تھی۔ اس کے پاؤں میں اس کے اپنے دونوں جوئے تھے
لیکن اس کو لگتا تھا۔ اچھا۔ آج میں کس گرا آئی ہے اس کی سوتیلی بہنیں اور مل اس کی ہنتر ہیں گھوڑی

اور عید کے ساتھ مکرر سے دن اور گزری رو تھیں۔ اور کیا علوم اس طرح ان کی گزری زندگی کے اچھے باب، پھر سے چلت جاتے ہوں۔ وہ مسکرائے جا رہی تھیں۔ جیسے کوئی کتاب آپ کو اڑ رہی ہو۔ اور آپ اپنے پسندیدہ حصے والے صفحے پلٹ کر بار بار پڑھ لیں۔ یا کسی اچھی گیسٹ کا اچھا سا معرکہ مسلسل دہرا کر لطف لیتے رہیں۔

واہ بی بی بڑا۔ تم سے اچھی تو یہ لڑھی خاتون ی رہیں۔ جنہوں نے انسان اور اس کی سوشل لائف پر موٹی موٹی کتابیں نہیں پڑھیں لیکن زندگی کو گزارنے کا لہجہ تم سے بہتر ہی آتا ہے۔ کوئی قیمت نہیں آئی۔ اس نے کھانے کی میز سے اٹھ کر فیصلہ کیا۔ صرف ایک شخص درمیان سے چلا گیا ہے۔ اس حالانکہ وہ جہاں کیا ہے وہاں بہت خوش ہو گا۔ یہی تو وہ یہاں سے غیر متوجہ رہنے کے لیے چلا گیا ہے۔ اور ابھی کوئی بات بھی نہیں کہ اس کی کمپنی بہت خوشگوار تھی۔ وہ جہاں بیٹھا تھا، لطفیوں کی ہیرا ہر جاتی۔ یا وہ آپ کا ہندو اور مہمان تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں تھا صرف اس کی تندرستی کی عادت ہی ہو گئی تھی اور عادتیں جیسے پڑتی ہیں۔ دیے بھوت بھی جاتی ہیں۔ اس نے دو بار پر آوازاں سنہری کاک کے ڈائل پر ایک نظر گھمائی۔

اسکول کا وقت ہو گیا تھا۔ بچے صبح ہی بستروں سے اٹھ کر اونٹ سے سیدھے بھاگے اسکول پہنچتے ہیں۔ یہ اسکول سے زیادہ ایک ذاتی سائینس سینٹر کیونکہ اس کے ایک ہی کمرے میں چکی سے پانچویں تک کے بچے پکڑے جاتے تھے۔ وہ باری باری سب کا سلیبس چیک کر کے تیاری کو آتی تھیں۔ اس نے باوجود اسرار کے کڑھی بیسی خان کے مالکن کا کوئی احسان نہیں لیا اسکول چلانے کے لیے ابھر

اوجھڑے بھری ہوئی تھی۔ بچے خود ہی اسکول کی صفائی کرتے۔ پری کہیں سے پسلیں اور چاک وغیرہ مار کر کے لائی تھی۔ بلکہ کچھ رنگ اور برش بھی تھے جو اس نے اپنے باپ کے سامان سے مانگ کر بچوں کے لیے لگائے تھے۔ قیمت خان۔ یہ سب کچھ خوار اور خوشوار نام والا آدمی۔ بھلا اس کا آرٹ سے کیا واسطہ۔ مطلب یہ ہے کچھ سمجھنے کی اس کو ضرورت نہیں تھی۔ یہ آہ ہے۔ وہ آہ کی تصویر بناتی اور اپنے کام سے ڈاکر کھتی۔

باجیم کی باری جب سے کامیاب ہوئی تھی اس کے سر سے ملا تھی کا مستقل لیبل تو اتر گیا تھا لیکن بے پے اس کو سہانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ وہ اس کو دوڑاتے ہی کہہ دیتیں۔ "وہ لکھا دانیال خان کی بھی دن اچانک آچے نہیں گے کوئی کام اور جو راندہ رہ جائے۔" یا شاید۔ یہ ان کی دل تمنا تھی کہ وہ اچانک پہنچے۔ حالانکہ ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔

وہ صبح اٹھ کر کھانا پکانے ہوئے تھے۔ یہ ان کے ذاتی ملازم کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور اس غریب کے پاس بھی اتنی خبر تھی کہ وہ کڑھی سے باہر کسی کام سے کچھ مدت کے لیے جا رہے ہیں۔

بے پے بے چاری ممٹا کی ماری دانیال خان کی اس صبح "پر تیزی کو بھی اون کی طبیعت کا ایک حصہ سمجھ کر محفوظ ہوئی رہیں کہ وہ جب سے گئے تھے ان کی کوئی خبر نہیں پہنچی تھی۔ کبھی قیمتی خان بے پے سے تشویش سے آکر دریافت کر لیتا۔ کبھی بے پے اس کو بلا کر باز پرس کرتیں۔ وہ ان دونوں کی بے بسی پر دل میں ہستی خاموشی سے غور کرتی رہتی تھی۔

پھر جب وہ بچوں کو اس کے کام میں اچھاوتی تو اس کا ذہن اس کی اپنی گتیاں الجھانے لگتا۔ واقعی اس

کی بار۔ سے وہ کہیں بھی ہوں۔ کیسے بھی ہوں۔ اس کا کام اس گھر کے چیدہ چیدہ حصوں کی بوجھ بھل کرنا ہے۔ سونہ کر رہی ہے جب تک وہ مفید رہے اور جب تک اس کی یہاں ضرورت ہے۔ اور جب یہ ضرورت ختم ہو جائے گی تو خود اکیلا رہا ہوگا۔ یہ وہی یہ دنیا کی پھٹی پھٹی تھیں کہ اس کے رہنے کے سبب لٹکائے ختم ہو جائیں۔ وہ کہیں بھی چل جائے گی۔

لیکن شاید وہ دنیا کی ہر جگہ گزار سکیں۔ شاید وہ چارواکیس آجائیں حالانکہ اس وقتیں کے لیے اس کے پاس کوئی چارواکیس تھا۔ لیکن وہ اتنی خوبصورت کڑھی اس پر پکے ہوئے مرغی ہانے کے رنگ کا آسمان پر پرواز کر گئی۔ اور وہ کتنی دور رہ سکتے ہیں۔ وہ نامور وقت میں کیشا کے کنارے خاموش بیٹھی یہ خبروں کو پانی میں لٹھ کا پانی کا راستہ لینے کی کوشش کرتی۔

"بھلا کونسا چارواک ہے۔" پری لاشقی سے اس کو خبر دیتی حالانکہ وہ خوب جانتی تھی ہاں کے کھوکھ جاتے سے پہلے ہی کوئی شہید ہو چکی تھی۔ اور شاید اس کے باپ کی صرف اس ایک خبر سے پہلے ہی کوئی کوئی رہی تھی۔ وہ کب جا رہا ہے۔ وہ کب آئے گا۔

"جہاں" اس نے کمرے میں ہوئی خشک گھاس کا لمبا تکاوا انہیں میں دیا تھا۔ "وہاں لکھ کی خبر لینے جا رہے ہیں۔"

بھلا کونسا بھوک کر رہا ہے۔ کب آئے گا۔ یہ خبر سنا محاورہ اس کے کہاں کسی اور طرح سے استعمال ہوتا تھا۔ "وہ اصل سرکار نے کڑھی سے جا کر کسی کو خیریت کی خبر بھی نہیں بھیجی۔ اور قدم قدم پر ان کے استے دشمن ہیں جو ان کو قتل کرنے کے لیے ہیں۔ ہمیں ہر وقت ان کی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لیے سب بے پے کی پریشان ہیں۔" بے پے نے سوچا ہے کہ جہاں ان کی خبر سے ملتا ہے۔

"مچھا" وہ جیسی ہی ہوئی۔ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے لیے یہ پشیمان ہونے والے۔ آنسو ہانے والے اور جاگ جاگ کر وقت کاٹنے والے ایک سو نہیں کئی ہوتے ہیں۔ اور دانیال خان کی خوش قسمتی پر اس کو بھی کوئی شک نہ ہوا ہی نہیں تھا۔

پتا نہیں کیوں اچانک اس کو ایسے بہت لوگ یاد آئے جو اتنے خوش قسمت نہیں تھے۔ جن کے لیے کوئی پریشان نہیں ہو گا کوئی جاگ کر دیا نہیں کرنا۔ جن کا کسی کو انتظار نہیں رہتا۔

یہ وہ خود ہوتے ہیں جو جسم پریشان اور سر پر انتظار ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں میں اس قیدی سے مل آؤں۔ پھر تو شاید اگلے ماہ سے بھی یاد آئے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ ہم جیسے ان لوگوں سے ملنے کتنا رہتے ہیں جو ہماری ضرورت ہیں۔ ہم نے بھی نہیں سوچا جن کی ضرورت ہمیں ہے۔ جس میں ان پر کیا کڑی ہوگی۔

"پری" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔ کھیل تائیں اس قیدی سے مل آؤں۔ پھر تو شاید اگلے ماہ سے پہلے ہمارے بابا کا کھیل سے نہیں جاتیں۔ گھگ کہہ دے کہ وہ راتن دیکھ تو لے آئے ہیں۔"

"میرے آپ ٹھیک نہیں کرتیں پہلا لی بی۔" اس نے کڑھی کی صحت کی خبر دی۔ وہ جانتی تھی مالکوں کی یہ مسلمان مالکوں کی طرح خندنی اور اڑل ہے۔ اسے بھی اپنی جان کی پروا نہیں۔ اسے بھی اپنے ارادوں کے سامنے مڑنا ہے۔ یہ سب نہیں لگتا۔

لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ خود بھی کسی ہی تھی۔ ہوا دار۔ مجلس کی کمی تھی۔ یہ سب درج کئی پڑھ جاتے والی حالانکہ یہ اس سے بھی پوچھتا تھا کہ جس دن بھی اس کا باپ قیدی اور جہاں کے

درمیان اس رابطے سے آگاہ ہوا۔ ان دونوں کے سوا اس کو کسی گولی کا نشانہ بننا ہوا۔
 ”گھوڑی تیار ہے۔“ وہ لگام سے کھینچتی گھوڑی کو اس کے سامنے لاکر چھوڑتی جیسے ہیرو وائٹ کو کسی
 مظلوم کردار کے قدموں میں لاکر پختا ہے۔ ”اور یہ آپ کی کتابوں کا پکٹ بھی۔“
 ”اچھا خیال رکھیں بی بی۔ اس میں بھارتی پھوٹ چلنے کا براہ راست ہے۔“ وہ جوں اڑاتی اس کی نظروں سے
 غائب ہوئی تو وہ اپنے باپ کی بخشی ہوئی سیٹ پر بیٹھ کر گڑھی کی حفاظت کرنے لگی۔
 دس پندرہ منٹ کا یہ راستہ اور گھنٹہ ڈیڑھ کی یہ چوکیدار کی دل اس سے بہت بڑی قیمت لے گی۔
 وہ جانتی تھی لیکن بھلا کے لیے وہ اس سے بڑی قیمت چکانے کے لیے تیار تھی کہ وہ اس کی زیر احسان تھی
 اور پچھان احسانوں کا بدلہ چکانے کے لیے جان دینے میں سعادت محسوس کرتے ہیں۔ اس نے پچھانوں کے
 پرانے قول و ہر اکراں کی عزت اور حفاظت کی قسم کھالی تھی۔

”آپ کے بڑے دونوں میں آپس۔“ قیدی کے لیے جس طرح شک و شبہ تھا شدت۔
 وہ غمگین رہ گئی۔ واقعی وہ کو خوش کرتی تھی جلدی جلدی آتے۔ لیکن یہ اس کے علاوہ قی نہیں تو
 تھی نہیں۔ وہ خود اس قیدی سے زیادہ اختیار رکھتی نہ پاش۔
 ”تو میں نے تمہارے لیے ایسی شاندار کافی منگوائی ہے۔ گھونٹ بھر دو تو جیران رہ جاؤ گی۔“
 وہ چوڑی بار کراس کے آرام دہ صوفے پر بیٹھی اس کی اسٹیشن رو سٹڈ کافی کے گھونٹ بھرنی افسوس
 کرتی رہی۔ واقعی ہم کیوں اپنے آپ کو کسی کی ضرورت بننا ڈالتے ہیں۔ جو سزا ہم سے برداشت نہیں ہوتی
 وہ ہم دونوں کو جھینٹے کے لیے کھینچ دے ڈالتے ہیں۔ وہ اس کے لیے کیا کر سکتی ہے۔ اگر آزادی کی فضا
 میں اس کو چند سانسوں کی مراعات نہیں دے سکتی۔
 ”کیا بات ہے دوست۔“

(دوست کا لفظ آس کے لیے گالی سا بن گیا ہے۔ دوست اور دوستی کے لیے اس نے کیا ہی کیا ہے؟)
 ”جناب اگر میں یہاں آجاتی تا تو قیمت خان آپ کو اور مجھے کوئی سے اڑا دیتا۔“ اس نے بے لگاری سے
 اپنے فقرے ادا کر کے ماحول کے کھلاؤ کو کچھ کم کرنا چاہا۔ وہ اتنی دور سے اور اتنی مشکل سے اس کو پریشان
 کرنے تو نہیں آتی تھی۔ کیا ہے اگر کچھ دیر کے لیے وہ اپنے دکھ بھلائی دے۔ اس کی ہلا سے وہ انبال خان
 یا گڑھی کا کتنا ہی بڑا دشمن کیوں نہ ہو۔

”اول تو میں اتنا خوش قسمت نہیں کہ تمہارے ساتھ گولی سے اڑایا جاؤں۔“ وہ اقلیدوں پر سنے لگا۔
 ”میرے۔ میں تو تم سے بوجھ رہا تھا۔ بریکل تذکرہ کہ وجہ اداسی کیا ہے۔ پریشان کیوں ہو
 و غیرہ۔“ کافی اس کے ہاتھ سے چھلک گئی اس نے سوچا بھی نہیں کہ وہ اتنی اداس نظر آنے لگی ہے کہ اداسی
 کے پوسٹز اس کے چہرے پر چھپ گئے ہیں۔ اب ہر شخص برسر عام اس کے چہرے سے افسردگی اور اداسی
 کے رنگ بڑھ ڈالتا ہے۔

وہ رکتھا تھوڑی پکڑی گئی تھی۔ پتا نہیں قیدی کیا سمجھتا ہو۔
 کیونکہ وہ بڑی خاموشی سے اس کے کپکپاتے ہاتھوں کی لرزش پر غور کرتا رہا۔ جسے وہ لشکروں کے اگلے
 سے اور ہاتھوں کی اعصابی ہی گھبراہٹ سے کوئی مطلب نکالتا ہو۔

178

”میں تم سے شکایت نہیں کرتا۔ تم جب بھی آ جاؤ۔ جتنی دیر کے لیے آ جاؤ۔ مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میرا
 یہ بے نصیب سا گھر جگہ اگھٹا ہے اور ہاں اس بات کو یاد رکھنا میں بھی نہیں چاہوں گا کہ تم پر کوئی حرف
 آئے۔ کیونکہ تمہاری حفاظت میری ذمہ داری ہے۔“

وہ حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہی۔ یہ کیسا عجیب بے ریا اور مخلص سا شخص ہے۔ جو اپنے اور خواہ مخواہ
 چند دنوں کے درمیان عائد کر لیتا ہے۔ حالانکہ اس پر کسی حسیب کسی رشتے ٹانے سے اس کی حفاظت کی ذمہ
 داری عائد نہیں ہوتی لیکن شاید ایک میری دوستی کے ٹانے اس نے خود ہی اس کو اپنا فرض چن لیا ہے۔
 حالانکہ وہ خود جانتا ہے کہ وہ کتنا بے بس ہے۔ ایسا شخص جو خود اپنی زندگی کے لیے وہ سروں کی حفاظت کے
 رحم کو کمر پر بوند بھلا کسی کی حفاظت کا کیا بیڑا اٹھا سکتا ہے۔

”پلیویر اداسی چھوڑ دو۔“ اس نے اس کو جیسے مسلسل کھینچ سے آزاد کر لیا۔
 ”اور خوش ہو جاؤ۔“ اس نے نازک سی قہقہہ دانی سے سیاہ رنگ کی سیال کافی اس کے مک میں قدرے

اوپر سے اڑائی۔
 ”میں نہیں قدرے یقین دلاتا ہوں۔ تم جس بات پر اداس ہو۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ وہ خود
 ساختہ ہے۔ کافی میں لاؤ ڈالوں؟“

”ہیں۔“ وہ اس کی دوا گلی سے لہریز آنکھوں میں ٹھہری جاگتی سی شرارت حیرت سے دیکھتی رہی۔
 ”کیا مطلب؟“

”تو مجھ تو فکرت لڑی ہو۔“ وہ اس کے نزدیک پرے قالین پر دوڑاؤ بیٹھا ہوا بولا۔
 ”تمیں کوئی بات برا راست۔ مناف صاف اور کھل کر کہنا تمہاری ذہانت کی توہین ہے۔ اور میری

ذہانت کی بھی۔“ اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ حالانکہ اس نے اپنا چہرہ پیچیدہ رکھنے کی پوری کوشش
 کر رکھی تھی۔

آنکھوں کے رنگ۔ یہ سوچتی مسکراتی آنکھیں کتنی اپنی، کتنی مانوس لگتی ہیں۔ ان سے اپنیت کی جو
 کرنیں پھوٹتی ہیں۔ ان سے مقدس اور نایاب کیا شے ہو سکتی ہے۔ یہ اس کامب سے قیمتی اثاثہ ہیں۔
 سب سے ہنگامہ سب سے قیمتی اور خلوص سے بڑی نعمت کہاں مل سکتی ہے۔
 محبت کرنے والے بچے دوست سے قیمتی شے اور کیا ہو سکتی ہے۔

”ایک بات پوچھوں۔“
 ”ضرور۔“ وہ بارہ موضوع کی نوعیت بیلا کے چہرے پر کچھ کر بیٹھ ہو گیا۔

”آپ یہاں سے بھاگ سکتے ہیں۔ تو بھاگ کیوں نہیں جاتے۔“
 ”آپ کو کیسے خیال آیا۔ میں یہاں سے بھاگ سکتا ہوں۔“

”آپ قید تو نہیں ہیں۔“
 ”قید ہونے کے لیے بیروں میں پڑنا ہوتا ضروری تو نہیں۔“

”یہاں نہ ہوں تو انسان بھاگ سکتا ہے۔“
 ”کس طرف؟ انسان بھاگ کر جائے بھی تو کس طرف؟ اگر سب راستے اوپر ہی آتے ہوں۔ دیکھیں

اگر آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اس کو کس دوجاؤ بھاگ جاؤ۔ تو وہ اکل جائے گا۔“

”ہاں شاید کہی رہا ہوں۔ تمہاری نے میرے اندر ایک وجود کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ میں اب تک نہیں جانتا کہ کسے بہت سی باتیں جان لیتا ہوں۔ بہت سارے واقعات میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے آتے ہیں۔ شاید اس لیے بھی کہ میں نے درختوں کی اونچی چوٹی کے ذریعے کیس اور دیکھتے کہا۔“

”اس لیے بھی کہ اس راستے کے سارے مسافر ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ میں تمہیں پہچان لیتا ہوں۔ تم نے ابھی مجھے دریافت نہیں کیا۔ خیر یہ وہ وہ میں سارے دعوے۔ سارے ثبوت اور تمام الزامات وہاں لپٹا ہوا ہے۔“

یہ کوئی جن تھا کہ باپری کے قتل واقعی کوئی چیز رہتا تھا۔

یہ زندگی کے انمول تجربوں سے گزر کر بے وحش انسان کے اندر کونسا تھا۔ ہر کیف یہ کندن جیسے تجربے زندگی کا نچوڑ بھی ہو سکتے ہیں جب آپ نے عمر کا کچھ حصہ جاگ رہا ہو وہ خاموشی سے اٹھ کر کوئی دہائی۔ چار نہیں یہ بے نام سی اداس واقعی اس پر طاری تھی یا دوائے کی عجیب و غریب باتوں نے اس کو چوڑا کیا تھا۔

”میں نے جو باتیں تم سے کی ہیں ان پر یقین رکھنا۔ خوش رہنا۔ کتابوں کے لیے بے حد شکر ہے۔“

”لوگوں کی بات ہے۔“ وہ حیرت سے بولی۔ ”میں اس کا چہرہ نہ دیکھی تھا۔ یاد ہو جو کوشش کے وہ اپنے چہرے سے کچھ بھی کھینچ نہیں سکتی۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا جب وہ اس کے دعوے کی نفی کر سکتی تھی۔ وہ شرمیلے سے لکڑی رہ گئی۔“

”یہ کتابیں میری نہیں۔ میرا مطلب ہے مجھے واپس کرنی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کے آگے فریب ہے۔ پہلے میں اس پر زور دالوں گا۔ اور کوشش کروں گا کہ آج رات ہی پر زور دالوں۔ تاکہ میرے شکرانے کے مقابلے میں آپ کو کوئی بات نہ رہے۔“

وہ ہلکی سی ہنسی نہیں کی۔

یہ عجیب و غریب قہقہہ اس میں اچانک نہیں آیا تھا۔ شاید کسی شخص نے لوگ کراہاں دلا دیا تھا۔ اور وہ ناپوش کی شدت میں ڈوب سی گئی تھی۔ بے ہوش ایک نفر اس پر ڈال کر بنائی کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں کے ہلنے جانے سے اتنی ہی گارنٹی تھی ڈاکو بھی نہیں کہ دھڑا دھڑائی کر کے ڈال رہی تھیں۔ ایک لپٹا ہوا اسٹیل ڈانٹول سٹیل جلا کے لیے بن بھی ڈالا تھا۔

وہ عجیب کیسے اترتی ہے؟

سورج آسمان پر کیسے چمکتا ہے۔ رات کیسے تاریک رہتی ہے۔

بالوں۔ اور شہر سڑات۔ جیسے دنیا اس کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیتی تھی۔

کیا بھی کسی ایک شخص کے چلے جانے سے زندگی اتنی خالی ہو گئی تھی کہ وہ بھی لگ سکتی ہے۔

یا شاید۔

یہ ایک شخص کے جانے کی وجہ سے نہیں۔ وہ ایک گھڑ سانس کی کینجھتی۔

”کتنی خاموشی ہو گئی ہے۔“

”ہاں۔“ وانیال خان۔ کہ دم سے ماشاء اللہ رونق رہتی ہے۔ لیکن وہ یہاں تو آتے ہی مسمانوں کی طرح ہیں۔ انہوں نے اپنی اپنی باتیں کر رہی ہیں۔

”آپ بات تو نہیں کرتے۔“

”کیا چاہتے ہو؟“ اس کا دوا نہ وار قہقہہ بخل کھلا گیا۔

”کیا کہیں آپ کو کھل کر دیکھیں گے؟“ اس نے سپاٹ لپٹے میں کہا۔ ”میرا نقل دجایا یا زندگیہ زمانہ کے مفاہیم میں۔“

”اگر آپ اپنا خیال بدل سکتے ہیں تو آپ کو قید میں کیوں رکھے ہوئے ہیں۔“

”ہاں میرا قید سے باہر آ جانا بڑا خطرناک ہے۔ میرے سر پر خون سوار ہے۔ سرخ لٹے پریش بہت سے قتل کروں گا۔ وہ مجھے پروا نہیں۔“

”کس کے قتل؟“

”وہ بولی تو اس کی آواز میں بلی کی کچا ہٹ تھی۔ وہ اس کے ہنگامے پر ایک اور قہقہہ لگا اٹھا۔ زندہ اور جاندار۔“

”چلو۔“ تمہیں اتنی رعایت دینا ہے کہ سوار وانیال خان کے قتل کا رونا واپس لیتا ہوں۔“

اس نے پرانے بادشاہوں کی طرح شان سے جیسے پچاسی کے مجرم کو مخاطب کر دیا۔

”جی۔“ وہ سکون سے بیٹھی اپنی بلی۔

”میرے کہنے سے۔“ میں کہہ کر مطلب پھلا اس میں میرا کیا فٹل۔

”میری بات نہ دوتوں۔“ جھپٹا نا چہ نہیں ہو تاکہ دوتوں سے بچے چھپتا بھی نہیں ہے۔ جو آپ کو اوپر سے جانتے ہیں وہ اندر سے بھی جان لیتے ہیں۔ شرط صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ جانتا چاہیں۔“

”آپ غلط بات کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے اس کو قتل کیا۔“

وہ گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔ وہ بات کو اپنے اندر سے سمجھ کر دوتوں میں لے جاسکتی تھی۔ شاید اس میں اتنی جرات ہی نہیں رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں دیکر اس کی بات کو جھٹلا سکے۔ اس کے دعوے کو رد کر سکے۔ وہ جو اس کا کچھ نہیں تھا اور بیٹھے بیٹھے اس کے بارے میں فحشے صادر کرتا تھا۔

”تم باتیں ہو۔ میں جانتا ہوں تم یہاں آؤ۔ یہ بار بار دہرائے کی اور یقین دلانے کی مجھے ضرورت نہیں۔“ وہ خوشی سے ہنستا ہوا بولا تھا۔

”بالکل اسی طرح تمہیں سوار کے بارے میں یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم فکرت کرو۔ یہ بھی اس کی ایک اداسی۔ وہ جہاں گیا ہے اوت کر نہیں آئے گا۔ وہ کہیں نہیں جاسکتا۔ جب تک تم اس چھت کے نیچے موجود ہو۔“

”میں جلتی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سوری۔“ میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں تو تمہاری پریشانی اور گرد با تھا۔ تم یہاں آتی تھیں۔ ہنسی مسکراتی تازہ دم اور رشاش بناس چہرے لیے۔ آج جب میں نے تمہارے لپٹو روانہ کھولا تو تمہارے کشادہ پیشانی پر ساری کمائی لکھی تھی۔ مجھ سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔“

”آپ آج صحت عجیب باتیں کر رہے ہیں۔“

واقعی۔

یہ تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اور یہ بے نام کی اداسی دراصل اسے بہت سے لوگوں کے ملے جانے کی وجہ سے ہی تھی۔ ورنہ کوئی ایک آدمی اس کے لیے کبھی اتنا اہم نہیں ہو سکتا تھا۔

”خان کل کو بلوائیوں نے بے بسہ کچھ تو روٹی ہوگی۔“

”وہ تو بہت مصروف ہے۔ مشکل سے ہی کام پر راضی ہو تا ہے۔ اب کرنے کوئی کام تک کرے۔“

”اچھا تو خان کل صاحب کام کر رہے ہیں۔“ بڑی مدت بعد کسی خبر نے اس کو چسا ڈالا۔ ”ہم کرتے وقت وہ کتنی ہی چھوڑ دیتا ہو گا کیا۔“

”اور سرجن تیار۔“

”وہ کب آئی ہیں، لیکن وہ چھٹی کیسے لیں گے۔“

”اور شریں اس کو چھٹی مل سکتی ہے۔“

”اس کے تو ساتھ کوئی امتحان ہو رہا ہے۔“

”بے بسہ دانیال خان کی کوئی خبر نہیں آئی۔“

کتنی دیر سے قابو کی گئی زبان بے لگام سی ہو گئی۔ حالانکہ اس نے خود کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وہ دانیال خان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھے گی۔ خواہ اس کو ادھر ادھر کے ہزاروں سوال کرنا پڑیں۔

”بال وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مرغزار میں۔ خشک پاؤں میں۔“

ان کی لاغظاتی نے اس کو سرد سا کر دیا۔

انہوں نے تو جانتے وقت اس کو کسی کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ گویا ان کے نزدیک اس کی حیثیت اتنی ہی پکا اور بے مقصد سی تھی۔ پھر بھلا اس کو کیا پڑی تھی وہ کیر کیر کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتی۔

نہیں آتے۔ نہ کسی۔

”خشک پاؤں۔ وہ کون لوگ ہیں؟“

کبھی کبھی ہماری زبان کیسے ہمارے ہمارے حکم کے تابع نہیں رہتی۔ صیحت، شہور، مسوچ، خمیر اور بارغ کے کھانے سارے فیصلوں کو زبان بے پردی سے روک دیتی ہے۔

”رے تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔“ بے بسہ نے بڑی خوشگوار سی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

”خشک پاؤں کا اس بستی کی تاریخ میں بڑا عمل دخل ہے۔ خاص طور پر اس گھر کی تاریخ میں۔ پتا نہیں میرا اندازہ درست ہے کہ غلط۔ لیکن۔“ وہ کچھ سوچ کر مسکرائے۔

”مگر میں غلط نہیں سوچ رہی تو اس میں کوئی برائی بھی نہیں۔“

اس کے بالکل اندر کہیں کوئی ہنسنے کی آگ جیسے پانی کے ایک جھینسے بجھ گئی۔

”اور دانیال خان میں تو اتنی خوبیاں ہیں اتنی کہ بیک وقت کسی شخص میں ہونا بہت مشکل ہیں۔ ان کی وجاہت۔ ان کا اخلاق۔“

”کچھ خشک پاؤں میں کچھ خاص خواتین ہیں۔“

بے بسہ بے ساختہ زور سے ہنس پڑیں۔

”آپ نے دیکھا ہے ان لوگوں کو؟“

”ہاں کیوں نہیں بہت اچھی طرح۔“

”ان میں سب سے اچھی کون ہے۔“

”سب سے اچھی تو وہی ہے بلاشبہ اچھی بات۔ لیکن“ وہ کچھ دیر چپ رہ کر جیسے بالکل بجھ گئیں۔

”لیکن وہ مجھے بالکل پسند نہیں کرتی۔ دراصل اس کو دانیال خان کی زندگی میں میرا عمل دخل پسند نہیں۔“

”خیر میرا کیا ہے۔“ انہوں نے اپنی آواز اور اپنے لہجے کے تلافی پر قابو پایا۔

”میں والیوں بھول جاتی جاؤں گی۔ ایک مرتبہ اس کا گھر آباد ہو جائے۔ میں اسی لیے رساں ٹھری ہوں کہ دانیال خان اور خان کل اپنی گرجتی سنبھال لیں۔ شریں کی ذمہ داری پوری کریں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔“

اس کے اندازوں کے بت نہ کرنے کے بلکہ اسے اسے عجیب سی خیرت ہوئی۔ دانیال خان بہ خان کل اور شریں ایک مشتک کے کونے نہیں تھے۔ آج تک دانیال خان کی دلچسپی کا محور جس لڑکی کو سمجھی رہی تھی وہ نہیں تھی۔

”خیر خشک، بہت سی لڑکی ہے۔ نئے زمانے کی۔ وہ جیسے تم کہتے ہو موڈرن۔ وہ اپنے چہرے سے اپنے کپڑوں سے اپنے ہر انداز میں خوب ہے۔ وہ بھی دانیال خان پر جان دیتی ہے۔ وہ جہاں نہیں ہوں ان کے ارد گرد مڑھلائی رہتی ہے۔“

”اور باقی کی تین لڑکیاں۔“

”بھئی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے دانیال ایچھے لگتے ہیں اور میں مبالغہ سے کام لے رہی ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ جہاں ہوتے ہیں ساری محفل کی توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ وہ تینوں بھی اپنی سی پوری خوش گزشتہ کرتی ہیں کہ دانیال خان ان کی طرف متوجہ رہیں۔“

پتا نہیں بے بسہ کچھ کہہ رہی تھیں یا مبالغہ کر رہی تھیں۔

ایسی عورتیں اس نے دیکھی تھیں لیکن بہت زیادہ نہیں۔ سوسائٹی سے متعلق اس کا تجربہ کچھ خام ہی تھا۔

”دراصل ان میں تین خوبیاں ایسی ہیں جو مشکل سے یکجا رہتی ہیں۔ اول ان کا خون، دوم ان کی دولت اور آخری بات ان کا تجربہ۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہے ان کو دل میں گھر کرنا آتا ہے۔ دیکھو کڑھی کے لوگ کس طرح ان پر جان دیتے ہیں۔“

”مگر کیا جان دینے والے کو بھی پتا ہے پتا بھی رہتے ہیں۔“

بے بسہ بالکل بھی نہیں مسکرائیں۔ اس وقت وہ سنجیدہ تھیں اور بیٹا ملکیت ٹال دنا ان کو قلعی اچھا نہیں لگتا۔

”وہ کہاں کہاں نہیں رہتے۔“

”آپ کے خیال میں بے بسہ کی وہ لوگ شادی کرنے والے ہیں۔“

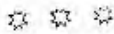
”مجھے تو یقین نہیں ہے لیکن۔ ان آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے اور اب اتنا تجربہ حاصل کر لیا ہے کہ لفظ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ایک موقع پر جب وہ سب براں آتے رہتے تھے۔ خشک نے ان سے گانے کی فرمائش کی۔ تم تو ان کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ کتنا لیے رہتے ہیں لیکن انہوں نے گانا گایا

گوانے کے لیے نہیں بلی جاتی۔

وہ خاموشی سی اپنی دن بھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ لیکن جلتے ہاتھ پیروں کے ساتھ اس کا دل غریب
کھینچے سے قاصر تھا۔ کیوں؟ کیوں؟ شہرت سے اس کا بلی چاہتا۔ وہ کڑھی چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے
ملازمت کی تلاش میں کہیں اور نکل جائے۔

پھر کسی دن کسی وقت کوئی شخص راستہ بھول کر واپس گزرنے آجائے تو ایک مرتبہ تو یہ ہو جائے۔
”وہ جو ایک گھر پر اس پر انداز کے لیے ایک غیر اہم سی ایڑی ملازمت میں مل گئی تھی۔ کیا وہ کڑھی پھوڑ
کر جا چکی ہے؟“ کیا اس مسلسل فریب سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں سے کچھ کہ طویل سفر کے بعد جب
لوگ واپس پلٹتے ہیں تو پیچھے رہ جاتے تو لوگ ان کے حلقے میں پہنچے ہوتے ہیں یا سٹ جاتے ہیں۔
کون جانے؟

اور پھر اس کے انتقال میں بھی میں جتا رہے کہ کب وہ روک جائے۔
لاہری کے ساتھ کام کاج میں اور بھی شہرت سے مصروف ہو گئی تھی۔ گویا اسے جلد سے جلد یہ سب
کام ننگا کرنا ہوتا تھا۔ وہ کوئی کام ادھور اچھوڑ کر جاتا نہیں چاہتی تھی۔ خواہ وہ اس کی ڈیوٹی میں شامل ہوتا
یا نہیں۔ اس کی گاہ لہجہ میں ہوا غور قوت کے امور۔ وہ بری کو ساتھ لیے جلد جلد سارے کام نشتانی
رہتی۔ اس لیے وہ کتنی مدت تک ٹھیک جبران سے ملنے لگی نہیں جاسکتی۔ کیا فائدہ جو وہ واپس آئیں اور
کسی ادھورے مددگار کے کام میں نقص نکالیں۔



پیدائش کے اندر سے آج تک اس نے رمضان شریف کا چاند اتنا واضح نہ نمایاں کبھی نہیں دیکھا تھا۔
شہروں کی پھرتوں پر خوشیاں لانے والے چاند شہروں کی روشنیوں میں دھندلے ہو کر نظر بھی نہیں آتے
تھے۔ یہ تو ایک ہی کڑھی جیسی خلیں تھی۔

جہاں سر شام کی اندھیرا کرنا شروع ہو جاتا۔ موسم بھی صاف تھا لہذا چمکیلا چاند تارستان پر خوب چمکی
طرح نظر آئے۔ اس کے بعد عجب ہو گیا۔

بہت سی لوگوں نے پلاٹے چلائے اور آسمان کی طرف بڑھتے توں کا رخ کر کے دعا مانگ رہے تھے۔ وہاں گویا درج
دیں۔ جاتے جاتے ان کا کیا مطلب تھا۔ ساری بہت سی رمضان کی اندھیر چمک رہی تھی۔ بے بے اسٹور
سے افواج تلوار کر رہی ہیں اور لوگ، رمضان کا سلام کرتے راست پرے تک آتے رہتے۔ بے بے بیٹے
تھانسا مصروف تھیں پھر بھی انہوں نے بتایا کہ رمضان کا دن کے پہلے ہی آیت اہم مقام ہے۔ یہاں چھوڑنے
چھوڑنے کے شرط کا کر روزہ رکھتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ بھری کھانے بغیر روزہ
رکھیں گے۔ لیکن لوگ اپنے تئیں پیار سال کے بچوں کو روزہ رکھواتے ہیں۔ اور انہیں لوگ۔۔۔

وہ چپ چاپ بیٹھے کھجور و خوش و خوش اور اہتمام رکھتی رہی۔ وہ ان سے بڑھ کر نہیں کرنا چاہتی
تھی۔ جہاں کیوں کیوں کی رعایت، خود اٹھ اٹھاتی ہے۔ میں اسے رکھتی رہی۔ ہم اپنے اوپر ان کو ممنوع
کے اور اپنے لیے مسائل کے شے کر کے یہ کیسے سمجھ لیتے ہیں، کہ مذہب، گواہ اس سے کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔
”لیکن بے بے“ اس نے منہ کر کے ”میں تو بھری کھانے بغیر روزہ نہیں رکھ سکتی گی۔“

”بال بال کیوں نہیں میں بھی بھری کھا کر رکھتی ہوں۔ تمہارا بندہ بے بھی رہ جائے گا۔“ بے بے

تھا۔ اور عدلیہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

”اچھا“ وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔ ”دانیال خان کا بھی لیتے ہیں مجھے پتا نہیں تھا۔“

”رے ان کی آواز قہر سے بھاری اور خوبصورت ہے۔“

”اور عدلیہ خنک کی؟“

”ہاں اس کی بھی بہت اچھی ہے۔“ بے بے فراخ روی سے سر ٹیکٹ لٹاتے پر تلی ہوئی تھیں۔

(یہ کتنی عجیب بات ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ دانیال خان میں اتنے ہیروؤں والی ساری ہی باتیں
ہیں۔ شکر ہوا کہ وہ خود اپنی ہیروئن بننے سے بچ گئی)

”انہوں نے کون سا گانا گایا تھا؟“

وہ اپنے سوال کے پچھانے میں رہ گئی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا خوب ہی مذاق بنتا۔ یہ شکر ہوا کہ بے بے



وہ رات گئے ستر لکھ تیرہ سو نو ہوا تو اس کی نظر ڈیٹیل کیلنڈر کی طرف اٹھ گئی۔ آئیس دن گزر گئے
تھے۔ اتفاق سے ہر رات وہ دن الٹا پر گن رہی تھی۔ حالانکہ ان دنوں کو گننے سے اس کا کوئی خاص مقصد
بھی نہیں تھا۔ لیکن کتنا عجب پر ضرور آئیس گے اور ممکن ہے آئیس تو سال بھر نہ آئیں۔

ان کا یہ دل رہنا اور یہاں سے چلا جانا کون سا قابل ذکر کارنامہ ہے کہ وہ ان گن گن کر اپنی زندگی بچان
کرے۔ اس نے بہت سے بچے سر کے نیچے لگا کر جیسے ڈسپوٹ پر سوچا۔

بھئی۔ کتنی قدرت بھر پر۔ بہت سہراں رہتی ہے جب وہ ہم کو کسی نلک راستہ پر نکل جانے سے پہلے روک
لیتے ہے۔ سارے وہ بچے چھائی ٹھنڈی اور سرد سوسا سادار گئے۔

بھئی کو بونہی محسوس ہوتے ہے ہمارا دل بند ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ کسی بھی چھوٹی ضرورت میں
ہوتا۔ اس نے بے لگام چھوڑی سوچوں کو قابو کر لیا۔ شکر ہے وہ اس ریلے میں پھوڑ کر نکل نہیں گئی تھی۔
اسے خود کو سنبھال کر رکھنا بھی آتا تھا۔

اسے محلوں کے لیے بھی لگتا تھا کہ شاید وہ اپنے بہت سے بڑے بڑے ناموں کے سامنے پھوٹی پھوٹی سی
روٹی ہے۔ کچھ حقیر سی ہو گئی ہے۔ نہ جس کا وہ نہ جس کا وہ نہ جس کا وہ نہ اٹلی سوسائٹی پر روزہ نہ وہ جدید
شہر رات بھر کی ہے۔ آگاہ ہے جی کہ اسے گانا بھی نہیں آتا۔

پتہ نہیں چلتے ہیں انہیں اب آگاہوں میں اداسی چھائی ہے۔

اور اصل میں بات یہ ہے کہ وہاں کی بلی کہ کوئی شہر کی خان اور اس کے ہالک پر جہاں اس سے زیادہ جی بھی
نہیں ہے کہ یہاں ملازمت کرے اور اس کے عرض اپنی تنخواہ حاصل کرتی رہے۔ کیا یہ قیمت نہیں کہ
ملازمت کے لیے جو آپ کے ساتھ ملازمت والا رہے نہیں رکھا جاتا۔ آپ کی عزت اور احترام میں کوئی
فرق نہیں لگنا چاہیے گا یا یہ کہ گھر والوں اور آپ کے بچے کوئی بھی بڑی دیوار حائل نہیں۔

اور یہ بات، کچھ یاد رکھنا چاہیے کہ اس نے کیوں نہیں بڑے بڑے خود کو بہت اچھے بچوں کی طرح نصیحت
کی تھی۔ تنخواہ ہی بڑا اور رشتہ ہے جو آپ کے اور اس کے درمیان ایک حقیقت کی طرح موجود ہے۔ اور
وہ آپ کے کسی جھگڑے کو سمجھتی ہے۔ لیکن یہی نہیں تو صرف اسی جیسے کہ۔

لہذا آخر یہ صورت چیزوں کے چٹاؤ کے لیے کسی اور وقت کی یاد رکھ کر عزت نفس جیت جیتے

نے اس کو تیلی دی تھی "تو رمضان آگیا۔" اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔
 "وقت اگر اس طرح بھاگتا رہا تو۔" اس نے خیالوں کے گھوڑے کی نگاہیں کھینچیں۔ خود کو بے اختیار
 کرنے سے حاصل؟ وہ خیال خان کسی ضروری کام سے کہیں مستور نہیں گئے تھے۔
 وہ ہمیں مرزا واپس "خٹک باؤس" میں گھسے ہوئے تھے۔ لیکن وہ کسی قسم کی اطلاع بھیجنا ملاقات
 کرنے کے مڑاؤ میں نہیں تھے۔ آج پہلا روزہ تھا۔ اور اس روزے کے سلسلے میں جانے وہاں اجتماع کی
 صورت کیا ہوگی۔ اگر وہ روزے رکھنے میں جاتے تو یہ بھی خاطر مدارات میں کوئی کمزور اختیار کھیں
 لیکن شاید وہ خاطر تواضع اس خدمت کا مقابلہ کر بھی نہیں سکتی۔
 پنجاب میں بھی افطاری ایک اہم آہٹم ہوتا ہے لیکن عسلی خان کی یہ افطاری شاید عمر بھر یاد
 رکھنے والا ایک واقعہ ہی تھا صرف روزہ کشائی کے لیے پورے ہال کمرے میں پھینکی میز یہاں سے وہاں تک
 اتنی بڑی تھی اور اذان کی آواز کے شہسوار تھی برقی بیز کے گرد صرف وہی آوی تھے۔
 اذان سے پہلے قیمت خان بیوی کی نازک ٹرے میں ڈاک لے گیا۔
 یہ سفید لٹافہ پر مشتمل ایک خط تھا۔ اور یہی آج کی ڈاک تھی۔
 پلانے ایک نظر لٹافہ کی طرف دیکھا۔ کوئی لٹافہ اس کے نام میں آیا تھا۔ ایک مدت گزرنی لیکن یہ
 عجیب سا لٹافہ تھا شاید بھوک کی شدت سے یا روزہ کے کھلنے کے انتظار میں اس کا دل ہلکا سا دھڑکا تھا۔
 بے بے نے ایک نظر امید سے قیمت خان کی طرف دیکھا۔
 "یہ تو انیل خان کی ڈاک لگتی ہے کون آیا ہے؟"
 "جی ہاں۔ یہ قادر خان لایا ہے۔" وہ دودھ تھا۔
 بڑا کا ہوا راند میں دھڑکتا دل ایک مرتبہ تو جیسے دھک سے بند ہو گیا۔
 محبوب سے ملنے کی آواز گونجی۔ اور اس کا کاہل دل دھڑک دھڑک کر کے سید توڑنے لگا۔ بے لٹافہ جاگ
 کر کے کانٹہ ٹال رہی تھیں۔ پھر انہوں نے تیزی میں لٹافہ پھاڑنے کی کوشش کر کے بھجور منہ میں رکھ لی۔
 "روزہ کھولو بھلا۔" گروہ ہو جائے گا۔
 اس نے بھجور اور ہائی کا نکلا اس بیک وقت منہ سے نکال دیا۔
 بے بے نے چشمہ لگا کر نہایت اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر خط مزے لے لے کر پڑھنا
 شروع کر دیا۔ پتا نہیں انہوں نے کتنے دفتر کے خطے لے لے بے کو ان کی ایک ایک لائن میں کتنے جہاں
 کے معنی نظر آ رہے تھے۔ کہ نہ انہوں نے خط ختم کیا واپس رکھا۔
 کتنی مرتبہ پلانے کو شش کی وہ ایک چھوٹی چھوٹی نظر کانڈر ڈال ہی دے۔ پتا نہیں انہوں نے کیا لکھا
 ہو گا۔ انہوں نے "خٹک باؤس" میں منتقل رہائش کا منصوبہ بنا لیا ہے۔
 یا وہ خٹک باؤس سے امریکہ چلے گئے ہیں اور اب فی الحال پاکستان واپسی کا کوئی پروگرام نہیں۔ یا یہ بھی
 کہ وہ جہاں ہیں قریب سے ہزار ان کے بارے میں فکر کرنے کی کسی کو کوئی ضرورت نہیں۔
 اس نے خط میں جہاں تک کی معمولی سی کوشش کتنی مرتبہ کی پائی اٹھاے ٹیکوڑوں کی ڈوش کھکا تے۔
 لیکن وہ اپنی بے تلی کا کوئی مظاہرہ کسی کے سامنے کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بے بے نے لٹافہ واپس
 نوکری میں رکھا تو وہ پھر ڈراوا میں سے گھر رہی تھی۔ ان کا بے رنگ ساٹ چوہا کسی بھی اندازے کے راستے
 میں حائل ہو رہا تھا۔

"آپ کچھ نہیں بے بے۔" اس نے کہیوں کی ڈوش آگے کی۔ "کیا لکھا ہے انہوں نے؟" وہ فی الحال واپس
 نہیں آ رہے۔" اس کے لہجے کی بے نیازی اور بے تماشائی پرواہی اس کی شدید محنت کا شمر تھی۔
 "پھر عکس اس کے۔" انہوں نے اسی پرسکون سی آواز میں کہا۔ "وہ کل یہاں پہنچ رہے ہیں۔"
 "کل؟" بے قابو ہو کر آدھل پھیلوں میں کسی ڈوبنے والی شے کی طرح حیرانہ آوازوں سے مکرر اترتا
 جیسے پاگل ہو گیا۔ سارے جسم میں دوڑنے والا خون کتنی دیر اس کے چہرے پر چھلکا رہا۔
 اسنے دن کی شب دو روزہ جتنی۔ اپنی ذات کے ہزار ہزار قضیہ جتنے۔ جیسے۔ یہ طاق رکے گئے تھے۔
 وہ خورے کے گئے سارے عہد۔ ساری انصاف جتنی بھلا کر بھر سے اپنے دل کو شانت ہو جانے پر سکون
 رہنے کے لیے ڈھونڈنے لگی۔ ہاں اس کا دل اس کو اس بیوقوفی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کتنے دن اس نے
 اپنی ذات پر صرف کیے تھے صرف یہ سمجھانے کے لیے کہ لکھا اس مگر کسی کے سروا کا نام سے رشتہ کیا واسطہ
 ہے کیا مطلب ہے؟
 ہاں مگر صرف آقا اور ملازم کا۔ اس سے زیادہ ان کو کیا لچھی ہے لی بی بیلا تم سے۔
 لیکن وہ رداقت تھا۔ جیسے سارا قصہ جتنی ایک خدی دل نے ایزیاں رگڑتے پاؤں میں پھاڑ دیں
 تھیں۔
 ایک مگر سکان۔ سیاہ اسکون۔
 وہ مغرب کی نماز پڑھ کر دھانا لگتے گئی۔ جیسے خود پر قابو آنا سکھانے جیسے اتنا بچہ کر کہ اپنے آپ سے شرم
 آنے لگے عزت نفس کو بھڑکنے نہ کر۔ جیسے باؤس نہ کر۔ جیسے باؤس نہ کر۔
 وہ نماز پڑھ کر اٹھی تو اس کے تن میں ایک نئی طاقت آگئی تھی۔
 روزہ کھول کر بے بے کو البتہ کمزوری سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کھانا
 کھانے سے احتیاج قلب کی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنا خمیر کھلایا اور چائے کے لیے بیلا کو
 اپنے کمرے میں ہی بلوایا۔
 وہ اپنے کمرے میں گئی جیسے بیاری لگ رہی تھیں۔
 "روزہ کھول کر مہر کی بیک کیفیت ہو جاتی ہے۔ پلانے بڑھاپا بری بلا ہے۔ دیکھو عبادت کا اصلی تر بچا کرتا
 ہے۔ ہاں پلانے نے نہیں بلوایا تھا صاف کرنا نہیں رہا شریف میں تھیں کچھ زیادہ ذمہ داری سونپ
 رہی ہوں۔"
 انہوں نے کتنے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر خط دوبارہ نکال لیا۔ وہ لمبا سفید لٹافہ جو دونوں کو اپنی جگہ
 ایک نامعلوم سی خوشی بخشتا تھا۔
 انہوں نے اس کی چند سطریں دوبارہ پڑھ کر چھوڑ دیں۔
 "انہوں نے اس میں تمہارا نام بھی لکھا ہے۔" بے بے اپنی ذات کی مخصوص لا پرواہی سے کہہ رہی
 تھیں۔ اس کا چہرہ پھر نکال دیا جیسے رک گیا۔
 "کیا لکھا ہے؟" "صاف کے کسی کو سے دل بی بی مری ہوئی آواز۔ بے بے کے لیے پورا بھی اہم نہیں تھی۔
 "انہوں نے لکھا ہے تم ان کے لیے کچھ کمرے ٹھیک کروالینا۔ اوپر والی محل میں۔ اور لاہوری کے
 پاس ان کو سامنے چاہیں۔ کیونکہ ان کے ساتھ کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ اور مہمانوں کے ساتھ ان کے کچھ

نور بھی، دل سے... وہ دیکھ رہا ہے جسے خالی کرنا چاہتے ہیں۔ کیا کل تک تمہیں سارا کالم کرانگی؟
ڈیئر ماری بر ف نے جیسے اس کے سارے وجود کو ڈھانپ لیا۔ اتنی دیرت بعد انہوں نے اس کو کچا رہی
تھا تو اس کا دم کے رشتے سے اسی ملازمت کے حوالے سے سوچ چکی تھی۔
”یہ ان کا حکم ہے تو میں کر لوں گی۔“ اس کے حصے کی ساری بر ف اس کی آواز بلند و محل تھی۔ اتنی
سرور بھی بچی بے لگی اپنی گرم جوشی کے سامنے بھی گئی۔
”اس مرتبہ وہ کچھ زیادہ افسانہ کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہیں۔ خدا کرے وہ
واقعی کس فیصلے تک پہنچ ہی جائیں۔ مجھے شاید تمہیں بتانا پڑے گا کہ ان کے ساتھ عدیلہ خٹک بھی
آ رہی ہے۔ جس کا ایک مرتبہ میں نے تم سے ذکر بھی کیا تھا۔ یہ وہی لڑکی ہے جس سے دانیال خان
شادی کرنے والے ہیں۔“

وہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کے قدم پر جھل تھے لیکن شکست خوردہ نہیں۔
یہ بھی گزرتے گزرتے اس کی نظر دوا پر آ رہا تھا۔ آرم آئینے پر بیڑی اور اس کو اچھالا کہ اس کا چہرہ کچھا
بچھا اور باؤس مایوس نہیں تھا۔ باؤس کا خوف صرف اس وقت تک ہوتا ہے جب تک آنے والے وقت کو
آگاہ نہ ہو اور جب فیصلے کی گھڑی آپ کے سر پر آجائے اور مصنف آپ کا فیصلہ نہ ڈالے تو تکلیف کی
شرارت میں ایک دم کی آہانی سبب حالانکہ وہ فیصلہ آپ کے حق میں نہیں رہا ہوتا۔

”ایک سہنہ ہو۔“
اس نے لڑکھالیوں کی طرح ہوا اور موسمی پھولوں کی خوشبو کو اتر آئے کار مست دیا۔
ستارے چاندنی رات کی رات کی رات کی رات اور آؤ آؤ آؤ کی خوشبو پر اگر اس کا اختیار نہیں بھی ہو سکا
تو ان کی محبت کا راستہ بند ہو گیا۔ اور وہ یہ بھی میں مزید پیشہ لڑکی ہوں۔ اس نے پیشے میں خود کو
دیکھ کر مذہم سے تنبیہ کی۔

یہ خواب اور خوابوں میں کھلنے والے خاکے اور تمام تر خوبصورت الفاظ اور ان کے اچھے اچھے
استعمال پر اس کے بجائے واقعی کسی آسودہ حال لڑکی کا حق زیادہ تھا۔ اس کا تو صرف قرض ہے اور وہ یہ کہ
لاہور کی کے پاس والے اور دوسری منزل پر مسافروں کے کمروں کی دیکھ بھال کر دی جائے۔ اس میں موجود
فرنیچر میں رو بہ بدل کی ضرورت ہو تو وہ بدل کر لیا جائے اور اس۔

سب سے بڑے کمرے میں آئے سے پہلے اس نے ایک چکر لاہور میں اور اور والے کمروں کا اگلیا تھا۔
قیمت خالص نہ سوار کے چلنے کے بعد ایک کچی اسے چھانے کو براہ صاف کرنا تھا۔
”مہاراجے! کیا تمہیں آپ کو لاہور میں کی چالی سے دی جائے۔“

غالباً ان کے ذہن میں یہ سب پر گرا ہوا تھا۔ سوچو تو تھا۔ ان کا اچھا بھلا ہمارے زمانہ ہو کر مرنے والا
میں خٹک ہاؤس میں قیام کرے اور مسافروں کو لے کر آؤ کھانا لیکن اس کو کیا پائی
وہ محل مٹی کا تو ہمارا دیکھی کیا۔ بارش بھی قسمی تو دھول کر دانیال کے کمرے کے صاف تھے۔ خٹک
کے قریب ہی ان میں مزہ اٹھانے کیے تھے۔ لیکن مسافر باؤں کے سوا کسی خاص کام کی طرف توجہ بھی
نہیں دیتی تھی۔

اس نے لاہور میں سے کچھ کتابیں نکالیں اور بلا ہر سکون ذہن کو مزید سکون دینے کے لیے رات
گزار دی کا پورا گرام بنانا۔

اس نے پیشے کے سامنے سے خود کو ہٹایا۔ بستر کیوں کے ڈیئر میں غرق ہو کر ایک کتب کھیل۔
دوسری پھر تیسری۔ لیکن افسوس اس نے غور کیا تو پیشہ ہوتی کتابوں میں سے ایک بھی کام کی نہیں تھی۔
پروین شاکر بھی اور اس کا چھوٹا کلام بھی ایک زمانے میں اس کو بہت پسند تھا لیکن اب اس کا ہر شعر بے
حقیقت لفظ ہے مسترد سارا۔

پھر اس نے مزید نازی اور ناصر کاظمی کو کھولا اور دیکھ کر دیا۔
تھوڑے دنوں میں چاروں کا نہیں تھا۔ جو کڑو بھی اندر تھی۔
باغیچہ کی اس ان تخلیق کاروں جتنا بڑا ظرف نہیں تھا۔ وہ اسے ہاتھ سے ان کی مندری چا سکتی تھی۔
نہ تو انہوں نے وارنٹوں کو سرکار میں نہیں کر سکتے تھے۔ نہ ان کو غصہ کر سکتی تھی۔
ہاں اس کو تو کئی کئی تھی۔

لیکن اس نے ان کی باتیں نہ کیں اور کھل دیں۔ کسی کسی وقت ہم خود سے اختیار بالکل کھولنے لگتے
ہیں۔ رات میں خوشیوں کا کٹاں نہ ہو۔

مثلاً کئی بھی چیز آج کی رات اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتی تھی کہ اس کا ذہن بار بار کی
ڈانٹ پٹائی اور تنبیہ کے پانچویں کراہی کی نام کی طرف جاتا تھا۔ وہ لڑکی جو کچھ بھی۔ امیر بھی بخود یا
وہاں گوی تھی۔ ایسی لڑکی کے ساتھ بھلا اس کا کیا مقابلہ ہو۔ وہ سب میں ہندوئی کی طرح کسی سزا یافتہ ورجن
کی مانند ایک چرچ میں قید کر دی گئی تھی۔ حالانکہ کسی سے بھی مقابلہ کرنا اچھی بات نہیں۔ اس نے
مذہب NUNS کی طرح منڈے اسکول کے سبق دہرائے۔ ہم اپنی تقدیر کو کسی خوشی برداشت کرنے
کے لیے پراہوتے ہیں۔ کسی کا مقدمہ روک دیکر کیسے حد کرتے ہیں اور وہ سرکف کھینچیں۔
وہ بھی کے لیے اچھی تو اچھی سوتی نہیں تھی۔ لیکن اس کا کامیاب بہادر مارک اس کے چہرے کے تمام
غیب چھپائے۔ ہلکی جلد کی کھانے میں مشغول تھا۔ رات کے سنانے میں نیچے بیسی کی طرف سے ٹین
کے گھنٹے بجتے اور دھن دھن دھن سے گولہ پھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خطیب مسجد میں مسلسل کچھ کہہ
رہے تھے۔

کیا؟ افسوس وہ جو پیشہ سے تامل تھی۔ پری خاموشی سے ان دو توبی کے درمیان ذرا سے قاصلے سے
نیچھی تھی۔ خستہ خان جلدی جلدی دودھ میں ڈوبی جلیبیاں اور ترتراتے تھے۔ میں کھینچے پراٹھے لے کر بھاگتا
ہوڑا پھر تھا۔ کچھ بھی بے کی اجازت سے پری ان کے درمیان آکر بیٹھ جاتی۔ ایک طرح سے اس کی
شیت پٹا سے محکم تھی کیونکہ وہ انیٹ کے بیچ کی بیٹی تھی۔ براہ راست ٹوٹھی کی ملازم نہیں تھی۔
آج کی رات بھی وہ سہمی کے لیے ان کے درمیان موجود تھی اور بار بار اس کی نگاہیں بیک بیک کی طرف جاتی
تھیں۔ اسے اپنے ارد گرد ان لوگوں سے ڈر لگا تھا جو اس کی رگ رگ سے آگاہ ہونے لگے تھے۔

اگلے دن روزہ ملائی کے طر پر اس نے سوئیٹ میں سے دو دو کمرے پورا ان سے ملحق اینڈر ہنڈ روم۔
ان میں شور بیاں زندگی (تقریباً نصف زندگی) کے سامان کی کٹہ فراہمی کا بندوبست کیا۔ لیکن خطا پہنچ چلنے
اور سامان زندگی تیار ہو چکے کے باوجود تالے کا دروازہ نہیں ہوا۔ اور اس دن صبح وہ مسافروں کی آمد سے بالکل
ماریس اپنی لڑکی سے چہرہ نظر آئے والے درختوں کے مناظر میں گہری شدید باؤس کا شکار ہو رہی تھی کہ
ایک ایک مٹن گھٹا ہر خصوص ہوائی ناز نے اطلاع دی کہ اس دشت کا افراد گھڑی میں بی بی خان کے ہاں بھی
تالے کی طرف داخل ہو رہے ہیں۔ جو پندرہ نہیں۔

کے بعد دیکھ کر جب جب محل میں اندر داخل ہوئیں تو عمارت میں جیسے ہلچل مچ گئی۔ اس آباد جانی اور بھگد میں جیسے کسی کو کچھ سانی نہیں دے رہا تھا۔

وہ بہت ساری چیزیں جن میں سے نمبر وہ جب کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اور پہچان کا یہی نمبر تھا جب گزری بھر کے لیے اس کا خدمت بدل رک سا گیا تھا۔ کپکپاتی بخسروی کا ایک لہر اس کی ریشہ کی بڑی کپار میں لگی۔ حالانکہ رہبری کا موسم کب کا زچ کا تھا اور درخت شکوفوں سے لدے پڑے تھے۔ ست سے افراد گھر سے باہر نکلے۔ ست سے افراد چپوں سے اترے۔

اور وہ باقی ماندہ افراد اور سامان کو چپوں سے اتارنے میں مدد دیتے تھے جو چلا تھیں مار کر چپ سے اتر آئے تھے۔ علاقے کی طرف میں گردن تھا تھا کر ان کو بے قابو کیے دے رہی تھی۔ وہ بہت سی عورتیں تھیں۔ بہت ہی خوش خرم لڑکیاں تھیں۔ بچے تھے۔ عورتیں۔ اور ان میں سب سے سب سے جد امب سے الگ۔ لیکن ان کے بالکل درمیان گروہ شخص جو سفر کی نکلنا تھا۔ سے بال ہٹا کر تار رہا تھا۔

ایک مدت بعد اس نے انہیں دکھا تھا لیکن کتنی دور سے۔ اور کتنا دھندلا۔ دھندلا۔ اچانک فضا میں کہیں سے گروہ غبار چھا گیا تھا۔ یا معلوم نہیں آنکھوں میں امن سے پانی نے سارے معطر دھندلا دیے تھے۔ انہوں نے بات کرتے کرتے ایک نظر اٹھا کر اس کے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔

یہ بھی اس کو شبہ نہ ہوا انہوں نے کھڑکی میں کھڑے اس کی طرف دیکھا۔ بے ساختگی میں اس نے سر جھکے کر لیا۔ حالانکہ اتنی دور سے اور کمرے کے اندر سے میں کسی کا نظر اٹانا ممکن کی بات تھی۔ اور شیوں کی blinds اس طرف سے کسی کو نظر بھی نہیں آسکتی تھی۔

ان کی نظریں اس کو تلاش بھی نہیں کر رہیں۔ یہ یہی بات ہے کہ کد تک۔ وہ اپنے مہمانوں کی موجودگی میں اسے خوش تھے کہ دنیا دہا سے بے خبر تھے۔ تھکے تھکے مسکراتے ایک ایک مہمان کو علیحدہ علیحدہ توجہ دے رہے تھے۔ ایسے میں اس کے کمرے کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھنا ایک اتفاقی عمل ہی ہو سکتا ہے۔

اس تجویز نے اس کو شعور سا مایوس کر دیا۔ اس نے پھر سر جھکا کر دیکھا۔ علاوہ انسانوں کے جم غفیر کے کچھ کے بھی ساتھ تھے۔ اسے کتوں کی لٹوں کی پہچان تھی۔ نہ شکلوں کی۔ لیکن اس کو اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ سب خوفناک خطرناک کتے تھے۔ سامان اور لوگوں کی تقسیم سے پہلے ہی کتے اور مرنے والے ہو گئے تھے۔

بچے شکوفوں سے لدے یاغوں میں ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑنے لگے۔ عورتوں اور لڑکیوں کے عجب میں عرو مہمان آہستہ آہستہ بیڑیاں چڑھنے لگے۔ یہ نہیں ان سب میں بدلے خشک کون سی ہوئی؟

شعور کی دیر کے لیے گھر کے پورے میں جو زندہ اور جاندار ہنگامہ برپا ہوا تھا آہستہ آہستہ مائید کر لیا۔ آخری آدمی اور آخری سامان تک وہ کھڑکی کے اندر سے بیٹھوں سے باہر کے مناظر کو جھانکتی اس وقت تک بکھرتی رہی جب تک پورے جالگل ہی خالی نہ ہو گیا۔

جیسے زمین کے پٹے جانے کے بعد پلیٹ فارم۔ مہاجر سوار کرانے والے اتارنے والے۔ خواہنے والے۔ محض خالی چھلکے اور دیوان کر دینے والے۔ نہ لے میں ان کا قلمی گروہ پورے بھی کسی چھوٹے

اسٹیشن کا پلیٹ فارم لگ رہا تھا۔ خالی اور دیوان۔ سارا ہنگامہ ساری رو لٹیں سمٹ کر کہیں جاتی تھیں۔ وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑکی سے ہٹ آئی۔

گھر کے باہر جتنا شور تھا گھر کے اندر اتنا ہی سا ناٹاری ہو گیا۔ معلوم نہیں وہ گھر کے کس کونے میں تھے اور کیا کر رہے تھے۔

وہ ان کے بارے میں زیادہ سوچ کر خود کو تھکانا نہیں چاہتی تھی لیکن سوچتے رہنے پر جیسے اس کا اختیار ہی نہیں رہا تھا۔

اس وقت وہ سب ٹیکری سے گزرتے ہوں گے اس وقت وہ لوگ اس جگہ کے پاس ہوں گے جو غصے اور تناؤ کے سارے رنگ اپنے چہرے پر سمیٹ کر آنے والوں کو خود سے خوف زدہ کروا رہا تھا۔ سب سے پہلے وہ لوگ بے بے کے پاس گئے ہوں گے۔

گھر کے بے کے بقول وہ بڑے خشک لوگوں کی ذات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن دایاں خان اپنے مہمانوں کو بے سے ملوانے ضرور لے گئے ہوں گے۔

تھوڑی دیر کے لیے اس کا بھی دل بھلا ہوا بھی تھا لگتی جائے اور ان سب کی ملاقات کا منظر خوش دلی سے دیکھنے کا شوق اس وقت وہ کوئی سیلانی ٹوپی اوڑھ کر ان کے درمیان جائے۔ وہ سب کو دیکھے لیکن اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ بندر میں مشہور خاموشی سے انتظار کرتی رہی۔

ہاں اب ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہو گا۔ مہمانوں کے داخل ہوتے ہی چائے کا اہتمام تو بوش و خروش سے شروع ہوتا گیا ہو گا۔ اگر اب تک چائے تک چکی ہوئی تو مہمانوں کو چائے کے لیے بلوایا جائے گا۔

”آپ کو چائے کے لیے بلوایا ہے۔“ پری نے دروازہ کھل کر جیسے روانی میں اعلان دیا تھا۔ وہ حیران کی گری پر تھی۔ وہی وہی اس کا مہمانوں سے رابطہ اس قدر واضح تھا۔ اس کو گم صم چپ سا دیکھ کر پری کو خیال ہوا شاید اس نے سنا نہیں۔ ”میں نے کہا آپ کو۔“

”ہاں پری۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مہمان کہاں ہیں؟ وہ کیا کرتے رہے ہیں اب تک؟“ ”کچھ بھی نہیں۔“ آپ کو اطلاع ہوئی؟ وہ ابھی ابھی آئے ہیں۔ سردار پہلے ان کو بے کے پاس لے گئے۔ اس دوران چائے کی تیاری ہو گئی ہے۔“

وہ اپنے کتھ پر تازاں سی کھڑی ہو گئی۔ ”کتے مہمان ہیں پری؟“ ”بہت زیادہ۔“ کل میں چھتیس اوگ تو ضرور ہوں گے۔ بلی بی۔“

وہ اچھے سی گئی۔ ”میرا وہاں جانا ضروری ہے پری؟ اگر نہیں نہ جاؤں تو کیا ہو؟“ ”بچا نہیں۔“ وہ رائے دینے سے بچنے لگی۔ ”آپ کو بے کے کہا تھا پندرہ منٹ تک چائے کے لیے آنا نہیں۔“

”یہ کوئی چائے کا وقت بھی تو نہیں۔“ وہ سیدھی کھڑی ہو کر شیشے کے سامنے آئی۔ اسے کوئی خاص کہیں نہیں تو تھا لیکن اتنے اہتمام سے اسے جج کر آنے والے لوگوں کے سامنے اسے خواہنا اپنی تمنا کی چیزیں ہی لگتی تھیں۔

اس نے بالوں کو درست کیا یا اس میں سینڈل کے تھکے یا مہمان کمرے میں پہنچ چکے ہیں؟

"اب تک تو پہنچ چکے ہوں گے۔"

وہ ہنسیا کرتا اس کے ساتھ چلا آئی۔ ابھی ابھی بال کے اس کو نے میں نے بے اور بیلا نے تیار ہونے کھولا تھا۔ اور اب گڑھی کی ساری روئیں سمٹ کر بال میں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ جی بھرتی داخل ہوئی تو کمرہ بھر بھر اٹھا۔

پھر بھی مہمان ابھی تک کمروں سے آ جا رہے تھے۔ موسم اتنا سرد نہیں رہا تھا۔ لیکن بے بے آتش دان سے بہت نزدیک بے شیار لوگوں کے ہجوم میں جھانپنے پر گھنٹوں کو آگ کی گرمی سے سینک رہی تھیں۔ اس کے اندر کے اجنبی اجنبی سے خوف نے اسی تھالی کا شکر بنایا۔ وہ تیزی سے چلتی آتش دان کے پاس ہی آئی۔ بے بے اس کو دیکھ کر کھل سی انھیں اسے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ اسی کی طرح کے کمرے ہمارے درجے کے مہمانوں کی پذیرائی کے لیے موجود ہیں۔ وہ جواباً "سکرا دی۔"

"آپ کے ہاں خوب روٹی ہے آج۔"

"ہاں۔ شاہ اندہ۔" ان کے چہرے پر خوشی کی سرخی دوڑ گئی۔

"آپ ان سب کو جانتی ہیں۔"

"سب کو تو نہیں۔" انہوں نے ایک نظر مجمع پر ڈالی۔ ان ہی کی نگاہ کے تعاقب میں اس نے ہال میں دیکھتے چہلوں اور جھٹکتے لوگوں کو دیکھا۔ لوگ گردوں میں تقسیم تھے۔ دو دو چار چار کے جھگڑے ہا کر وہ سب بہت خوش تھے اور خوشی کا اظہار وہ بلند بلند اور اونچے گھنٹوں سے کر رہے تھے۔ اسے بھی ان خوشیوں کا سراکت کرنا تھا۔ وہ بچہ سی اس کمرے کی خوشیوں کو بڑھتے دیکھتی رہی۔ انہیں دیکھنے والے لوگوں میں سے کسی نے اس کے ہاتھ میں بھی پیالی تھما دی تھی۔

مہمان آہستہ آہستہ کمرے میں آتے اور اپنی پسند کے لوگوں میں شامل ہو رہے تھے۔

لیکن ان سب میں وہ کہیں نہیں تھا۔ چائے کا گھونٹ بھرے اس کی نگاہ بار بار ہجوم کی طرف الجھتی لیکن وہ وہاں تک نہیں تھے۔ وہ ان کو پہچانتی بھی نہیں تھی۔ بے بے اپنے خیالوں میں غرا بہت دور پہنچی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں ان میں سے وہ لڑکی کون تھی۔ اسے ہر لڑکی کو دیکھ کر گرجہ گزرتا تھا۔ یہ کی ہے وہ۔ وہ سب ایک جہی تھیں۔ بہت زیادہ اچلی مٹی سنوری اور بچی ہوئی۔

گڑھی مٹی خان کا یہ ہال کسی باؤرن سوسائٹی کے سالن ہال سے مختلف نہیں لگ رہا تھا۔ بلند بائیک تھیں، شور پھگام، پیالی پرچ کی ٹھنک، پیچھے کا تینوں کا آجنگ ہال کی تمام آرائشی وغیرہ آرائشی روشنیوں میں دیکھتے ہوئے رنگین چہرے وہ فردا "فردا" ہر شخص کی شکل دیکھتی آنکھ جھکا لیتی۔

پھر آجنگ جیسے ہال میں روشن جلتے بلب بزم ہو گئے۔

اسے اس تصور کے بچکانہ پتہ نہ تھا اس کو بھی کسی سی آئی۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔ وہ اپنے دراز قدر کے ماتھے شکر اپٹوں سے مزین رات کی اس چائے کے لیے مکمل طور پر تیار تھے۔ رات کی ٹھنک اور سڑکی گرد کا ان کے سر تپا میں کہیں کوئی شائبہ نہیں تھا۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک اچھتی سی نظر ہال میں موجود مہمانوں پر ڈالی۔ وہ اپنی سی نظر پلار بھی پڑی اور گزر گئی۔

بہنشاہ۔ انہی۔ نامہاں نظر۔

جیسے بالوں کا سایہ دھوپ میں تپتی بستی پر ایک جیسا ٹکس پھیلا تا لے بھر میں گزر آ نکھل جاتا ہے۔ بیلا کا دل بے سہارہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا ان کی گھونٹی دھونڈتی نگاہ ایک لمحے کے لیے اس پر ضرور رکے گی۔ ان کے چہرے کی سنجیدگی اور آنکھوں کی سکراہٹ کوئی ایک فقرہ ضرور کہنا چاہے گی۔ خواہ اس فقرے کی طوالت ایک سینڈل ہی کی کیل نہ ہو۔

لیکن انہوں نے جیسے کسی کو ان سب میں کھوجا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی کسی اور کی تلاش کی تھی۔

حالانکہ وہ اس نظر کے لیے بھی تیار تھی اور اس سے ٹھنڈی نظر کے لیے بھی۔

لیکن پھر بھی جیسے سردی کی ٹھنڈی لہر اس کی ریڑ کی ہڈی کو کپکپاتی۔ اس نے چپکے سے بے بے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے دیکھ جانے کے اس لمحے میں اس کو پکڑا تو نہیں۔ وہ تو خود بھی غالباً "رو دیکھ جانے کے مسئلے سے گزر رہی تھیں۔"

وہ چند قدم اٹھا کر ہال کے مرکز میں ٹھکتے ٹھکتے غنٹوں کے نیچے آئے۔

پھر جیسے ان کو جس کی تلاش تھی اس کو انہوں نے پایا۔

ان کا چہرہ خوشی سے دھک اٹھا۔ وہ ہجوم میں جگہ بناتے مجمع کو چہرے سے لالہ پانی کی طعن جڑتے جا رہے تھے۔

اور ان کے رکتے قدموں کے تعاقب میں اس کا ہلکیاں انھیں۔

اور ان کے رکتے قدموں کے تعاقب میں جم گئیں۔

واقعی وہ ان سب سے جدا تھی اور ان میں سب سے نمایاں۔

ہنسی سکرائتی۔ موتوں ایسے لڑی دار انہوں کی چنگا ہٹ سے جیسے سب کچھ خیر ہو گیا۔ خود پہوگی کے سے انداز میں وہ ان کے سامنے رک کر کچھ کہہ رہی تھی۔

اتفاق سے ان کی اس طرف پشت تھی۔ وہ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ نہ سکتے کے باوجود سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

اب بیوی کی طرح جھکنا آئی آنکھوں نے کیا سا تھا جو بھلا میں بھی تھیں اور فقہ۔ بھی لگا اٹھی تھیں۔

راج جس ایسی غور سے تپ کر دن گیس وقت اس طرح تن سکتی ہے۔ وہ کون سے رس پکاتے فقرے ہیں جو آپ کے وجود کو یہ اعتماد اور تہاؤ بخشنے ہیں۔

پھر جیسے سارا منظر پلٹ گیا۔

کسی نے کرم چائے کی ایک اور پیالی اس کو پیش کی تھی۔ لیکن اس کے سنے گھونٹ کے بعد ہی وہ ایک

دوسرے میں گم ہو چکے تھے۔ وہ دونوں اب اپنے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ سب ساتھ آئے تھے لیکن شایہ مختلف جگہوں سے ان کا تعلق رہا تھا۔ وہ بہت ساری باتوں پر شدید حیرت کا اظہار

کرتے شدید خوشی کا شایہ پیدار کی۔ ان کے انداز میں ہر طرح کی شدت تھی۔

کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اس کی طرح اس اور پیچیدہ نہیں تھا۔ وہ سب خوشیاں اونٹنے لگے تھے۔

گڑھی مٹی خان میں خوشیاں دھونڈنے کی غرض سے آنا اور روٹی کمانے کے لیے آنے میں بہت فرق

ہے۔

اور یہ سارا نقصان ہمیں اس لیے اٹھانا پڑتا ہے کہ تم باریاد اس فرق کو بھلا دیتی ہو بیلا بیلا اس نے خود کو بوقت ٹوکا۔

”یہ رائیل کے دور پار کے عزیز ہیں۔“ بے بے نزدیک سے گزرے والے گروپ سے اس کا تعارف کراتے گئیں۔

”پہلے ہمارا خیال تھا اس کی بہن کو خان گل کے لئے بیٹھے کا۔ وہ جو نیلے کپڑوں والی ہے۔ آہاں۔“ بے بے نے تنبیہ کی۔

”گروڈن تمہارے بغیر دیکھو۔ رائیل خان اس بات پر خفا ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مہمانوں کو چڑا گھر کے جانوروں کی طرح نہیں دیکھنا چاہیے۔“

”زور یہ گلابی ساڑھی میں کون ہیں؟“ بے بے نے اپنی ہی کی گئی نصیحت بالکل بھلا کر آنکھیں سیکڑ کر اور اتارے پر ہاتھوں کا چھجکا کر غور سے دیکھا۔

”ارے ہال یہ تو رائیل کے کسی دوست کی بیٹی ہیں۔ رائیل کے تو دوست بھی اس کے باپ کی عمر کے ہوتے ہیں۔ اچھی ہے بے چاری میریں کے ساتھ پڑھتی تھی۔ پھر اس کی منتفی ہوئی اور یہ جو ساڑھی والی ہے۔ ہاں جس کی کمر کھلی ہوئی ہے۔ یہ عیلا۔ کی امی ہیں۔ ساتھ میں عیلا کی والدہ ہیں۔ ان کے ساتھ جو آدمی ہے ان کا مجھے نہیں جانتا۔ ہمارے ہاں تو قریبی عزیزوں میں بھی پردہ آری ہوتی ہے۔ میں کسی کو کیا پچاؤں؟“

غالباً آج کی یہ بے پروگی انہوں نے رائیل خان کے اصرار پر کی ہوگی۔

رائیل خان بڑے مہذب مہمان نواز تھے۔ اس بات کا اس محفل سے پہلے بھی پتا نہ چل سکتا تھا۔ وہ ایک ایک ڈش بڑے اصرار سے مہمانوں کے آگے لے لے کر پھر تھیں۔ بہت خوش تھے۔ معلوم نہیں کتنی مدت بعد ان کی اس ہستی میں یہ روح اتری تھی۔ اتنے بہت سے اور اتنے بے تحاشا قہقیرے اس سے پہلے اس نے نہیں سنے تھے۔

ان کے اٹنے پھرنے سے گھومتے رہنے سے باتیں کرنے سے بے تحاشا خوشی پکڑ پڑی تھی جیسے کسی کے بے حد خوبصورت ساتھ کا احساس آپ کے آنگ انگ میں مستی بھرتا ہے۔

وہ دلچسپ ٹھٹک کے آگے پیچھے تھے۔

تھوڑی سی توجہ۔ مہمانوں کو بے پناہ کے بعد پھر اس کے گرد مٹانے لگتے۔

یہ کتنی عجیب سی چیز ہے کہ ایک آدمی کا ساتھ ساری دنیا کی ساتھ سے اچھا لگتا ہے۔ دنیا کتنی حقیر کتنی بے مروت کتنی بے مہربانی ہے۔ اس وقت رائیل خان ان سارے واقعات کی تفسیر لگ رہے تھے۔

تھے ساری دنیا ہے بے نیاز ہو کر محض ایک شخص۔ ایک حلق۔

کتنی مرتبہ اس کو لے کر بلا کے نزدیک سے گزرے۔ کتنی مرتبہ وہ بلا کے نزدیک بھی کسی کسی پر بیٹھے کسی سے بات کی پھر اٹھ گئے ان کی بھی غلطی سے بھی نگاہ اس کی طرف نہیں اٹھی۔ وہ غالباً اس کے والہ وجود سے ہی بے خبر تھے۔

کبھی کبھی انسان اتنے بھوک میں خود کو کتنا اکیلا اکیلا محسوس کرتا ہے۔ کتنا دکھی دکھی سا۔

کاش کوئی سرگ ایسی ہوتی جو اسے بھگاتے بھگاتے کسی ایسی منزل پر لے جاتی جو اس کی اپنی منزل ہوتی۔

ہے جہاں اس کا انتظار ہوتا۔ جہاں اس کا احساس ہوتا۔

اس کی آنکھیں جھپک جھپک سی گئیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنا مقابلہ ان امیر کبیر خاندان سے کر کے خود کو ثابت دے۔ لیکن پتا نہیں کیوں باریاد اس کو ایسے لوگوں کے مقابل آنا پڑتا تھا جہاں اس کا وجود چھوڑنا پڑتا تھا حقیر سا ہو جانا۔

اس نے چپکے سے بے بے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کسی واقف عزیز سے کسی اور واقف عزیز کی بڑی تفصیلی خبر دریافت کر رہی تھیں۔

بے بے کی طرف تھا۔

وہ چپکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے بے کی اس بے پناہ مصروفیت میں اس نے دامن بچایا اور مہمانوں کے ڈھیر سے چپقل ہال کے دو مری طرف گئی۔

گواس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ وہاں ٹھہر سکی۔ ہاں نہیں کیوں اس کو احساس ہوا وہ تھوڑی دیر بھی ٹھہری تو خود پر قابو نہیں پاسکے گی۔ لیکن پھر بھی اس نے ہال دروازے سے نکلنے کے بجائے کونے سے نکلنے کو ترجیح دی۔ ہال کے مین دروازے سے نکلنے میں پکڑے جانے یا دیکھے جانے کا رعب تھا۔

وہ اپنے قدموں چلتی کونے والے دروازے سے باہر نکلی اور وہاں ہی دروازہ بند کر کے کھلے آسمان کے نیچے آگئی۔ ہال کا یہ دروازہ باربی کی کوئی غرض سے کھلے آسمان میں کھٹکا تھا۔ اپنے کمرے تک جانے کے لیے اس کو وہ بیڑیاں چڑھ کر مین گلیٹ کے سامنے سے گزرتا رہتا۔ لیکن یہ دروازہ اندر کے مقابلے میں باہر سے کم خراب تھا۔ اکا دکا نوکوں کے سوا اس طرف کسی کوئی توجہ نہ دیتی تھی۔ اس وقت جب ہال میں زندگی اتنی جان اور خوش رنگ تھی، کسے فرصت تھی کہ وہ کونوں کندروں میں چھپ کر کھائے والی لڑکی کا تعاقب کرے۔ اس نے قدم اٹھائے کہ سرگ سے بھاگ کر اپنے کمرے کی طرف نکل جائے کہ اس کو احساس ہوا جلد بازی میں کسا ہوا سینڈل اڑی سے اتر گیا ہے اس نے پاؤں میڑھی پر رکھ کر کھینکے ہوئے لے کر سرگ کا راہی جگہ پر کیا۔ احتیاطاً ”دو سرا سینڈل کسا۔ ہال کا مین گلیٹ کھول کر غالباً کوئی نوکریا پر آ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ کوئی اس سے کسی قسم کی باز پرس کرنا یا لے لے سوالوں میں الجھنا اس نے جلدی سے سدھار کر بھاگنے کی کی۔

یقین۔

سیدھی ہوتی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

وہ اس کے عین سامنے اس کے تمام تر اداوں کو ملبا میٹ کیے ڈٹے ہوئے تھے۔

بالکل اسی طرح جیسے اس نے انہیں ہال میں دیکھا تھا۔ مسرور، شادمان، اندر سے پھوٹی مسرور کے

بوجھ سے سرشار۔

اس کی آنکھیں جھپک جھپک سی ہو گئیں۔

”اسلام علیکم۔“ انہوں نے بڑی شادمانی سے اس کو پکارا۔ ”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ بڑا سا گولائین حلق کے درمیان انگ گیل۔

”تم نے اندر مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟“

ہو رہے تھے۔

اس نے فردا "بہت سے لوگوں کے بارے میں سوچا۔
وہ لڑکی جس کو خان گل کے لیے لگنے کا ارادہ تھا۔ چھوہارا وہ ملتوی کیوں ہو گیا۔ اس کے بارے میں
بے نے نہیں بتایا۔ اور وہ گلابی ساڑھی میں ملبوس بڑی سی عورت جس کی کمر بشت سے ایک پالشٹ بلاؤز
سے باہر تھی اور سیلوئس بازو منی ملبی ٹانگوں کی طرح کندھوں سے لٹک رہے تھے۔ وہ خاتون دانیال خان
کی ہونے والی ساس تھیں۔ بعض اوقات یہاں بندوں، بندش میں مل کر عجیب سے ہوجاتے ہیں۔ بظاہر
ایسا لگتا ہے جیسے ہم نے سو سائیکلی ان پابندیوں کو خوشی خوشی قبول کر لیا ہے۔ لیکن جس دن ہمیں ان کے
خلاف بغاوت کرنے کا موقع ملتا ہے ہم اس کا بڑا بھونڈا سا اظہار کرتے ہیں۔ دانیال خان نے بھی ان کے
بندشوں کے خلاف ٹھٹھک ہاؤس کی خواتین کا ساتھ قبول کر کے بے معنی سا اظہار کیا ہے۔ حالانکہ وہ انقلابی
گروپ کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ خود اس کو جھنڈا اٹھانے پر طعنہ کرتے سے باز نہیں آتے۔

اس کے ساتھ میں بری کی دی ہوئی لسٹ تھی جس میں مہمانوں کے کمروں کی ترتیب کے سلسلے میں خود
دانیال خان نے ہدایات جاری کی تھیں۔ کون سے کمرے میں کن لوگوں نے ٹھہرنا ہے۔ ان کے ساتھ کون
انٹرنیٹ ہے اور ضرورت کی کون سی چیز ہر حال میں ان کے کمرے میں موجود ہونی چاہیے۔
یہ لسٹ ہاتھ میں لیے رات ہونے سے پہلے جلدی جلدی ان کے کمروں کو فائنل کرتی پھر رہی تھی۔
مہمان ایک نظر گزری دیکھنے کے لیے پیدل نقل گئے۔ چونکہ وہ معزز اور تھیں مہمان تھے لہذا ہستی کے
قانون ان پر نافذ نہیں تھے۔ انہوں نے چلوں اور نہیں نہ علاقائی لباس پہنے۔ وہ جس طرح بیٹھے تھے
شور مچا لے آؤ۔ وہ کمرے ہاؤس میں نقل گئے۔ اس کو ایک مرتبہ معذرت مل گئی۔
کہ اس کے ساتھ میں لسٹ بھی اور اس کو مت جلد ضروری کام نمٹانے تھے۔
"ہاں ہاں واقعی۔" بے نے اس کی معذرت کو فرائضی سے قبول کر لیا۔ "تو مہمانوں کا کام نمٹانا
آسان تو نہیں اور دانیال خان کو کیا بے طے گا کہ اسے بہت سے لوگوں میں تم ہو کہ نہیں۔"
گویہ فقہوہ کو خوشگوار طریقے سے کانٹوں نے نہیں سنا۔ لیکن وہ چپ سی ہو گئی۔
دانیال خان کے آس پاس ان کے مہرہ دوستوں کے کمرے تھے۔
رہائشی حصوں میں خواتین تھیں اور ان سب کے ساتھ فوکر تھے۔ ہر ملہ خٹک کے کمرے میں میوزک
کا خاص انتظام تھا کیونکہ وہ رات کو بے سیدہ شپ سے بغیر سو نہیں سکتی تھی۔ اس کی قیمتی اور قیمتی نیند کے
لیے پیادور فل اوپلی فائر کا بندوبست تھا۔

وہ جب اپنے کمرے میں سونے کے لیے آئی تو مہمان اس وقت تک واپس نہیں آئے تھے۔ اور وہ
رات کو سونے کے لیے لٹی تو مہمان نے دی لاؤنچ میں غارت گری مچا رہے تھے خوشی، ہنگامہ، شور شراب،
گڑھی اتنی جوان اتنی ٹانہ دم بھی نہیں لگی تھی۔ جالے بی دی لاؤنچ میں اس وقت کون سا ہنگامہ برپا تھا۔
وہ فوری طور پر سو جانا چاہتی تھی۔ دور نہ سہمی پر جاننا دشوار ہو جاتا لیکن جب بھی اس نے آنکھیں بند کیں
رات جس ایسی گردن اور تڑپ سے جھٹکتے ہوا روانت جھلکا کر اس کی نیند تباہ کر دیتا۔ اس کو زندگی میں
بھی کسی سے خوف محسوس نہیں ہوا۔

یہ عجیب سے لمبے میں کیا ہوا شکوہ اس کا جی چاہا انہی کو واپس لوٹا دے۔ لیکن ایسی ابھی اس نے خود کو
بہت سے درس دیے تھے۔ اس میں شکوہ اپنی ذات کے لیے کچھ چھوٹا چھوٹا لگا۔
"ہوں۔؟"

"آپ بہت مصروف تھے۔ میں نے سوچا۔۔۔ وہ پھر انکس کی گئی۔"

"اور؟ اسے دن کیا کرتی رہیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔ بس روز کی طرح۔"

"روز کی طرح۔ کیا؟ لوگوں سے لڑتی رہیں۔ انقلاب کے لیے جھنڈا اٹھا کر جلوس نکالتی رہیں؟ اور
میرے پیچھے کھانا پینا بند کر دیا تھا؟ کتنی رسی ہو؟"

دانیال خان کے لیے کی اپنا ہیبت نے اس کو نرزا سا دیا تھا۔ کتنی دیر وہ ان کے چپکے ہوئے نظروں کی زندگی
خاموش کھڑی رہی۔

"کیا ہوا ہے؟ کچھ اداں ہو؟"

"نہیں تو۔"

"جھوٹ، پھر جھوٹ۔ میں نے آخری ملاقات میں جھوٹ کے بارے میں تم سے کیا بات کی تھی؟ بھول
گئیں۔ پھر نا؟"

"جہاں پھر کہتے ہیں واپس چلو۔ ابھی سب انجوائے کر رہے ہیں۔"

"میں جھٹکتی ہوں۔"

"اور افسوس بھی ہوں۔ کیا ہوا ہے؟ جہاؤ۔"

"کچھ بھی نہیں۔ افسوس تو نہیں ہوں۔"

"ہو۔ ہو تو افسوس۔" انہوں نے اسی کے سے سگین اور شد بھرے لیے میں حکم سے کہا۔ "صرف
میرے سامنے اعتراض کرنا نہیں چاہئیں۔ اور میں یہ اعتراف بھی کرنا سکتا ہوں لیکن صرف مجھے یہ خوف
ہے کہ جب تم جھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہو کی ڈوکی راہ پنا تھیں اس حالت میں وہ کچھ نہ لے اور میں تمہارا
یکہیت توڑنا نہیں چاہتا۔ فی الحال جاؤ اور سو لو۔ یہ میری خواہش ہے۔ اٹھاؤ اور حکم ہے کہ جب تک
میرے دوست مہمان موجود ہیں تم ان کی ہر بینگ میں شرکت کرو کی۔ ضدی لڑکی" وہ اسی طرح ایریوں پر
پلٹ کر دانیال خان میں گم ہو گئے۔

وہ پھر کے کسی بے جان جھٹکے کی طرح کتنی دیر ساکت سی کھڑی رہی۔

اندراہال خوب گرم تھا اور قہقہہ زار۔

باہر کی روشنی پر محض بھی بڑھتی جا رہی تھی اور ورنہ بھی۔

جب تک ان کے مہمان موجود ہیں اس کے لیے علم ہے کہ وہ ان کی دلجمعی سے غا طرو ارات کرے
گی۔

لیکن فی الحال انہوں نے اس کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔

اور آزادی یہی نعمت ہے۔ اس نے کئی نضا میں گھرے گھرے سانس لیے۔ کتنی دیر اس کھلے ہال
کے تنگ سے ماحول میں اس کا دم ٹھٹھنے لگا تھا۔ یہ شاید ہال میں موجود لوگ اس کے لیے غلی کا باعث

وہ عمر بھاری تھی اور تھالوی تھی۔ اور اب جیسے تھالوے رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

لیکن تھالوی میں یہ چھوٹے چھوٹے خوف انسان کو جیسے بھی نہیں دیتے۔ کیا ہے؟ اس نے تکیے پر جھٹ لیت کر سوچا۔ دنیا میں عدیلہ خٹک جیسی حسین اور پر اعتماد لڑکیاں اور بھی موجود ہیں بلکہ کچھ لڑکیاں تو عدیلہ خٹک سے بھی حسین رہی ہوں گی۔ وہ کسی بھی ایسی لڑکی سے حسد میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی تو بھین نہیں کر سکتی۔

وہ سوئی تو روشنیوں کے مسافر اندھری گلیوں سے واپس نہیں آئے تھے۔

روشنیوں میں بھٹک بھٹک کر اندھروں میں راستہ ملتا ہے۔

یہ شاید وہی لوگ تھے۔ خوشیاں ان کو دھونڈتی پھرتی ہیں اور وہ ہاتھ بھاڑے بے نیازی سے بھاگتے پھرتے ہیں۔

وہ سحری کے لیے آئی تو کڑھی کے ملازمین اور مہمانوں کے ساتھی ملازمین سحری کی نرے لیے کمروں کی طرف بھاگتے پھرتے رہے تھے۔ یہ بھی گڑھی کی روایتوں کا ایک حصہ تھا کہ سحری کے لیے تمام تیار سحری کے وقت کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ چارپانچ قسم کے سالن رات ہی کو تیار ہوتے اور اب تو بہت تاؤک مزاج مہمان کمروں میں برا بھلا تھے جن کو اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق کھانا سہا کیا جا رہا تھا۔ سادہ روٹی پر اٹھا، گوشت پر اٹھا، آٹھل گار اٹھا، کچی گار اٹھا، خاتون ہا ہر اچھا جتھے ان سے بھی بھول چوک نہ ہوئی۔

کھانے کے کمرے میں بے ہمتا اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

چشمہ مہمانوں کا روزہ بند رکھنے والا تھا۔ انہیں سخت ناپسند آ رہا تھا۔ ان کے بقول لوگ کڑھی میں سارا سال بھی روزہ رکھیں تو بیاس نہیں ستاتی۔ ہاں ہوں میں۔

روایتی کا کوئی قصہ ایسی سے سنائیں۔

”اور کسی سے کیا کہوں خود دانیال خان روزہ رکھتے پر آئیں گے تو روزانہ رکھتے جائیں گے۔ جب دل نہیں چاہے گا تو انہوں نے پڑے سوئے رہیں گے۔“

”کون کون رکھ رہا ہے روزہ؟“ اس نے بے پردائی سے چائے انڈیلنے پوچھا۔ وہ جانتی تھی یہ بے ہمتی کا پتہ یہ موضوع ہے۔ وہ نماز، روزہ، کچی بھی سلطے میں کو نامی پر باز پرس نہیں کرتیں لیکن ہاں ایک روزہ ان کا پس چلے تو بے روزہ دار کو میس چشمہ اصل کروا دیں۔

”کیا پتا ہے یہ یہ نیا رواج ہوا ہے۔ کمروں میں پھپھ کر سہا ہاں کھانے کا۔“

”کیا یہ مہمان عید تک ٹھہرے گے۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

”ہاں دانیال بتا رہے تھے یہ لوگ کڑھی میں رمضان اور عید کے لیے آئے ہیں۔“

گویا ایک مینہ تو کم از کم اس کو ہوا لٹک کر گزارا ہو گا۔ وہ مہمانوں کے مستقبل قیام سے بو بھلائی گئی تھی۔ یہ ان کے رشتہ جیسے تھے کہ مچ کوئی بھی جلدی نہ اٹھتا ہاں مگر ایک عدیلہ کی بھی وہ ہفت ہفتوں وزن گھٹانے کی فکر میں نہیں۔ روزوں کے درمیان تو وہ روزوں کرتیں۔ کچھ مہمان بے روزہ دار تھے۔ ان کا ہشتا بھی ان پر تھے تیار ہوا پھر کسی پکک کی تیاری میں نکل کھڑے ہوئے۔

اس نے اپنے کمرے کی ضروری چیزیں سنوارتے دیکھا۔ وہ سب کے سب پورچ میں جمع تھے اور کہیں

جانے کے لیے شورو سے بحث کے چارے تھے۔ اور ان میں سب سے الگ تھلک اور جدا دانیال خان لاہروائی سے نیچے گھری وادی میں کسی غیر مرئی شے کی کھن میں ان سب باتوں سے بے نیاز تھے۔

ان کے کندھے کے ساتھ لگے دوسرے کندھے پر عدیلہ خٹک کا پرس تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے بھی ایک دوسرے سے کتنے اجنبی، کتنے دور لگ رہے تھے ایک مرتبہ عدیلہ نے پلٹ کر ان سے کوئی بات کی لیکن ”عالیبا“ موجود نہیں تھے۔ ہر مرتبہ چونک کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا پھر بے دھیانی سے وادی میں دیکھتے کچھ سوچتے رہے اسے یہ تجربہ ہوا اچھا لگا۔

وہ کئی اوپر سے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سب کے سب دیکھے جا رہے تھے لیکن اس بات سے بے خبر کہ ان کو اس طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ کمروں میں تقسیم تھے اپنی پسند اور اپنی مرضی کے لوگوں کے چھ قفسے دیکھتے تھے مگر اتنے زنت نے پروگرام بناتے اور خوشی خوشی پروگراموں میں شریک ہوتے۔

پھر ہاری یاد میں آکر کھڑی ہونے لگیں۔ سواریاں اپنی مرضی سے سواری پر بند کر کے اگلی پچھلی سیٹوں کو روٹی پھیل رہی تھیں۔ یہ بڑا بڑا نظر راستہ تھا۔ یہاں صرف میس کے ذرا نیور گاڑی چلاتے تھے اس نے دیکھا آہستہ آہستہ تمام لوگ مختلف حصوں میں شخص شخص کر بھر چکے تھے۔ ہاں سوائے ایک دانیال خان کے جو رسم مہمان داری نبھانے آخری مہمان تک تھا اور اگلے کھڑے رہے لیکن اگلے عجب میزبان کے مہمانوں کے وجود سے بے خبر جیسے کسی آلے والی خوش قسمت گھڑی کے انتظار میں وقت کاٹ رہے تھے۔

حالا کدو خوش نصیب گھڑی ان کے نزدیک تھی۔ وہ گردن اٹھائے ان کے نزدیک آئی گویا بات بھی کی۔ ”عالیبا“ یہی تم نہیں بھٹو گے۔“

انہوں نے مز کرکچھ کہا تھا۔ (ہاں تم بھٹو)

اگلی گاڑیاں آہستہ آہستہ گھٹے کو چلنے والے پھاٹک کی طرف چل پڑیں۔ عدیلہ خٹک کی گاڑی سے ہارن دیا جا رہا تھا لیکن وہ اسی طرح کھڑے تھے چپ چاپ اور خاموش۔ پھر جیسے کسی فیصلہ کن گھڑی میں انہوں نے ہاتھ میں پکڑا جھوٹا سا پتھر جھپٹا کر وادی میں پھینکا۔ کتنی دیر سکوت میں اس کو پتھر کے گرنے گرنے رہنے کی غیر محسوس آواز کانوں میں آتی رہی۔ حالانکہ سب سواریاں زور شور سے ہارن دیتی موزکاتی اور تھامی پیدا کرتی کھٹے سے کھٹے چلی گئیں۔

وہ چپ چاپ اپنی کڑھی سے دیکھتی رہی۔

کبھی کبھی ہمیں بڑا عجیب سا تصور آتا ہے اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔

اس کو لگا وہ دانیال خان کے ہاتھ میں پکڑا ایک حقیر سا پتھر تھی جسے وہ اپنی دانست میں حقارت سے وادی میں پھینک کر خوشیوں کی تلاش میں روانہ ہو چکے تھے۔

کتنی دفعہ اس کا جی چھلا۔ وہ دوڑتی جائے اور خوشیاں منانے اس قافلے میں شامل ہو کر زندگی کے ہنرے مولنے اپنا حق طلب کر لے۔

لیکن زندگی پر اس کا اقتدار نہیں تھا۔

وہ ان میں سے نہیں تھی۔ ان سب کا رہن سہن ان کا کچھ زبان، یک گراؤ نہ شاید اب تو کچھ بھی مشاہیر نہیں تھا۔ دنیا میں جوان کو بہترین رفقت مل سکتی تھی۔ وہ انہوں نے تلاش کر لی تھی۔ اب

اپنے آپ کو وہ اتنا کم ہوا، اتنا حقیر تو نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے تھے دن بھر کے لیے گئے تھے۔ یہ بات اس کو کسی نے نہیں بتائی لیکن بھینکی تھی۔ لیکن جب وہاں میں ان کی روانگی اس بات کی نظر تھی کہ وہ آریاس نہیں کہیں دور گئے ہیں۔ اب اس کے پاس وہ افرقت تھا وہ قیدی کی کپاس جاتی تو پکڑے جانے کا رسک تھا۔ کمرے میں بیٹھی رہتی تو اپنی ذات سے وابستہ انجمنیں برومٹی رہتیں۔ ہاں البتہ ایک شخصیت اس عظیم الشان اور دیوبند کل عمارت میں ایسی بھی تھی جو اس کی طرح خود کو تنہا اکیلا اور روشمرہ سمجھ رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ بے بے کپاس جاتی تھی۔ ”مرے“ وہ چونک کر کہیں۔ ”تم نہیں سنیں گے تو بتا دیتا تھا سب جا رہے ہیں۔“ ”جی ہاں۔ شاید سب جگہ گئے ہوں۔ کوئی خاص کام تو نہیں؟“ ”کام کون سا کام؟ ارے ایسا کون سا خاص کام؟ تم ان کے ساتھ گئیں کیوں نہیں؟“ ”روزے کی وجہ سے شاید۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”یہ شاید مجھے ان کے ساتھ جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں کیا کرتی جا کر؟“ ”ہم نہیں کس بات پر انیال خان سے ڈرنا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گی۔“ ”جی ہاں۔ اس کو جھوٹا اہمیت ہی ہوئی۔ وانیال خان نے بیشہ اس کی طرف سے فیصلہ خود ہی کر لیا اور خود ہی سمجھ لیا کہ اس پر عمل در آور بھی ہوگا۔ سیرکیف یہ چنگ اس کی روزگار کی ذمہ داریوں میں سے تو نہیں تھی۔ کہ وانیال خان خود فیصلہ کر لیں۔ بے ناموشی سے ہال کے کونے میں اپنی مخصوص مصروفیت کا شکار تھیں۔ وہ چپ چاپ ان کے پاس بھی ہال کے کنارے ہواؤں پر غور کرتی رہی۔ گزشتہ رات ہال ایک شور مچا تھا۔ اسے بڑے ہال کا ایک ایک کونا مصروف اور ایک ایک کنارہ کسی خوشگوار سی مصروفیت میں مگر تھا۔ پھر اچانک یہاں جانا چھوڑا۔ اور اس شور مچاتے کودتے ہال کے ایک کونے میں آخر وہی دونوں تھیں۔ خاموش اور سنجیدہ، پتا نہیں خاموشی اور طوفان کے یہ اتار چڑھاؤ اس گھر میں کب تک رہیں گے؟

افتخاری کے لیے آج کوئی خاص اجتماع نہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ سماںوں میں سے ہوائیں ایکساں آؤں میں کی آج سا لگہ بھگ اور سا لگہ کا وانیال ان میں سے کسی کو یاد آگیا تھا۔ افتخاری کا اجتماع تو بڑا ذات، خود ایک سا لگہ کاؤز لگتا تھا جس میں موم بیڑوں اور ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ خستہ خان کے باہر انھوں نے کئی منزلہ ایک بیک کیا۔ اور لوگ مختلف کردہ پلوں میں بیٹھ کر شام کے پروگرام تشکیل دیتے تھے۔ میوزیکل چیزیں۔

بارسل میس۔

غبار چٹائی کا مقابلہ۔

بے بے نے اس کے کمرے میں پیغام بھجوایا تھا کہ کسی مہمان کی آج سا لگہ ہے لہذا تم فوراً ہال میں آ جاؤ۔ معلوم نہیں اس فوری بلا سے بے بے کا قصہ کیا تھا۔ وہ ہال کی حیثیت سے منظم ہوتی جا رہی تھی یا مہمان کی حیثیت سے۔

200

اس نے اپنی ذات کو ایک مٹھین کی طرح ذوالحال کیا تھا۔ سب تک مہمان ہیں، کبھی کسی وقت بھی اس کا بلاؤ آسکتا ہے۔ اس نے بالوں کو سادگی سے ریڈیو میز میں کس کر جو گر جھانپے ہو سکتا ہے کوئی بہت اہم کام اس کو بھی سرا جہاں نہ ہو۔ روز بھلنے میں گولہ پھینکنے میں بہت تھوڑی سی دیر باقی تھی۔ ہال میں حج خوانین و حضرات میں بڑا جوش غروش پایا جاتا تھا۔ وہ سب کے سب کسی خاص کیم کی تشکیل میں بڑی محنت صرف کر رہے تھے اس نے اوپر اوپر نظر دوڑائی۔ وہ خود تو بے بے کے ایک حکم پر دوڑتی یہاں تک آگئی تھی لیکن بے بے یہاں نہیں کہاں تھیں۔ اس نے ان کو ان کے ہر مخصوص آتش دان کے پاس بھاٹکا۔

پہلا دو سرا، تیسرا، پھر وہ رک بی گئی۔

تیسرے آتش دان کے پاس بیٹھے جوڑے کو وہ ہزاروں میں سے پہچان سکتی تھی۔

اگلے ہوئے نف وائے کندھوں کے خوبصورت سفید باجی آتش دان کی کمری سے گلابی گلابی ہو رہے تھے۔ وہ بے بے کی مخصوص جگہ کی کئی پر خوشنما سے بے رسی تھی۔ جب مخاطب آپ کی ہر بات میں کچھ لیتا جو جب آپ کا کہا ہر لفظ ہیرا اور اس کے لیے پسندیدہ ہو اور آپ کو اس کا علم بھی ہو تو گفتگو کی پھر اور خود بخود رتی رتی ہے۔ اچھے اچھے الفاظ خوبصورت ذرائع برداشتہ جوابات۔

مدیٹھ خٹک گفتگو کے ہر فن سے بالامال تھی۔

شاید اسی لیے مخاطب کا دل اوستے لیے جاری تھی۔

وہ بے بے کی کونج میں نزدیک سے گزری اور رک گئی۔

تھوڑی دیر کے لیے صراحی سے انڈی ٹیپائی کی طرح اس کا نقشہ قفل کرنا کو نجا۔ لیکن پھر اچانک اس کے چہرے پر غرت سی گئی۔

”کیا ہم لوگ ان کی سید شریں بیٹھے؟“ اس نے آہستگی سے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا تھا۔

بہت دیر سے بے بے کے سکر اتے اور آگ کے شعلوں پر نظریں جمائے وانیال خن چونک گئے۔

”اے!“ انہوں نے چونک کر مخاطب کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ اور اس کے کھڑے ہونے میں وہ کون سا نام از تھا۔ کون سا رنگ تھا جس نے ایک ناخندانہ کی چمک ان کے چہرے پر بھی پیدا کر دی۔

وہ کون سا مہراں ان حیات آئے تھے۔

کئی کو شکست دے کر حاصل ہونے والی خوشی کا ہر رنگ ان کا چہرہ اجاگر رہا تھا۔

انہوں نے شکست دی تھی کون سا میدان جیتا تھا۔ یہ کچھ ان کے چہرے پر تحریر تھا۔

اس کی آنکھوں میں کتنی دیر تک ان کی نگاہوں کی تیزی حاکم رہی۔ پھر انہوں نے جس تیزی سے سر اٹھایا تھا اسی تیزی سے واپس کر لیا۔ وہ چہرے پر کبھی تحریریں سمائی سے دھننے نہیں دیتے تھے۔

وہ بھی کھلے میدان میں نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے بھی اپنا رخ جہاں بھی ممکن نظر آیا اور جہاں بھی گھرایا۔ مہمان خوانین میں سے کسی نے اس کا رخ اپنی طرف مگوستا کچھ کر دانی سے مستحکم کا سلسلہ چھیڑ دیا تھا۔ وہ

جانتی تھی یہ بدلے غور و غمی ہو رہی تھیں اور اسے بہت بھولی اور بچے کی طرح معصوم ہوتی ہیں۔

”یہ کون ہے وانیال؟“ آتش دان کے پاس سے آئی آواز میں شک کا سانپ سر سرایا تھا۔

اس نے کتنی دیر کان لگا کر سننے کی کوشش کی وانیال خان کیا جواب دیں گے۔

201

”ہمارے گھر میں ملازمت کرتی ہیں۔ یہ اس گھر کی مستقل ملازمہ ہیں۔ یا یہ کہ ان کو بے پے کی ملازمت کے لیے بلا لیا گیا ہے۔“

وہ بوڑھی خاتون اس سے لاس لگاس کے بارے میں باتیں کر کے معلومات میں اضافہ کر رہی تھیں۔ لیکن انہوں نے اپنی عادت کے بالکل برعکس ان کی طرف متوجہ نہیں ہو سکی۔ اس کے کان و انیال خانہ کے جواب کی طرف لگے تھے۔

”آپ ان کی سیٹ پر کیوں بیٹھ گئے۔ یہاں تو وہ بیٹھی تھیں۔“ سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز پھر اٹھی ہوئی جواب میں سناتے رہا۔

”آپ ایسے کیوں بول رہے ہیں؟“

وہ کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ کاش وہ کچھ کہہ سکتی۔

”بہ ہلہ۔“ بھاتی دونوں ایک لڑکی نے جیسے آتش وان کے پاس کی ساری فضا کا اسرار لپیٹ کر لیا۔

”میں نے تیاری کر لی۔“ اس کے ہاتھ میں رنگین کانڈوں کا ایک پلندہ تھا۔

”نیک نوجوان راسل ہم شروع ہو گیا۔ آواز کہ گرم کوئی بھانسی کی کوشش نہ کرے۔ میں نے بہت محنت کی ہے۔“ وہ راسل لڑکی ہال کے اس کونے تک بھاتی اعلان کرتی تھی۔

”یہ جملہ کیسی جھڑپ ہے؟“

”ہاں اس عمر میں لڑکیاں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں۔“

”چھو! آپ جاگ گئے۔“ قہقہہ کرتے ہوئے پھر صراحتی ایسی کر دیا۔ آواز ہول۔

اس نے لڑکی کا کھلکھلا کر ہنسا دیا اچھا لگتا تھا۔ اس کا ہر ہر انداز زندگی سے بھرپور اور صاف تھا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ دانیال خان کی بہت سی باتیں بہت عجیب رنگ لیے ہوئی ہیں۔ لیکن بعد میں وہ اس کے ہال کھڑے رہنے پر بازو اس شہرے کوڑے۔

روزہ اور سالگرہ کی رسم ساتھ ہی ہوتی۔

بے بے افکار کے وقت آئیں۔ بہت تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ نماز کے لیے چلی گئیں۔ پھر ان کی معذرت آگئی۔ وہ اس محفل میں شریک نہیں ہو سکیں گی۔ ان کے سر میں سخت درد ہے ہاں البتہ بٹاکے لیے حکم ہے کہ اگر اس کی طبیعت ٹھیک ہو تو وہ سر شام محفل چھوڑ کر نہ اٹھ جائے۔

اس نے سخت ناگواری سے محفل کی طرف دیکھا۔

اس کی طبیعت تو خراب نہیں تھی لیکن اس محفل کو برداشت کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ ہال میں فری نشست کے لیے کھن اور ٹیکے پر بیک بیک کر بیٹھا رہے تھے۔

”کیوں پری؟ آخر بے پے نہ یہ کیوں کہا ہے کہ میں اس محفل سے اٹھ کر نہ جاؤں۔“

”وہ کہتی ہیں کہ آپ محفل کی دعوت میں حصہ لے لیا جائے۔“

اس نے پلٹ کر محفل اور اس کی رونق کو دیکھا۔ لوگ ہلکے ہلکے دوڑنے دوڑنے نشیں بنیال رہے تھے۔ ہر دم ایسے دینے رہے والے اور جھماڑے چھٹ کاموڑی شخص بھی اس وقت محفل میں موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ مہمان اور رنگ بند کی حیثیت سے اس کو مرکزی نشست ملی تھی۔

”ہر ایک کو مزہ پوری کرنا پڑے گی۔ آپ بھی سن لیں دانیال بھائی۔“

”ہم تو پہلے ہی سزا بھگت رہے ہیں جناب۔“ ان کے لہجے کی معنی خیزی ہال میں موجود کسی سے چھپی نہ رہی۔

”تمہارے وہ کر آئے والے افراد اپنی نشستیں سنبھال لیں۔“

حرار کی طبیعت کے باوجود جن لوگوں کو اس محفل سے دلچسپی نہیں تھی وہ نہیں آئے۔

وہ ایک طرف کھڑی خاموشی سے دانیال کے راستے اپنا رخ کر گئی۔

ہال میں ہنگامہ مروج نہ تھا۔ ہر شخص اپنی بول بول رہا تھا۔ وہ کسی بھی دروازے سے باہر نکل جائے اس کو کون پوچھے گا؟

جست سے فرش تک بلند پردوں کے پیچھے چھپی۔ وہ بے پے کی یا پری کی سمرای کی کسی کی بھی نصیحت سننے کے موافق نہ تھی۔

پردوں کے پیچھے جمو اور آواز اس کے ہاتھ بٹھا کر کہنے سے پہلے بلند ہو گیا۔

”یہ راستہ سخن کی طرف جاتا ہے۔ آپ کے کمرے کو دروازہ مٹ کرے گا۔“

یہ آواز۔ یہ لہجہ۔ بلاشبہ اس کو پہچانی تو نہ تھی۔

اس نے بے ساختگی میں پردے چر کر درمیان سے سر نکال لیا۔

”خان بھل۔ تم کب آئے؟“ اس نے تو نہیں دیکھا بھی نہیں۔

”پری نے آپ کو بے پے کا نہیں میرا ہی پیغام دیا تھا۔ ویسے بھی آپ کی پسند کے لوگ ہال میں موجود ہوں تو ہم نظریہ کہاں آتے ہیں۔“ وہ اپنی طبیعت کے مخصوص انداز میں رہا تھا۔

بٹاکے کی پوری پوری خوشی جاگ اٹھی۔ اچانک اس کو لگا۔ اچھی اچھی بناوٹ اور روکھا روکھا ہال اس کا ساتھی بن گیا ہے۔ وہ اس کا ہر دروست ناخو گوار محو میں خوشی بخشے والا چلنے کے ہال سے آیا تھا۔ کہاں سے ٹکرا تھا۔ لیکن اب یہاں تھا اس جست کے نیچے۔ ”آپ کیسی ہیں؟“

”آؤ لوگ پارسل تحیم بھیج رہے ہیں۔ تم شرکت کرو گے؟“

اس نے ایک طائرانہ سی نظریہ پر ڈالی۔

”خاندانہ یہاں تو دانیال خان کے دروازوں کا میل لگتا ہے۔ میرا یہاں کیا کام؟“

”میں بھی یہاں موجود ہوں۔ حالانکہ میں تو دانیال خان کے دروازوں میں سے نہیں۔“

”لیکن آپ بھلا بھی تو رہی ہیں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی دی۔ ”آپ نہیں بھاگوں گی۔“

”وعدہ؟“ اس نے اپنا اچھا اور انداز بالکل بدل دیا۔ ”ہمیشہ کے لیے۔“

”کیوں نہیں۔“

”آپ لوگ دروازے پر ہی کھڑے رہیں گے؟“ دانیال خان کا مرسا لہجہ اس کی پشت سے ابھر کر اس کو کچکا گیا۔

”میں ان کو باہر نکلنے سے روک رہا تھا۔“ وہ جواباً سنس دیا۔

”شاید ان کو روکنا اب مشکل نہ ہو۔“ اس کا انداز غلط نہیں تھا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مل چکے تھے وہی لاطم تھی۔ سلوم نہیں ماسی کو کہا کیوں نہیں پہتا۔ اس گھر میں کیا ہوتا ہے کہ ہوجاتا ہے۔

وہ ہنس دی۔ خواجہ جی۔ بھی بھی جی چاہتا ہے پونہ ہتے رہے۔ اس نے لہجہ بھر کے لیے ان کی معنی خیزی پر غور کیا تھا لیکن پھر بات چلی گئی۔

وعدہ کیا تھا۔ جب تک میرے مہمان یہاں رہیں گے تم ان کو کبھی ضرور دو گی۔ میری قدر افزائی کے طور
سے۔ ضروری نہیں کہ مہمانوں کو تھماری ضرورت ہو۔ یہ ضرورت کسی اور کو ہو سکتی ہے، مجھے بھی ہو سکتی
ہے یا نہیں ہو سکتی۔“
وہ ایک دم لٹک گئی۔

دانیال خان کشادہ دوا زبانی کی پوچھت سے ٹھیک لگے جیسے اس کی بکھری ہوئی قلوبان طبیعت سے کوئی
نیا رنگ کھینچ رہے تھے۔ جس جھوم میں شمولیت کرنے کے لیے انہوں نے یہ سنگین دلائل دیے تھے
بیسیدوں الجھان میں کی تھیں۔ اس سے قطعی رخ موڑے وہ ایک نہایت غیر اہم ممبر پر اپنا وقت برباد کر رہے
تھے۔

”تم ریاکار اپنے وعدے کو توڑتی ہو۔“ ان کی آواز میں افسوس کا سا شائبہ تھا جیسے آج وہ اس کو اس کی
ساری غلطیوں کا احساس دلا کر ہی رہ جائیں گے خواہ جھوم میں قیامت آجائے
اور جھوم۔

حمرائے جوش و خروش سے پچھلے ہوئے رہی دھاگوں میں الجھا پھول ایسے کھل کے شروع ہوئے
کا شہر قلعہ وہ سب کے سب اونچی آواز میں چلائے ایک دوسرے سے اچھے بے ایمانوں کے الزامات
لگاتے کھلے طور پر ایک دوسرے میں کم تھے۔ سوا اس حسین لڑکی کے جس کی گردن کا خوبصورت خم اور
ڈانٹنے کے ٹاپس والے کانوں کی پوری توجہ اس دوروازے کی طرف تھی جہاں ایک ہی منظر جیسے رک گیا
تھا۔ ہاں وہ اس جیسی تو ہرگز نہیں اس نے لباسا سانس کھینچ کر جیسے کا سارا ٹھنڈا رو دیا۔ پھر بے جا
مقابلہ بازی انسان کو خود ہی بچا رکھنے لگتی ہے۔ وہ کسی سے نیچے نہ جانے میں ذرتی تو نہیں تھی۔ لیکن
اس نے گئے مقابلے میں دانیال خان خواجہ اس کی دلہی کی خاطر ڈالتے رہتے تھے وہ ابھی تک اس کے
ذہن سے اٹھتے تھے۔

وہ اس کو حکم بھی دے سکتے تھے۔ زبردستی بھی کر سکتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان حکم اور زبردستی کے
رشتہ کی کیا مثالیں ہیں وہ ان اختیارات کے استعمال کے بجائے نہایت دوستانہ ڈیل کر رہے تھے۔
”سورہ“ وہ خفیہ سی ہو گئی۔

”واضحیٰ میں نے لوگوں کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ آئی ایم سوری۔“
”غیر لوگوں کے بارے میں تو آپ ضرورت سے زیادہ ہی سوچتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم وہ لوگ نہیں۔
نہ کی خاطر آپ اعلانِ انحلت کریں۔ ہنگامہ چھیلوس۔ چلے خیر آپ نے احساس تو کیا۔“
اس نے دروازے کے درمیان سے دیکھا۔

خان گل کے داخلے سے جھوم میں نیا دلولہ اُگیا تھا۔ لوگ اس کو گھرے شکوے دکھانوں کی لمبی نمایاں
نہ رہے تھے۔ حمرائے جوش و خروش میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان ایک ایسا شخص آہٹھا تھا
س نے محفل کا سر ہی بدل ڈالا تھا۔ بڑوں میں بچوں والا خروش تھا۔ منٹ منٹ پر غصہ ایک دوسرے پر
پڑتا۔ حتیٰ کہ جگہ کی پیمندگی کے لیے لگتا تھا۔ ابھی ایک دو قس ہوں گے اور لاشیں تڑپتی نظر آئیں گی۔
یہ خان گل کا کمال تھا۔ اس کو لوگوں کی خاطر خروش ہونا آتا ہے۔ وہ لوگوں کو خوش کرنا بھی جانتا ہے۔ اور
لگتی اچھی سی سوچ ہے کہ ایسا اچھا آدمی آپ کا دوست ہے۔ اسے آپ کی دست پر ہے۔

خان گل بروں کے پیچھے نمودار ہوا۔ تو جھوم نے نچھاور کر اس کی آنکھوں ہاتھ لیا۔
اس کو برا اچھا لگا۔ اگر آپ کی پسندیدہ شخصیت اوروں کو بھی پسند ہو تو پھر ہر سیاسی لیڈر ہی بن جاتی
ہے لیکن ہر ایک اچھی ہوتی ہے۔

”اب تو آپ ٹھہریں گی۔“ ان کی مسکراہٹ بڑی شفاف بڑی وسیع تھی لیکن ہاتھ نہیں کیوں اس کو
احساس ہوا ان کی آنکھوں سے لگا سا زہر اتر رہا ہے۔

”خاشاؤ کی۔“ میری یہ خواہش بھی نہیں رہی کہ آپ میری راجوں میں سے ہوں۔ لیکن مجھے یہ بلا جی
ضرور تھی کہ آپ میری کسی معمولی خواہش کا احترام کریں گی۔ لیکن آپ نے وہ نون مرتبہ اسے رد کر کے
اچھا کیا۔ میں مخالف طے میں نہ تپا پسند نہیں کرتا۔ تشرف لے لے لے اب آپ پور نہیں ہوں گی۔“ انہوں
نے ہاتھ پھیلا کر اسے راستہ دیا۔

ان کے لیے کی کڑا ہٹ نے کچھ بھر ملے کی ساری خوشی کر کر کی۔ اس کا جی پاپا وہ جھنڈا جھنڈا کر
چنے چلائے انہیں برا بھلا خانے کیا وہ اس کی یہ معمولی سی خوشی بھی برداشت نہیں کر پاتے۔ یہ دتی
فحش تھے تھوڑا اس کو جھوم میں ادکات دے کر بھول بیٹھا تھا۔

”لیکن آپ تو خوش تھے نا۔ آپ کے پاس آپ کی پسندیدہ ترین شخصیت بیٹھی تھیں۔ اور آپ۔“
اس نے فحش اور اچھوڑ دیا۔ اس کا خیال تھا وہ ہاتھ کھرا کر اس کو تھمنا روکے گا۔

لیکن ان کے چہرے کے سارے رنگ ایک دھندل گئے۔
”ہاں خوش تو ہیں تھا۔“ انہوں نے الفاظ چاچا کر کے۔

”میرے ارد گرد میری پسندیدہ شخصیات؟“ جیسے انہوں نے خود کو بھی یقین دلایا۔ ”چلو یہ بھی مان لیا۔
اب آپ اپنی طرف آنیں۔ کیا یہ جائز اور مناسب ہے کہ جب ایک چہرے کے نیچے بہت سارے لوگ
آپ کے ساتھ کے لیے ٹھہر رہے ہیں۔ جب وہ خوشیوں کو آپ کے ساتھ بانٹنا چاہتے ہیں تو آپ انہیں قطعی
رد کر کے اور مرموز بازی سے انہیں کھپٹی جائیں؟“

اس نے کوئی نہ کھانا جواب دینے کے لیے سر اٹھایا ہی تھا کہ انہوں نے اسی رو میں اس کا فقر وادی طرح
کاٹ دیا۔

”بھی بھی انسان دو سروں کو خوش رکھنے کی خاطر بھی نہیں کر کو کھاتا ہے۔“
”میرے خوش یا ادا اس ہونے سے محفل کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اس نے رہم سے قنوطی لہجے میں
کہا۔ ”میں ویسے بھی ٹھیک کئی ہوں اور مجھے حشری کے لیے دوبارہ اٹھنا ہے۔“

وہ اس کے ساتھ ہونے لایس سے چہرے کو ایک نظر دیکھتے رہے۔
”یہ کیا بات ہوئی؟ یہ تو تین مختلف دلائل ہیں۔ اور آپس میں ملے بھی نہیں۔ اب کیا مصیبت آئی
ہے؟“ اس نے خاموشی سے سر نیچے کر لیا۔ ”بھی اسے خوف محسوس ہوا تھا جیسے ان کی عتاب کی سی تیز نگاہ
اس کی آنکھوں سے اتر کر اندر تک چھو کر رہی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے اسرار عام بھی نہیں کرنا چاہتی
تھی۔“

”افسوس۔“ نے گھرے پچھتاوے سے کہا۔ ”تم بیٹ جھوم میں ہونے کا کاندہ اٹھاتی ہو۔ ورنہ ان
بایوس بھرے قہروں اور ٹھنڈے سا قہر کے لیے میں نہیں مڑا چکا ہوتا۔ خیر بہت پہلے تم نے مجھ سے

حراسہ تابی سے رنگ برنگے کانڈوں میں لپٹا پارسل۔ نیم والا بنال سینے سے لگائے گھٹنوں کے بل چلتی اور کہنیوں سے جھوم کو دھکے دیتی قہار کو درست رکھنے کے احکامات جاری کر رہی تھی۔ خان کل اپنی طبیعت کی خاص بے ایمانی میں بار بار اس کی قطار خواب کے مادی محفل تزیین کر رہے تھے۔ وہ اس سارے منظر میں ایک خان کل سے ہی شناسا تھی۔ بچوں کی طرح اس نے خان کل کی پناہ میں جھوم کا ساتھ دینا چاہا۔ خان کل، جھگڑا اور عورتوں کی طرح ہاتھ چاکر حراسے آگاہ جنگ تھا۔

”کیوں تیشوں صرف یہاں۔ میں تمہارا محبت تو نہیں جہاں تم نے ٹھہرایا۔ پیٹھ گیا۔ جب ٹھہرا“ اٹھ گیا۔

”اللہ کرے کوئی دھمک کی لڑکی تمہاری منگیت بھی نہ بنے۔“ اس نے چل کرید دعا دی۔

”لالا۔“ اس نے چلا کر پوٹھٹ کیا۔ لالا دروازے پر تصویر کی طرح تھے اس ساری بد مئی کے رفع ہونے کا انتظار کرتے لگ رہے تھے۔

”آپ آئیے تشریف رکھیے۔“ خان کل نے اس کو کھڑا دیکھ کر احرام اپنی سیٹ پیش کی۔ واقعی وہ بوس

دی۔

”آئی جان۔“ لہے میں ماہر جب ابھی کتنا بھونٹا اور بوقوف سا بوجھ چھوٹی سی لڑکی سے جھگڑ رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم مودب ہو گیا اور سنجیدہ۔ پولیس سٹوٹے پھولا ہوا سلیکشن اس کے قدموں کے سامنے گرا۔

”یہاں بیٹھئے۔“ اس نے اپنے سے بالکل نزدیک اس کی جگہ بناتے ہوئے چپے عوام میں اس کی وقت اس کی قدر دانی کا احساس بجا کر کیا۔

”آپ یہاں بیٹھئے یہ حرا نہایت بے ایمان ہے۔ آپ اس پر نظر نہیں رکھیں گی تو یہ اس معصوم پر حیر

چا جائے گی۔“

”آپ آؤ۔ بڑے معصوم۔“ حرا کو لڑنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ آپ لوھر نہیں۔ کیا نام ہے بھلا آپ کا؟“

”کل۔“ اور نہیں شاید بڑا۔ ”خان کل اب دیوار بالکل سنجیدہ تھا۔“ اور تمہیں اب تک ان کا نام نہیں آتا۔ کیوں یہی۔ تم لوگوں کا کادھر تعارف نہیں ہوا۔“

خان کل نے ایک چٹھلی۔ لیکن کڑی نظر وانیال خان پر ڈالی۔ وہ خود لاکھ غیر فمے دار سنی۔ لیکن دوسروں کو ان کی فمے دار یوں میں کوئی برہنہ کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

وانیال خان اس شیطانی پکر میں اپنے لیے کسی اچھی جگہ کی تلاش میں نگاہ گھما رہے تھے۔ وہ خان گل کے دانستہ دلی زبان میں ادا کیے قہروں سے بے خبر تھے یا بے خبر نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

یلا کہ لٹھے پھر کے لیے ان پر رشک آیا۔

سب لوگوں نے اپنے گھنے سر کاٹے اور کھٹک کر ان کے لیے جگہ کشادہ کی۔

لیکن قہرے نال عدلہ خشک کے نام نگاہ اور وہ ان خوش قسموں میں سے تھی جن کے قہرے نکتے ہی رہتے ہیں۔ وہ دونوں اس کول دوازے میں بیٹھے اتفاق سے ان قہروں کے بالکل سامنے آ گئے۔

خان کل ذرا سانس لیے وہ انداز میں بیٹھنے کی کرتے لگا۔ اس کا گمان تھا وہ دروازے سے باہر نکل جائیں گے۔ کیونکہ کسی محفل میں وانیال خان کی موجودگی خوش طبعی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اس نے اپنی

تواڑ آہستہ کر لی۔ اپنی حرکات پر کنٹرول کر لیا۔ اب زیادہ متفکروہ سرگوشی کی صورت میں بھلا کے کانوں میں لہا رہا تھا۔

رویلہ کی آنکھیں اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھیں۔ جگہ کافی اور غور حسن سے جھلما تھی۔

آپ کے حسن کے غور میں اس وقت اور اضافہ ہوتا ہے جب اس کو چاروں طرف سر ہا ہا جائے۔ اس کو اس کا اصل مقام دیا جائے۔ اور یہ اس کے لیے کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا۔ وہ اس کے بالکل نزدیک بیٹھے تھے شاید دانستہ یا نا دانستہ طور پر۔ اس کی دلکش ہنسی کا ترنم بڑھ گیا۔ اس نے گردن کھاکر ان سے شکوہ کرتی زبان میں کچھ کہا بھی لیکن اتنی دور سے بالکل سامنے ہونے اور مکمل توجہ کے باوجود کچھ بھی نہیں سن پائی۔

لیکن پھر خان گل نے اس کی توجہ کھینچی۔ وہ یہاں سے باہر یاری سب کا تدارک کر رہا تھا اور غالباً براہ راست وانیال خان کو ان کی کوئی تباہی کا احساس دلانا تھا۔

لیکن درحقیقت وہ اتنے قصور وار بھی نہیں تھے۔

وہ ان کے بار بار اصرار اور خواہش کے باوجود ان کے درمیان بیٹھی ہی نہیں تھی۔ وہ زیادہ تر مصروف رہتی اور اپنی زندگی الگ تھلک سی گزار رہی تھی۔ وہ تو شاید اس وقت بھی یہاں سے ہوا ہو چکی ہوئی اگر خان کل اس کو بوقت پکڑی۔ لیتے۔ اس نے سب کا تفصیل سے تدارک کر لیا تھا۔ اس کا اپنا تعارف بھی بڑی وضاحت میں ہوا۔ اس کی لطف و توصیف میں کچھ اچھے اور کچھ طنز فقرے اس نے اپنی طبیعت کے مخصوص رنگ میں دے دیے اچھے بھی۔ وہ پیشہ وانیال خان کے سامنے دھیمہ بڑھا تھا۔ لیکن اس نے خاص سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ کون ہے اور یہاں کیوں ہے؟

پروگرام شروع ہونے ہی رہنے لگا۔ اس نے اعلان کر دیا۔

”فیوژنک نہیں ہے گا بلکہ میں خود گاؤں گا۔“

”ہاں۔ کیوں یہ پہلا اور آخری موقع ہو گا آپ کی demonstration“

اس نے خان کل کے فقرے اور لوگوں سے اپنی مگر کے دیوار کی طرف توجہ کر لی۔

یلا کا خیال تھا ابھی پشیمو زبان میں وہ مخصوص ماسٹر بلڈ کرے گا۔ لیکن اس کے خیال کے بالکل برعکس اس نے پنجابی ماسٹر چھیڑ دیا۔

کھٹک کوئی ڈیڑی اے

اک داری بل جاوےں

ساڑی جو کی والی پھیری اے

اس کو طفیل نیازی کا انداز چرائے کا عشق زیادہ تھا۔ نسبت اس کے کہ وہ لوگوں کا نیم میں بوجھیں لیتا وہ جو خوبصورت سائڈل بھرتے ہی پھوکی طرح گھبرا کر دوسرے کی طرف پھل دیتے۔

اسے آج گانے کا موقع مل گیا تھا۔ خان کل کے بقل۔ بھرا نہ کہ بے اور طے تو کوئی سنت بھی نہ۔

وہ نہایت فرحت سے ایک ایک لائن پر براہ وقت لگا رہا تھا۔ لوگ ورش کے گھوٹا دیوں کی طرح منہ آسمان کی طرف اٹھا کر اور سر پھٹت سے بلند کر کے دو دنیاؤں دانیما سے بے خبر تھا۔ درمیان میں کہیں اس کا سر ٹوٹا یا

وہ سانس لینے کے لیے رکاوٹوں کو پارسل کی دھجیاں بکھیرتی شروع کریں۔ پارسل فرائس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کاتب رہی تھی۔ جیسے فیصلہ پاکستان پینٹل کوڈ کے مطابق ہونا ہے۔
 ”یہ بتائیے زندگی میں پہلا پتھر آپ نے کس کو مارا؟“
 ”مجھے مارا ہو گا۔ اور کسے“ فرائس نے بڑی بے اعتنائی سے کہا۔
 ”جھوٹے تم مجھے مارتے تھے کہ میں تم سے“
 ریش نے جھگڑا بڑھتے دیکھ کر ہر گھبراہٹیا۔

بڑی دامان کوئی نہ

اکواری مل جاویں

جندریا وادہ کوئی نہ

ہنگامے سے شدت اختیار کر لی۔ ریش کی دیرینہ خواہش اسی کے ساتھ ہی جنگل میں دم توڑ گئی۔
 وہ اکیلا حلق بٹاڑتا رہا۔ اس کی کوئی بھی شے پر تکیہ نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ لوگ لوگوں سے ان کے پسندیدہ اشعار دریافت کر رہے تھے۔ دوستوں کے نام معلوم کر رہے تھے کسی بے نام عزیز کو کوئی پیام روانہ کر رہے تھے۔

ایک فریڈریش خان کے نام بھی کھلا تھا۔ ان سے پوچھا گیا تھا۔ بھلا بتائیے شعر میں اظہار کیسے کیا جاتا ہے؟ انہوں نے بغیر کسی چٹکناہٹ کے سکون سے پڑھا تھا۔

تمہارے بعد میرے ذمہ تار سائی کو

نہ ہو نصیب کوئی چارہ مگر دعا کرنا

عدیلہ نے بے ساختہ سا بولو بلا۔ پتا نہیں وہ شرمیلی تھی کہ ہچکچاتی تھی۔ اس نے تیزی میں پلٹ کر انیل خان کی آنکھوں میں کو جھپٹا چاہا۔ یہ اظہار کس کے لیے تھا۔ اور یہ اتفاق ہی ہے کہ چونکہ باری ان کی تھی اس لیے جواب کے پھر بھی لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کی نگاہیں بے رنگ بے معنی تھیں جیسے لب آتی ہے دعا دہی تھی اور بیزار ہو گئے تھے۔

کمال ہو گیا بھی۔ ”خان کل نے جیسی ہی آواز میں اس کے نزدیک منہ کر کہا۔
 ”میں تو بڑے بڑے رنگ بدلے گئے ہیں۔ سچ کل سورج کس طرف سے نکلتا ہے۔ معاف کرنا میں تو سہری کے لیے اٹھتا نہیں۔“

وہ اس کے کان میں کوئی بات کہتا اور بالکل سناٹ بیٹھتا۔ انیل خان کی توجہ کھینچ لیا تو وہ اتنی دور بھی نہیں تھے کہ خان کل کے کونٹے وقفے سے انڈیے فقروں کے حصے ان کے کانوں میں بالکل ہی نہ پڑ رہے ہوں۔

پھر تھوڑی دیر بعد باہر آئی بے سری آواز اور لوگوں کی ہنسنے ہنسنے میں وہ لا محنتی سے پوچھتا۔
 ”کیا بات ہے؟ آج عدیلہ جنگ کو بطور خاص بڑی لفت مل رہی ہے۔“

”پلیز خان کل۔ یہ تم غور توں کی طرح اسکیٹل کیسے بنالیتے ہو؟ اُس نے ہیزاری سے کہا۔ محفل میں اچانک اس کی عدم دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ ”خبر وہ کیوں ایک ہے۔ وہ سارے کر آئی ہے اور کہاں وہ رات لگائی کے لیے اپنی زندگی خراب کیے ہوئے رہی ہے۔“

”نفس خدا کا یہ اسکیٹل ہے۔ کل کو جو زمانہ کے گاؤں میں آج کہہ رہا ہوں۔ میں آخر کب تک

خاموش تماشا بنی رہا۔ ہمیشہ رہوں گا۔“ پھر اس نے تیرہویں کے رشتے داروں والے لہجہ بدل کر اس کے کان میں صراہ کیا۔

”انیال خان ایک زمانے میں عدیلہ سے شدید نفرت کرتے رہے ہیں۔ بلکہ وہ اس قسم کی عموں ہر لڑکی کو پاپیئر کرتے ہیں۔“

”دیکھو خان کل پندرہ ماہ پہلے تیرے تو دیر نہیں لگتی۔“ اس نے چابک دستی سے پارسل آگے سر کیا اور ہنس دی۔ وہ اس کے سامنے ہی بیٹھے تھے۔ اور اتفاق سے ان کی نشست کا انداز ایسا تھا کہ جب بھی خان کل کے دے دے فقروں پر دلی بلی ہنسی ہنسی ان کی نگاہوں کی سیدھ میں آجاتی۔ لیکن وہ اپنی خوشی پر قابو نہیں پاسکتی تھی۔ جاتے وقت وہ اس سے روٹھ کر چلا گیا تھا اور کیا تھا ایسے جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی خفگی کی بات، آئی ہی نہیں تھی۔

”وہ۔“ جیسے وہ اول اور حقیقی خاموشی کے بعد کسی اہم نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔

”میرے ہمارے کتنی ہی بے بسی علی۔“

”لو وہ۔ خان کل۔“ اس نے ہیزاری سے کہا۔ ”عقلمندی خواہاں بھی ہے۔ ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کی چیز سے لے لے۔“

”لیکن میری دور رس نگاہیں تھیں اور کچھ رہی ہیں۔ کچھ اور کچھ رہی ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا ہے میرا کچھ اور۔“ گھٹنا اور گھٹنا۔ ”چھاپا چکا ہے۔ اور یہ اس طرح نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہو۔“

”تمہاری اس معنی خیز گفتگو سے میرے دلے دلے کچھ بھی نہیں پڑا۔“ اس نے آگے سے بچے میں کہا۔ ”ہاں۔ یہ تو میں سمجھ ہی گیا ہوں۔ تم اتنی جھگڑا نہیں ہو اور میری تمہاری سب سے بڑی خوبی ہے کہ تم یہ تو قوف ہو۔“

”میں پروٹیسٹ کر کے اٹھ رہی ہوں۔“ اس نے ہانے سے گھائی کی گھڑی دیکھی جیسے اچانک کوئی ضروری کام اسے یاد آگیا تھا۔ اور تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔

پس اس سے زیادہ ممکن نہیں اس وعدے کی جتنی اہمیت تھی اس نے بھلا دی۔

اب اس کے لیے ان حالات میں محض مرکز نگاہ بن کر لوگوں کو ہنسنا خوش کرنا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ یہ ظاہر داریاں، یہ قصص، قریب کی مسکراہٹیں۔ وہ ان کچھنی ہوئی لکھنوں پر بہت دور تک نہیں چل سکتی تھی۔

رات زیادہ ہو گئی تھی اور اسے اس یا اس ہانے تو اٹھنا ہی تھا۔ کڑھی میں رہتے رہتے اسے بھی کڑھی والوں کی طرح رات کے دس بجے ہی دھبے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ایک نظر بے بے کے کمرے کی طرف جھانکا۔ وہ ابھی تک سوئی نہیں تھیں۔ زمشمان کے سلسلے کی طویل عبادتوں میں مصروف۔ اس کی ان سے کوئی خاص بات نہیں ہو سکی۔ مسلمانوں کے کمرے بے رونق سے تھے کیونکہ رونقیں تو اس ہل میں جلوہ فگن تھیں۔ جہاں بہت سے احباب اپنی اپنی ذات کے اندر جاتے۔ کون کون سی خواہشوں کے جہان چھپائے، کون کون سے ارادے رکھتے تھے۔

مگر وہ کسی نہ مصروف اور ہنگامے سے بھرپور دونوں آدمیوں کے اہصالے سے مزین جگہ تھے۔

شام میں شیریں چینی اور اس سے اگلے دو مریض بیمار نے شہل ہو کر محفل موٹل۔

یہ سرجن ٹار کی شخصیت تھی یا ان کی بے تماشائیت تھی کہ ان کے اترتے ہی بوڑھوں کے پرانے مرض جاگ اٹھے اور نیربڑھوں کی زندگی میں ایک دم تازگی آگئی۔
جرم کو بڑی جلدی، جوش آیا تھا۔ اس نے خان گل اور سرجن ٹار کی دلچسپ جوڑی پر نہایت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرما دیا تھا۔ ”میں ان دونوں کو ڈین مارٹن اور جیری لو کیس کہتی ہوں۔ آف یہ دونوں اتنی مزے کی باتیں کرتے ہیں۔“

وہ بے پے کی خدمت میں دست بستہ ان کی لائسنس ٹھکانہ میں ہم زندگی گزارنے کے انداز پر غور کر رہی تھی کہ اس نے حمار کے ان فقروں سے سنا کہ سرجن ٹار بھی پہنچ گئے ہیں۔

پتا نہیں کہیں پہلے دن سے آج تک اس کو سرجن ٹار کا ساتھ ہائی تمام لوگوں کی نسبت، بے تکلف اور سہل سا لگتا تھا۔ ان کے سامنے بہت زیادہ سوچ کر نہیں بولنا پڑتا۔ وضعداری نہیں بھائی ہوتی اور اپنی زبان کے مزے والے۔

اس نے دیکھا تھا، نامانہ شخصیتیں بے پے تک لائی تھی جیسے کسی بزم کو مقلوم کے سامنے لا کر بیٹھ دیا جاتا ہے۔ وہ خاموش تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ مسکراتے، اپنے لیے کسی خیریت دریافت کرتے اور اس کا اپنا مفصلی حال معلوم کرتے رہے لیکن بیلا سے پہچان نہیں رہ سکا وہ ہنگامہ جوان کی آمد کی خوشی میں مشغول ہو رہا ہے شاید ان کو زیادہ پسند نہیں آ رہا۔ یہاں لڑکی وہ اکثر سکون کی تلاش میں آتے ہیں۔ گواس کا اعتراف انہوں نے کسی کے سامنے نہیں کیا لیکن وہ خاموش ٹکڑے میں ان دونوں کے درمیان ایک دوستی کی حد میں داخل ہو گیا تھا۔ چار پانچ سال ہمیشہ پریشانیوں، محضوں سے گھبرا کر اس ہستی میں آجاتے ہیں۔ لیکن اس طرح نہیں کہ پریشانی اور الجھنیں آپ سے پہلے ہستی میں موجود ہوں۔ چھوٹے نوجوانوں کا گروپ روکر انہوں میں روپوں کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔ بے پے کے اعصاب پر یہ شور مارتا گوار نہ تھا لیکن دل شکنی انہیں کبھی گوارا نہیں تھی۔

وہ سرخ چہیتی پتھروں کی بیچ۔ ہاتھ میں پکڑے آہستہ آہستہ ہمائی ہنگامہ سہنے ہوئے کا انتظار کرتی ہیں۔ پکڑ ہنگامہ ملا تو وہ انبال خان سے ملاقات کی غرض سے ان کی اسٹری میں چلے گئے شہر میں کمرے میں سے نکلی نہیں اور وہ اتنی تک مزاج ہو رہی تھی کہ کسی کی جرات نہیں ہوتی کہ اسے چھیڑ کر پتھروں کے چھتے میں ہاتھ ڈالے۔

اور کتنی دیرت سے وہ فارغ ہو گئی تھی۔

اس ماہ کی تنخواہ وصول ہاتے ہوئے اسے بڑا عجیب سا احساس ہوا اس پورے مہینے سوائے مہماذاری کے مزے لوٹنے کے اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ عذریہ وہ تمام کام یہاں ختم ہو جائیں گے جس مقصد کے لیے وہ یہاں ملائی تھی اور کوئی شخص آپ کو اتنا اہم تو نہیں سمجھتا کہ محض اپنے گھر ٹھہرانے پر آپ کو تنخواہوں سے نوازتا رہے اور بالخصوص وہ یہ احسان کرنے پر آمادہ ہو بھی جائے تو آپ کی عزت نفس کے لیے بھکاروں بوالا اور یہ کس قدر مستحکم خیر ہوگا۔

اس نے مہماذاری کے کمرے دیکھنے کی کوشش کی۔ خستہ خان کے محلے میں دخل اندازی کی۔ اور اسٹری میں پیغام بھجو کر آئندہ کے پروگرام کی ہدایات کا حکم نامہ جاری کرنے کی گزارش کی۔

لیکن کوئی منصوبہ کوئی پروگرام جیسے اس کے لیے وہی نہیں کیا تھا۔

وہ ٹھکانوں سے لہرے بغاوت کے ملک بھرے جنگل میں ان دو بیڑھوں پر خاموشی سے جا بیٹھی جہاں بچے چھتوں کیانی جھاگ اڑا تھا۔ اور جو اس کی بے سندیدہ ترین جگہ رہی تھی۔ اور اب یقیناً اسے کوئی فیصلہ کرنی لیتا چاہیے۔ کوئی عارضی جگہ آپ کی منزل نہیں ہوتی۔ اگر آپ ان رسی ٹھکانوں پر دل ٹکا کر بیٹھ رہیں تو یہ آپ کی ناقص صورت ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب آپ کو شدت سے منع کیا جاتا ہے۔ اور دماغ کی کار کی طرف بار بار دو حیران دینے کو کہا جاتا تھا۔ اسے لگا اس ویران جنگل میں کوئی اور ذی روح بھی ہے۔ اسی کی طرح بھٹکتا ہوا۔ اسی کی طرح ایوس۔ منزل کے نشان سے بے خبر۔

وہ جھاگ اڑاتے پتھروں سے سرچھوڑ پالی کے دو سری طرف تھے۔

وہ اس کو دور سے کہیں دیکھ کر اس طرف آئے تھے اور اپنی مخصوص شگفتہ طبیعت میں بھی مسکرا رہے تھے۔

اور ہاں یقیناً یہ سرجن ٹار ہی ہو سکتے تھے۔ وہ مسکراہٹ جو زخم سے بھی آتی ہے اور زخم سے بھی۔ تجربوں کی بھی میں کھلی اس مسکراہٹ سے گزرتی۔ بیٹی خان کے باسی بالکل بادل ہیں کہ ان کے فو زخم بھی ان کے ذاتی نہیں۔ اور حار نامے کے دکھانے کے ناموس کے۔

وہ جواباً مسکرا دی۔ بالکل ویسے ہی۔

”پتھروں سے گزرتے پانی کے چھتوں اور اس کے کڑے سے خود کو چھپاتے آبشار کے دو سرے کنارے آئیے۔“

”آپ اس میں بٹائی بی بی۔“

”خلافت ایامیں آپ کے لیے سوچ رہی تھی۔“ اس نے بے ساختگی میں کہا۔

انہوں نے نہایت تجدد کی آواز کی چوٹیوں ایسے بلند درختوں کی شاخ پر بیٹھے خوش رنگ پرندے کو بہت غور سے دیکھا۔ پھر جیسے فعل کی لہجہ میں کہا۔

”ہاں۔ میں توہوں اواس۔ اور اس لاکھوں کو نول مرلے میل کی دنیا میں میں صرف تم پر اعتبار کر کے کہہ سکتا ہوں کہ میں اواس ہوں۔ بہت زیادہ۔“

وہ چپ ہو گئی۔ مدھکوں کو کہنا اور زخم پر شہر تار و مختلف باتیں ہیں۔ دو سری چیز آپ کو فہم سے نجات دیتی ہے لیکن یہی چیز آپ کو اور بھی پریشان کر دیتی ہے۔ وہ پتا نہیں کیا چاہتے ہیں۔ زخم کھولنا یا سنا۔

”اور آپ مجھ سے پوچھیں گی نہیں؟“ اور وہ رافت نہیں کر رہی گی۔ ”انہوں نے ایک بے نامی اداسی کی گرفت میں آئے کہا تھا۔ ”ایک ماہ اس آوی دو سرے۔ ایوس شخص کو بہت دور سے تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسی لیے شاید میں آپ کو ڈھونڈتا ہوں۔“

آج ان پر قوطیت کا موڈ طاری تھا۔ ایسے ایسے کتے موڈ اس پر بھی طاری ہوتے تھے۔

وہ نہیں دیتی۔ ”آپ اپنی اداسی کی وجہ بتائیں گے یا میری اداسی کی وجہ پوچھیں گے؟“

”بار بار۔“ انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”تو چلیے، پہلے میں پوچھتی ہوں گوں۔ ہے وہ۔“

”گوں گوں ہے؟“ اس حملے پر وہ بوکھلا گئے۔ ان کے گلن میں تھا وہ اس مزلہ سی لڑکی کے ساتھ وہ چار ابھی الٹی باتیں کر کے دل کا پوجو اتار کر چل دیں گے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ براہ راست نشانے پر حملہ کرے گی۔

”چلے چھوڑیئے سرجن ٹاکر۔ ان برسی تہیدوں اور لمبی قہقہروں کے بجائے یہ غنائے وہ کون ہے؟“
 وہ چھینپ سے گھٹے ”مسکے یہ نہیں وہ کون ہے۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ کیوں نہیں ہے جو۔“
 ”تو وہ کس طرح ہے؟“ اس نے سکون سے فیصلہ کیا۔
 ”آپ اس کو کتنی مدت سے جانتے ہیں؟“ اس نے ان کو کھرسے میں کھڑا کر لیا تھا اور اپنی طبیعت کے
 عین مطابق سوالوں کی بشارتیں ان کو ٹھیک سے دے رہی تھی۔
 ”ایک مدت ہو گئی اب تو۔“
 ”اور مسئلہ کیا ہے؟ وہ خود کو کئی اور؟“
 سرجن ٹاکر پر سکون سے ہونے کوئی شخص اگر آپ کو لمبی چوڑی کہانی سنانے کے جنھنٹ سے نکال
 لے اور ان کی باتیں آپ کی آنکھوں سے پڑھ پڑھ کر خود ہی اذیر کر لے تو قلب کا اطمینان حاصل ہو جاتا
 ہے۔ آپ نے قلم آدمی پر بھروسہ نہیں کیا۔
 ”محبت بڑا ذلیل جذبہ ہے بلالی بی۔ آپ کتابوں میں اسے پڑھیں تو یہ آپ کو طاقتور لگتا ہے جیسے آپ
 اس کی مدد سے دنیا کے دھارے بدل ڈالیں گے لیکن جب یہ واردات انسان پر خود گزرتی ہے تو مدد حال
 کر دیتی ہے بدل نہ دیتی ہے۔“
 ”محبت صرف ان لوگوں کو بڑھاتا ہے جو اس میں غماختے ہیں۔“
 انہوں نے ایک نظر غور سے دریا کے بھانگتے پانی کی طرف دیکھتی لڑکی کو دیکھا۔ ”اور آپ یقین کریں
 محبت میں تما کوئی جمل ہی نہیں سکتا۔ محبت ہمیشہ ایک سے زیادہ لوگوں کو کھاکسٹر کرتی ہے ہاں یوں ضرور
 کرتی ہے اس لیے کہ راستے میں ہالے سے سخت اور آسمان سے بلند پھاڑیں۔ جب آپ ان رکاوٹوں کو ہار
 نہیں کر سکتے تو آپ کا جی چاہتا ہے آپ ان سے اپنا سر بھوڑ لیں۔“
 اسے لگا شاید کسی دن سرجن ٹاکر بھی آسمانی سے ان پتھروں میں سے کسی ایک پتھر سے ٹکرا جائیں
 گے کتنی دیر وہ اپنی جگہ اپنے آپ سے اچھے رہے۔
 ”وہ کون سی رکاوٹیں ہیں۔ کون سے پتھروں۔ آپ اس گھر میں کتنے مقبول ہیں۔ کون کون آپ پر جان
 نہیں دیتا۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ آپ کا استقبال تو یہاں موجود مہمانوں نے بھی کس شہرت سے کیا تھا۔“
 ”یہ جو لوگ جان دیتے ہیں ہاں ایک دن بڑی آسمانی سے لے بھی لیتے ہیں۔ ان کا جان دینا غیر مشروط
 ہے۔ یہ صرف محبت کرتے ہیں اس وقت تک جب تک آپ ان کے کافی ذوق سے ہونے پتھروں کو ہاتھ نہ
 لگاؤں لیکن جیسے ہی ان کی روایتوں کا رنگ کھرجا جاتا ہے یہ بلبل اٹھتے ہیں۔ وہ بھی جو ان روایتوں کا حصہ
 نہیں بھادری سے کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف رت میں منہ دے لیتے ہیں۔“
 بادلوں سے بھری وادی اچانک مت بوجھل ہو گئی۔ کہانی کے اس حصے سے وہ بالکل بے خبر تو نہیں تھی۔
 یہ الگ بات کہ بے بسی کی بات کی بامدادی بھانے میں اس نے منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی لیکن یہ ایسی
 ہی ایک دوسری کہانی کا آغاز ہونے والا ہے جس کا انجام پیڑوں کا بھوکا پیٹ یا کسی جدید ہتھیار کی پیاس
 ہوگی۔
 ”اگر آپ کو اور شیریں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کیا شیریں راضی ہے؟“ اس نے اچانک پوچھا۔
 ”چاہے نہیں۔“ سرجن ٹاکر کے مختصر سے جواب میں شیریں کے لیے جو بے پناہ پردہ داری تھی اس نے اس

کی آنکھوں کو گھٹا سا کر دیا۔ ایک چہرے کا احساس۔ ایک سرسبزیاں کا تصور۔
 محبت دراصل ایسی احساس کا نام ہے باقی سرجن ٹاکر کا مارا فلسفہ کیا اس ہے۔
 وہ چپ ہو گئی۔ شاید ایسی ایک آنکھیں کہانی سے وہ بھی بے خبر نہیں تھے۔
 جو بھی اس کہانی میں آتا ہے وہ ایک دن اس کہانی کو ضرور سن لیتا ہے اور یہ کہانی ان لوگوں کو تو ضرور
 سنائی جاتی ہے جن کے لیے محبت پکڑنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔
 ”کیا سرور دانیال خان اس بات سے آگاہ ہیں؟“
 ”وہ نہ۔ سرور دانیال۔“ انہوں نے اپنے عزیز ترین دوست کو ایک مختصر سے پُر اومہ سے رو کر دیا۔
 وہ اس اومہ کا کوئی مطلب نہیں نکال سکی۔ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی۔
 انہوں نے نہایت متقی خیر لکھے میں ڈرامائی سناؤ نقد دے کر کہا تھا۔
 ”سرور دانیال خان بہادری کا شخص سہیل ہے۔ وہ دور حقیقت اتنے بہادر نہیں۔ وہ تو اپنے لیے کچھ
 نہیں کر سکتے میرے لیے کیا خاک جھک رہیں گے۔“
 وہ چپ ہو گئی۔ اس نے تو انہیں ہمیشہ بہادر پایا تھا دلیر حالات کے سامنے ٹٹ جاتے والا بڈلا۔
 ”اگر شیریں چاہے تو۔“ آپ جانتے ہیں عورت میں بہت طاقت ہے۔“
 ”اور اس سے بات کرنے کے لیے آپ پشاور جائیں گی؟“ وہ طنز کر رہے تھے۔
 ”ارے آپ کو بتا میں شیریں تو جی آگئی تھی۔ لیکن جب سے اپنے کمرے میں رہ رہے۔“
 ”کمال ہے بھئی۔“ سرجن ٹاکر کے سخت منہ چرے پر سرخی کی لہری آگئی تھی اور دیکھو ان کی وقوف
 ہو اٹھنے لگے کچھ بھی نہیں بتایا۔
 وہ اپنا مذاق بنارہے تھے شخص رہے تھے۔ وہ بہت کمہ پکے تھے۔ بہت کھل چکے تھے۔ پھر شاید ان کو
 والپس اپنے قول میں چسپ جانا زیادہ محفوظ لگتا ہو۔
 ”اس سے بات کرنا بالکل بے کار ہو گا۔“ وہ اس لیے کہ فیصلہ کن حصے میں کھڑے ہو گئے۔
 ”وہ تو کمزوری بڑھل لڑکی ہے جو لالا کے اشارے پر نہایت فرماں بردار ہے۔ جان قربان کر سکتی ہے۔
 جس کا دنیا میں ایک ہی آئیڈیل ہے۔ ایک ہی رہنما ہے جس کی کسی بات کو وہ بھی رو نہیں کر سکتی۔ لیکن
 اس سے آگے وہ کچھ کرنے سے قاصر ہے۔“
 ”آپ جانتی ہیں بھلا میں۔ یہ ساری باتیں کرنے کے لیے صرف آپ کا چناؤ کیوں کیا؟“
 اس نے سرائی کران کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ تو کچھ جی میں جانتی تھی۔
 ”ایک تو اس لیے کہ آپ سے بات کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکتا ہے۔ دوسرے اس لیے کہ میں
 نے ان روایتوں کے خلاف اگر کسی کو لڑتے دیکھا ہے تو صرف آپ کو۔“
 یہ بہت عجیب و غریب فیصلہ ہے۔ ہاں۔ ہم ان کو دنیاوی اور پتھر کے ناسے کے لوگ سمجھتے ہیں لیکن یہ
 اپنی زمین میں بہت اندر تک اتر گئے ہیں۔ یہ سرداروں کو پوچھتے ہیں۔ ان پر جان دیتے ہیں۔ لیکن سرور
 بھی ان کی روایات کا بصر رکھنے کے لیے ایک کٹھن تھی ہیں۔ جس دن سرور اٹھیلے کے اصولوں کے خلاف
 چلے گا۔ اس کا پچھلا واقعہ خود عوام نہیں پہچان سکیں گے۔
 اسے بھری بھری سی آگئی۔ خوف کی ایک انجالی سی لہر نے اس کو کچکا دیا۔

”یہ محرومی جیسی خان کسی بہتی کا نام نہیں ہے۔ یہ مکاری کا ایک جالا ہے۔ آپ صرف ایک مرتبہ اس جالے میں پھنس جائیں۔ پھر آپ نکل نہیں سکتے۔ جکڑے جالتے ہیں نہ آپ کو واپسی کے راستے دکھائی دیتے ہیں نہ یہاں تپ کا کوئی نشانہ ہے۔“

”کیا بی بیلا۔ اس سے قبل کہ تم اس ٹکڑے میں کسی جانور اس جال کو توڑ کر پھینک دو اور یہاں سے نکل جاؤ۔“ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

وہاں کی اوصوری باتوں کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ لیکن شاید اپنے بارے میں صفائی دینا اسے اچھا نہیں لگا۔

”آپ مجھے جانتے ہیں سرجن ثار۔“ اس نے غصے اور فیصلہ کن آواز میں کہا تھا۔ ”لیکن اتنا نہیں، میں مقامات اور جنگیں بار بار بدل چکی ہوں۔ اور مجھے کوئی جالا اتنی آسانی سے جکڑ نہیں سکتا۔ میں نے تو بڑی سہولت سے وہ گھر چھوڑ دیا تھا جہاں میری زندگی کے باقی تیس سال گزرے تھے۔ آپ دیکھ بیٹھے گاہ میں سب کچھ چھوڑ کر ایک دن آسانی سے یہاں سے بھی نکل جاؤں گی۔“ اس نے اپنے مقابل کھڑے اصرار سے سرجن ثار کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”لیکن جاننے سے پہلے میں اس گھر میں ایک انقلاب لاکھ لڑائی۔ اگر ہم ان فرسودہ روایات کو توڑ نہیں سکتے سرجن ثار تو ہمارا اتنا فرض تو بننا ہی ہے کہ ہم اس میں ایک دراڑ ڈال دیں۔ ہمارے لیے اتنی کامیابی کافی ہوگی۔ باقی کا فرض آنے والی نسلیں اٹالیں گی۔“

وہ اندر آئی۔ جہاں زندگی اتنی ہی خوش رنگ اور بڑا شیش بٹاش تھی جیسے کسی اور کی زندگی کے گھرے اور اس رعبوں سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ وہ وہاں تھی جتنی سلگتی اداسیوں کے نام سے بھی آگاہ نہیں تھے۔ یہ ہے جس خود غرض لوگ اسے لمحہ بھر کے لیے ان سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ بے بے خان کل زانیال خان ساس کاٹھ نہیں چاہا اور اس بیچ کے کسی دانے کو چھینے اور خود سے اختیار نکودے۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آکر بند ہوئی۔

یہ گہرا سر اور انکشافات کا ایک پلندا ہے۔ وہ ہر روز کسی نئے انکشاف کا پوچھ ڈھن پر لیے دل کو پرمود کرتی رہتی ہے کتنا طویل وقت اس نے گھرے میں اکیلے پر گزرا۔ حالانکہ ابھی وہ شیریں کو اس بڑی پر دل ہی دل میں کوس رہی تھی۔ اور خود یوں حالات سے چپ کر کر رہی ہو بیٹھی تھی۔ جیسے حالات ایسے ہی تو تبدیل ہوتے ہیں انقلابات اسی طرح تو آجاتے ہیں۔

شام تک وہ گھرے میں بند رہی کہ حالات سے جھگڑاتی اور جھگڑا کرنے کے لیے خود کو حالات کے لیے تیار کرتی جب ہر آئی تو شور شرابہ اسی طرح کان بھار رہا تھا۔ جب سے مہمان گھر میں آئے تھے گھر مسلسل ایک دہلیس پیڑ بننا ہوا تھا۔

اس نے گورڈور سے گزرتے دیکھا۔ بیرونی دروازے میں پلیٹو کھیل جاری تھی۔ ہر شاٹ کے بعد ایک ہنگامہ برپا اور ہر شاٹ سے پہلے ایسا موت جیسا ساٹا۔

میز کے ساتھ ساتھ کھڑے۔ سرجن ثار اور زانیال خان ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے اور کون جانے یہ کھیل کل ہی کچھ ہو جائے۔ وہ پلیٹو روم کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔

دونوں کی مقبولیت کا گراف ایک جتنا ہی تھا۔ کوسے لوگ زانیال خان کا ساتھ دے رہے تھے آدھے ان کے خلاف تھے۔ دونوں کروڑوں نے اپنی وفاداری کے اظہار کے لیے اس کو اپنی طرف تھموانی کی دعوت دی۔ اسے جہوم کے پیچھے چھپ کر باتیں بنانے میں کوئی حرج نہیں آتا تھا اور وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ علی الاعلان وفاداری کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی کہ سرجن ثار نے رضا کارانہ طور پر خود ہی ہتھیار پھینک دیے۔

”بڑے اور آپ بھی تالیاں پیٹیں زانیال خان کے لیے۔“ سرجن ثار کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے کی پشیمانی کا لب شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ خوشدلی سے مسکراتے سکون والے مہمان سے اسٹک سے ہاتھ لڑھکتے پھر رہے تھے۔

”جناب اپنی کلی میں تو فلاں بھی شیر ہو آئے۔ آپ کو آج جہوم نے چار تالیاں بیٹ کر لہڑو دیا تو سرجن ٹھہ گئے۔“ وہ اپنے خول میں واپس جا چکے تھے اور اس چھت کے نیچے ان کے حامیوں اور مخالفین میں سے کسی کو کوئی برا شہ نہیں ہوا کہ وہ کسی اذیت سے گزر کر ان مرحلوں تک پہنچے ہیں۔

انہوں نے ایک سینکڑے کے لیے ہم روک دی۔ ”آپ بھی آجائے اور دیکھئے کہ آپ کے پاس کے کس طرح پہنچاؤتے ہیں۔“ اس نے انہیں لے بیٹھ کر درست کرتے بھی اسے مخاطب رکھا۔

”میرے سامنے تیرا کارخ زانیال خان کی طرف ہے۔ یہ سارے نشان ناک کر میں آپ کے زانیال خان کو ہواؤں میں بکیرا ہوں۔“

کسیں اور کسی کر پی پٹیجی محنت سے گردن اٹھائے لڑکی کو یہ سب اچھا نہیں لگا۔ وہ اٹھ کر سامنے آئی۔ زانیال خان زیر لب مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے اتنی دیر میں اپنے لیے کوئی دفاعی بیان دیا تھا نہ اس بے تکلفانہ سی فضا اور گفتگوں کے بعد بڑے استعمال پر ٹوک وہ باری باری ہونوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

بچوں ایسی شیشیے میں آج اسٹک کو روڑر آہستگی سے ہٹ کرتے رہے۔ بیلا کا دل بھر آیا۔

یہ پہلی دوسری نہیں پتا نہیں کون سوس مرتبہ ہے کہ اس کے دل میں ان کے خلاف طوفانوں کی بلیخار اٹھی بھی ہے اور مٹتی بھی ہو گئی۔ وہ ریلہ خٹک کے چہرے پر کسی مسکراہٹ یا خوشگوار کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس نے ایک نظر زانیال خان کی آنکھوں کے تقاب میں دیکھا۔ دوسری مرتبہ بیلا کے اہنٹھل سے ان کی طرف۔ پھر اس کی ماری توجہ جہوم کے ایک نوجو بکیر سے بکھر گئی سال گول گیند جیسے تیرتی ہوئی اپنے سوراخ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”یوں لگتا ہے۔ آپ کا کچھ کھو گیا ہے۔“ سرجن ثار نے اسٹک پھینک کر اپنی ماری توجہ کا مرکز اس کو بلا لیا۔ ”کوئی نشان کوئی راستہ کوئی حسی؟“ اگر ہم آپ کی دیکھ کر سکیں۔“

”بہت بہت شکریہ۔ وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا ان کی دیکھ کر مانتا ہے۔“ ایک اور فحشے میں اس کی آواز رہ گئی۔

زانیال خان کے حامیوں میں سے کسی نے بے ایمانی کی کوشش کی تھی۔

وہ چپ چاپ جا کر تماشا بینوں میں شامل ہو گئی۔ وہ کسی کی حاشی نہیں تھی۔ اس نے رقت سے دنیا کی خدا کرے ان میں سے کوئی نہ ہمارے۔ ریلہ خٹک نے چک کر دیکھا۔ غلبا۔ ”کیا کہ اس نے ضروری اور لوور پھرنے والی لڑکی کو ہر دو طرف سے عجیب و غریب قسم کی اہمیت کیوں دی گئی تھی۔ جواب ہم کی طرف توجہ

ہونے کے بجائے گود میں رکھے دو قول ہاتھوں کو اس شدت سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے نذرِ اعلیٰ سے کوئی چیز مانگ رہی ہو۔ اس کا چہرہ رنگ بدلتے لگا۔
کون جانے وہ کسے سا لگا۔
اور کب قبولیت کی گھڑی آجائے۔

”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے شیریں۔“ اس نے شام سے پہلے ہی اسے اپنے گرم کمرے کے ایک کونے میں سر دی سے یا خوف کی شدت سے کانپتے چالیا تھا۔ وہ حیرت سے لنگ رہ گئی۔
اس کا خود ساختہ سا غور اس کے یوں طفلانہ طور سے مخاطب کرنے سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کو چھت تک بلاتا اور باوقار نظر آتی۔ شیریں کو لگا وہ اس کے سامنے ہنسی منی بچی بن گئی ہے۔ مخاطب اس سے استہزاء پرست برتر۔
اس کے پاس ہوا سے لے کر ہر شے کے لیے ہر شے کے لیے اور مخاطب قابلِ ہاتھ لیکن ہاتھ نہ تھا۔
کتنے دن سے اس کا ہنسی چاہ رہا تھا۔ کوئی آگے نہ آتا تھا۔ اس کا برا بھلا اس کو راہ دکھائے اس کی فوکیلی پکیوں کے تیز کوئے کیلے پڑ گئے۔ اور بے تحاشی سی سید رنگت شدتِ جذبات سے نماز کا سرانگہ دینے لگی۔
”شاید تمہیں میری بات اچھی نہ لگے۔“ اس نے اس کے کانپتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سار کر کہا تھا۔

”لیکن یہ ضروری ہے۔“

شیریں خوف سے دم بخود اور ساکن تھی۔ اس نے اتنی دیر میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ اس کی یہ جرات بھی زیرِ کر کہ وہ اپنا غور سمیٹ کر اس کو جھڑکنے لگے۔ اس نے آخریوں بے دریغ اس کے کمرے میں آنے کی جرات کی ہے۔ لیکن وہ کمزور بچی کی طرح ہلکے جگہ لرزتی رہی۔
”میں جس دن پہلے دن سال انکی تھی تم بے لے کے کمرے میں دنیا کی نعمتوں سے نہ بھیر کر آتش دان کے سرخ پتھر بھی گھس رہے تھے۔ آج تک میں نے تمہیں جشنِ مساتعہ خوشیاں مناتے نہیں دیکھا۔“
وہ چپ سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں وہ آنسو تیر گئے۔
”تم بھی تو تیرا۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم بھی تو ایک رہو ہو۔“ لیکن افسوس کی بات ہے۔
وہ اس کے برابر آگئی تھی۔ بلکہ اس سے کم زور ہو گئی تھی۔
”ہاں۔ میرا ایک مسئلہ تو زبان ہے۔ مجھے ان کی زبان سمجھ نہیں آتی۔ علاوہ ازیں میں یہاں ملازم ہوں۔ اس گھر کا فروغ نہیں۔ شاید لوگوں کو میری بے تکلفی اچھی نہ لگے۔“
اس کی صاف گوئی نے اسے دنگ کر دیا۔
جیسے بے سول خرید لیا۔

”ایسا کون سوچتا ہے! لا لانا ایسے نہیں سوچتے بلکہ کوئی بھی نہیں سوچتا۔“

”چلو اس کا مطلب ہے کم از کم تم نہیں سوچیں۔ چلو یہ اچھی بات ہے میں نے توجہ تبادلی۔ اب تم بتاؤ۔“

”مجھے دنیا اچھی نہیں لگتی۔“ اس نے سستے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بالا نکہ لا لاس وقت مجھے کتنی دیر

مناتے رہے ہیں۔“

”جو چیزیں اچھی نہیں ہوتیں۔ ان سے منہ موڑ کر ہم ان کا کیا نقصان کرتے ہیں۔“

شیریں نے خشک سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں کسی نے میری طرف بھیجا ہے؟“

”ہاں مجھے خوشی ہے کہ تم ذہین بھی ہو اور لبِ بے تالے کی ضرورت تو نہیں کہ کسی نے بھیجا ہے۔“

اس نے گردن جھکائی۔ ”میں نے تو ان سے کہہ دیا تھا کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں پتا نہیں پڑا۔“

خوف اس کی شفاف آنکھوں میں کانچ کی طرح ٹوٹنے لگا۔ ”تمہیں یہاں کی روایات کا پتا نہیں۔ یہاں قیامت آجائے گی۔“

”آگے بڑھنا۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”خوفان برپا ہو جائے گا۔ قتل و غارت۔ خون۔“ اس نے سہم کر کہا۔ اور لا لاس کی جان۔ لوگ لا لاس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بڑی خود غرض ہوگی۔ میں۔ تم اس کو منع کرو۔ دیر میں مت آیا کرے میں گڑھی

کو جس طرح خوف میں نہایا اور دیکھ رہی ہوں۔ تم نہیں دیکھ سکتیں۔ میں نے تو لا لاس کے سامنے زبان نہیں

بکھولی اور اس کو بھی اجازت نہیں ہے کہ یہ لفظ زبان پر لائے۔ میرا اس طرح جان دے دینا عجیب ہے۔ تم

جاؤ بے لے سے۔ کمرے میں خان کس سے شاہی کر لوں گی۔“ اس نے کتنی دیر اسے پھوٹ پھوٹ کر رونے

دیا۔

”وہ پشیمان نہیں ہے پڑا! پشیمانی ہے اور کتنی سہولت اور بے دوزی سے لوگ اس کو قتل کر ڈالیں گے۔“

”کوئی ضروری تو نہیں شیریں! پندرہ سال پرانی تاریخِ تاب بھی دھرائی جائے دنیا کا حافظہ اتنا اچھا نہیں۔“

اب وقت بدل گیا ہے۔ پندرہ سال ایک درت ہوئی ہے۔

”مسبِ لالہ سے ڈرتے ہیں۔ وہ اپنے ارادوں میں مست ہے۔“

”نہیں ان سے نہیں ڈرتی۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر قہقہے ڈالیا۔

وہ ساکت رہ گئی۔

یہ بہتی بڑی اذیت دہشت ہے۔

اس نے بے لگت چوٹی سے نیچے بھری آبلو کی گود کیہ کر حتیٰ ما فیملہ کیلہ گھروں سے نکلے تیل کھاتے پر سکون

رہیں میں وہ انسان کے سکون سے بالکل نااہل ہیں۔

آج سے پندرہ سال پہلے ایک شخص نے اس بہتی کے خلاف ایک فیصلہ دیا تھا جس کا نتیجہ بہتی

اورا لیکن نے دیکھ ہی لیا۔ پندرہ سال بعد ایک آبی نیا قدم اٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن بزدل ہے۔ اسے شیریں

چوٹیوں کے آگے ان کا والہ بن کر رہنا پسند نہیں۔ لہذا اس کا ایک ہی حل ہے کہ وہ دونوں اپنا اپنی بھولی

سے اپنے ارادوں سے متبردار ہو جائیں۔

لیکن وہ قیامت تک ایسا نہیں ہوئے وہ کی۔ ہاں یہاں ایک انقلاب آئے گا۔ خون کے قتل ہو۔

لیکن وہ اس بہتی میں یہ دوراؤں ڈال کر دم لے گی۔

تازہ دم گھوڑے بہتی کے اوپر اوپر مہمانوں کو کمر پر بٹھائے بٹھائے پھر رہے تھے۔ سامنے قیامت خان کا

اصلیل تھا۔ اور اس کے قدموں میں زندگی تھی۔ رواں دواں بہتی مسکراتی۔

ہاں اس نے شہر سے بھی وعدہ کیا تھا اور سرجنی ٹار سے بھی۔ اب وہ بھاگتا بھی چاہیں تو وہ ان کو بھاگنے نہیں دے گی یہ دنیا۔ اگر جنگل کے کنارے واقع ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں قانون بھی جنگل کا لاگو ہو۔ وہ اس طاقت کے خلاف ہر حالت میں جنگ کرے گی۔ وانیل خان کا گھوڑا سریت وورنا پہاڑی کے چکر کاٹ رہا پھر وہ درلے خشک کے گھوڑے کے پاس آکر رکتا۔ ان دونوں درایتی نگ کے درس لے رہی تھیں۔ زندگی گزارا اتنا آسان نہیں وانیل خان۔

اس نے جتنی سے سوچا۔ زمرہ اور سہیل کے ڈیم میں اپنی عورتوں کو دفن کرنا۔ ان کو ان کے حق دینے سے بالکل مختلف چیز ہے۔ شہر اس بستی کی کتنی ہی چوٹی کیل نہ ہو۔ اس کو یہ حق دلوانے کی ذمہ داری میری ہے۔ عدلیہ کو نہیں کیلئے سکھا رہے تھے۔

وہ بڑے احترام سے خان کل کے بتوائے بیڈ منٹن کورٹ میں مغرب کی اذان تک ایک تواتر سے ریڈنگ کھاتے رہتے۔

وہ صبح اٹھ کر ہوٹل گھر رہے تھے۔ ان کی زندگی کے ہر لمحے میں ہر جگہ ان کی بہترین رفیقہ عدلیہ خشک تھی۔ اور جیسے تمام دنیا سے انہوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔

اور وہ شہر میں۔ خان کل 'بھلا' ہے یہ جیسے تمام رشتے احباب ذمہ داریاں انہوں نے سر سے جھٹک کر بالکل پیچھنک دی تھیں۔

جب اس نے ان کی اپنی بے تحاشا مصروفیت اور اس کی طرف مسلسل عدم دلچسپی کے باوجود پری کے ہاتھ پیغام دیا تو اس کو پورا یقین تھا کہ شدید مایوسی سے رد کر دیا جائے گا۔

پری خاموشی سے جلی اور واپس آئی۔

وہ پیغام کے جواب میں پیغام لائی تھی۔

"میں نے کہا ہے میں لاہور کی میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

پری باہر واپسی سے پیغام رسائی کے فرائض تیرا ہوا تو ایک طرف ہو گئی تھی۔

لیکن اس کا حلق خشک ہو گیا وہ کب سے ان سے اس ملاقات کے لیے جدوجہد نہیں کر رہی تھی۔ اور اس کا تو خیال تھا ابھی وہ اس سے ملاقات کرتے کرتا نہیں گئے سو سو طرح سے جھٹ کر کے کہیں آتا ہوں گے۔ لیکن ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ پری کا پیغام سن کر لاہور ہی پہنچ گئے۔ اور اطمینان سے اس کے احوال توڑنے پھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

وہ تیز رفتاری میں سرخ قالین کو روندتی آخری میڑھی تک بھاگتی بھاگتی روک گئی۔

یہی حال لاہور کی کتنی منزل کتنی مرتبہ اس نے ان سے جھڑپ لی تھی۔ کتنی مرتبہ ان کی ٹھکانہ ہوئی۔

کام کے سلسلے میں کتنی ناکیدیں یہاں سے روانہ ہوئیں۔

کتنی ہی مرتبہ وہ یہاں دلہن کی کسی اور بسورتی ٹنگ۔ لیکن وہ وقت اور تھا اس نے کمرے کے عظیم الشان دروازے کو آہستہ سے چھو لیا۔

جیسے اچانک یہ کڑی کا جام سارو اندہ ورنی اور آہنی ہو گیا پھر دروازے کے عین سامنے ہی کرسی پر وانیل خان پر اتھان تھے۔ ان کی نشست سیدھی دروازے کے رخ تھی۔ اور وہ گویا بہت دیر سے دروازے کھلنے اور بند ہونے کے فیصلے کے منتظر تھے۔ ہاتھ تھکے واپس بھاگ جانے اور ارادہ بدل دینے کے اس کے

مارے منصوبے دوسرے رو گئے۔

"آئیے۔" وہ سجدہ کی سے احرا کہا "کھڑے ہو گئے۔" تعریف رکھیں۔

ان کے عین سامنے چھٹی نشست نکلا۔ "پھر وہ پر قیل ہی اس کے لیے ہاں رکھو لوگی کئی تھی۔ اسے کیا کہنا تھا۔ وہ کیا کرنے آئی تھی۔ لڑ بھڑ کر اپنی بات منوانا زیادہ آسان ہے لیکن ان کے سامنے منت کرنا۔

گہرے وزاری کرنا شاید اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

ان کی آنکھیں ایک انجانی مسرت سے لودے رہی تھیں۔

وہ چلتی تھی کسی بھی طریقہ گفتگو سے قبل ان کے چہرے پر ایسے بے شمار رنگ آجاتے ہیں۔ اور خاص طور پر اس سے بھگڑا مول لینے سے قبل وہ ہمیشہ ایسے ہی شاہان و فزائن لگتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ عام زندگی میں عورت کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اور عورت کو بچا کر کھانا۔ ان کی انائی تسکین کا بھی مسئلہ نہیں رہا۔ لیکن بڑی حیرت کی بات ہوئی۔ اپنی اپنی نشست منہالنے کے بعد انہوں نے اسے خود سے اٹھنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس طرف سے کوئی زہر لا پھرو نکلا۔ نہ طریقہ جملہ نہ تیر کی طرح کہہ دیتے ہوئے الفاظ جی کہ انہوں نے اس کو اپنی کرسی پر محوئی دیا تھا۔ مسئلہ دیکھ کر بھی کوئی بیان جاری نہیں کیا۔

بظاہر وہ اس کو وقت دے کر مناسب الفاظ کی تلاش میں مدد دے رہے تھے۔ لیکن اس طرح وہ خود سے مزید اختیارات کھو رہی تھی۔

"میں واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"بے ساختگی میں اس کے منہ سے نکل ایک بے موقع سے ٹھکرے نے ان کو ذرا بھی نہ چو نکایا۔

"مجھے یہاں کوئی بھی کام نہیں ہے۔ خرا خواہش تنخواہ لینے رہنا عیب سی بات لگتی ہے۔

پھر آپ کی شادی ہونے والی ہے اب آپ کو شاید باہر سے کسی مستطعمہ کی ضرورت بھی نہ پڑے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہرہ انگلی بہت سے الفاظ کہوں میں بکثرت ہونے کے باوجود انہیں زبان سے استعمال کرنا کتنا وقت طلب ہو جاتا ہے۔

"نہ۔ آپ کی دلن کو میری یہاں ملازمت پسند بھی نہ آئے۔ حالات خراب کر کے کوئی نئی نوکری تلاش کرنے سے بہتر ہے۔ اور چونکہ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" اس نے بے ربط سے انداز میں کہا۔

"اس لیے جانے سے پہلے میں اس گھر کے بارے میں ایک اہم مشورہ ایک رائے دینا چاہتی ہوں۔

خواہ آپ مجھے اس کا حق ہی نہ دے۔"

وہ تھک کر رک کر بے ہنگم طریق سے پوچھتی ایک دم چپ ہو گئی تھی۔

انہوں نے تھوڑی سی دیر کے لیے کچھ ڈرامائی وقفہ دیا۔ کہ شاید پھر پھر بولے پھر کچھ کہے۔

"بس۔؟" انہوں نے شرارت سے پوچھا۔ "یا پھر اور۔؟"

وہ چپ سی ہو گئی۔ ان کہوں کے نیچے اس کا پیشہ سمجھتی بیٹھا کیا ہے۔

"جی ہاں تو آپ متناہی باتیں کر رہی ہیں اور ان موضوعات میں توجہ بھی بہت ہے۔ مثلاً "آپ جاری ہیں بہر ایک۔ نمبر وہ آپ کو کوئی کام نہیں ہے۔ نمبر تین آپ کو تنخواہ لینا چھٹا نہیں لگتا۔ اور نمبر چار یہاں یہ کہ میں شادی کر رہا ہوں اور سب سے آخری اور آپ کے بقول سب سے اہم بات اس گھر کے

یاد سے میں۔ لیکن یہ تو بے شمار موضوعات ہیں۔ بیلا جانی اور ان کے لیے بڑا طویل وقت چاہیے۔ جبکہ آپ تو جاری ہیں۔“
وہ جھل سی ہوئی۔ انہوں نے اس کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس کی کوئی بات کبھی روک بھی نہیں کی گئی تھی اس نے معذرت کے سے انداز میں کہا۔
”سورہی۔ مجھے انداز ہے کہ آپ کے پاس وقت نہیں تھا۔ اور آپ مدت مصروف بھی تھے لیکن میں نے سوچا۔“

”میں میں ہرگز مصروف نہیں تھا۔ اور آپ کے لیے میرے پاس واقف وقت ہے۔ فرمائیے پہلے کس موضوع کو چھیڑنا ہے۔ آپ کی روانگی۔“
”میں۔“ اس نے ذرا سنا رہا ان کر کہا۔ ”یہ ایک غیر ضروری بات ہے۔ اور ہرگز اہم نہیں۔“
”آپ ظلم کر رہی ہیں۔ کیا آپ کا میل سے چلا جانا گڑھی کے لیے قطعی خیر اہم اور غیر ضروری ہو سکتا ہے۔ اور کیا آپ جانتی ہیں۔“

”مجھے کون روک سکتا ہے۔“ قابو پانے کے باوجود اس کو لگا اس کی آواز میں بد تمیزی کا عنصر نمایاں تھا۔
”میں جو بات کہنے والی ہوں اس سے کہیں اہم اور کہیں ضروری ہے اور وہی بات بھی ہے۔ چوتھ میں گڑھی میں ملازمت کرتی ہوں۔ اس لیے ہو سکتا ہے یہ مناسب بھی نہ ہو۔ پھر بھی میں نے سوچا ہے۔“
”بھئی واہ۔“ وہ بے ساختہ اس کی بات کاٹ کر غصہ سے کہنے لگی۔

”کیا فلاں رو کر کہا ہے آپ نے ملازمت کا۔ وہ کون سا ذریعہ فقہ ہے۔ وہ کون سی گڑھی بات ہے اور کون مالا مال چلانے والا واقعہ جس سے جو آپ نے اب تک میری ذات سے منسوب نہیں کیا۔ اب اگر ملازمت کا نام لے کر معذرت کر کے تو قیقا۔“ آج آپ میرے قتل کے ارادے سے آئی ہیں۔“
”میں چاہتی ہوں مرجن غار اور شیریں کی شادی ہو جائے۔“ اس نے خاموشی سے ایک دم کا کر دیا تھا۔

ان کا چہرہ بال ماموز غیر سنجیدہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا وہ اچھل پڑیں گے۔ لیکن نہ انہوں نے حیرت کا اظہار کیا نہ غصے کا صرف شوخی سے مسخرے کے میدان میں اتر آئے۔
”یہ آپ جانتی ہیں اور آپ کے ہا۔ پتے سے کس کس کی شادی کرے گی اور کس کس کی ہوگی۔ دیکھو۔“
”بی بی! وہ گل پری ہے اور نہ میں نیست تھان ہوں۔“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ اس نے ان کے نظریں ان کا ذرا سا بھی ساتھ نہیں دیا۔ اس کی آواز میں تندی تھی۔

”اور یہ مذاق ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ زندگیوں کا سوال ہے۔“
وہ کچھ بھر کے لیے چپے گوشتے ہو گئے۔ اب اس نے کچھ مختلف بات تھی۔

یہ پری اور لڑکھے کی شادی کا قصہ نہیں تھا۔ یہ اسکل ماسٹر کو نوکری سے نار ہونے والی کہانی نہیں تھی۔ یہ عورتوں اور بچوں کو زبردستی چھانے والی شکایت نہیں تھی۔ خان گل کی چلا وطنی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ بغاوت کا انقلاب اور روایات توڑنے کی باری بار گوشش بھی نہیں تھی۔
یہ بہت سنگین خدشہ تھی۔ یہ ایک خچر کال و استان تھی۔

اور وہ گڑھی کے دیواروں سے پھر خون اٹکادیکھ رہے تھے۔
کتنی دیر وہ اپنے کمال کو دیکھتا تھا۔ سہارے لگیوں کے جال میں الجھتے رہے۔
”اور اس کے لیے کسی نے آپ کو چنا ہے۔ شیریں نے یا ثار نے۔“
”یہ میں بالکل نہیں بتاؤں گی۔“ اس نے وقار داری پہنائی۔

”نہ جانیں۔“ وہ اسی سوئے ہوئے موڈ میں بولے۔ کتنی دیر وہ قالین کے قتل بوٹوں میں چپے کسی کو کھینچتے رہے۔ پھر خون کے درمیان دو تین موٹے موٹے بالوں سے الجھتے چپے وہ اس بیل میں باہر کی راہ تلاش کرتے رہے پھر ان کے منہ سے کچھ نکلا تھا۔ لیکن شاید وہ کسی سے مخاطب نہیں تھے۔
”ایک برت بعد اس گڑھی کی دیواروں سے امن و سکون ٹپکنا شروع ہوا۔ دل چاہتا تھا آپ اس بستی میں ٹھہر جائیں۔ رک جائیں۔“

اور یہ بھی فیسٹ ہوا کہ اس خون کے دھارے کو کس نے اپنی خواہش کے لیے نہیں بہایا۔ انہوں نے ایسے سوئے سوئے عطا کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں یہاں پھر خون دیکھ رہا ہوں۔ بیلا اور انہوں کا خون بمانا ذرا ق نہیں کم از کم میرے چپے بڑول آدمی کے لیے اب یہ ناممکن ہے میں نے تو اپنی راہ بیل کی تھی بیلا مجھے ان دیواروں سے باسی خون کی بو آ رہی تھی۔ لیکن شاید اس گڑھی کی آبشاری خون سے ہی ہو سکتی ہے۔
بال گڑھوں کو کتنا شادی بہ مشکل بہت ناممکن ہے۔“

لیکن اس گڑھی کا سردار میں ہوں۔ تمام روایات کی پاسداری میری ذمہ داری ہے۔ وہ مجھے قتل کرویں اگر میں غیر پشیمان قہقہے کی لڑکی سے شادی کر لوں۔ لیکن میرا سارا کنبہ میری ساری بڑاوری ان کی نام نہاد روایات پر بیٹھتے ہیں۔ چھ سکتی۔

بال یہ شادی ہوگی ہر قیمت پر ہوگی۔
جاؤ ان دونوں کو خبر دے کہ عید کے جشن کے ساتھ یہاں بدو اور جشن بھی منعقد ہوں گے۔
بستی والے اسے چھیلے کی لڑکی کے ساتھ میری شادی کریں گے۔ اور میں شیریں کی خواہش کا احترام۔
مستی والوں کا دست چکر مرثیہ میں ہوں۔ میں ان کی ذمہ داری ہوں۔ میں ان کی آن ہوں۔ میں ان کا بھرم ہوں۔ وہ میرے ساتھ کھیلیں۔

بال میں ہر طرہ تیار ہوں۔“
جشن یہ بستی منانے کی اور اس بستی کے لوگ۔
وہ تو یہ جشن دیکھنے کے لیے ہرگز ہرگز اس جگہ نہیں ٹھہر سکتی۔

اس نے حیرت سے ایک سانس بولتے وانیال خان کی طرف دیکھا۔ اتنی دیر چپے کسی سے بھی مخاطب نہیں تھے۔ خود کو کچھ بتا رہے تھے۔ پتا نہیں اس کے کانوں نے جو سنا اس میں کتنی حقیقت تھی۔ یا پھر بھی وانیال خان کا تھیک اڑانے کا ایک انداز۔ ابھی وہ ہنسیوں چڑھا کر طنز انداز میں اس کے پرچے اڑائیں گے۔ ان کی آنکھیں ہنس رہی ہوں گی۔ لیکن فقروں سے طنز کی بڑ آتی۔
مگر بعض اوقات وہ سب کچھ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں۔

کیا وہ اس کو محض ایک مٹی سے بنا توہ ہی سمجھتے رہے ہیں۔ کتنے سکون سے انہوں نے اس کے جھیل

جیسے ہر سکون انداز میں ایک ایک کر کے نکمر ماری تھی۔ اور بالکل چاڑھائی تھی۔ وہ خاموش اور ہر سکون بخشی
ان کی روئیداد سننے سے کتنی اٹھی تو اس کو کھاس کے پیروں میں جیسے منوں وٹنی پتھروں نے بوجھ ڈال دیا ہے۔
جیسے وہ ساری زندگی یہاں سے مل ہی نہیں سکتی۔
لیکن اس کو ملنا تھا، کبھی کبھی انسان کی زندگی کی تاریخ بننا بہترین باب تحریر کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی ہی
کہانی تھی جو سیاسی سے بہت پالی پر تحریر ہوتی تھی۔
کہاں سے لائے وہ اتنی اٹلی طرف گھمیل سے پیہ آکرے وہاں میں باقی وسعت۔
ہاں وہاں عظیم الشان، بستیوں میں سے نہیں تھی جو ہنس ہنس کر خرم ہو جاتے ہیں۔
وہ اٹلی اور اوروں میں سے نہیں تھی جو جان کی قربانی دے کر وہاں کی زندگیوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔ جو
اسٹینڈل کے پیش نظر چلائے ناول کو اپنے کردار کی اٹلی طرف سے مناد لیتے ہیں۔
پھر بھی اس کو نظر پر کے اس فیصلے کو خوشی تسلیم کرنا تھا۔
کیونکہ دل کے ساتھ ساتھ اس سے عظیم تر اس سے بھی فوری تر ایک اور جذبہ پلتا رہتا ہے جس کی
ہم جی جان سے پرورش کرتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو لڑ سکتی تھی۔ ہر جذبہ مٹا سکتی تھی لیکن اپنی انا کو یوں سے
واموں رسوا نہیں کر سکتی تھی۔
وہ بڑی استقامت سے اٹھی تھی اور عرصے سے چلی تھی۔
مخاطب اس کے سامنے اسی طرح تھا، کم مہم، چپ اور سادہ۔ اس کے ہونٹوں نے اس کے اٹھے
قدموں کے ساتھ جیسے ایک گہرے سانس کے ساتھ ڈیر لپ کسی کو آواز بھی دی تھی۔
لیکن اس کو لپٹ کر نہیں لگنا تھا۔ اگر وہ لپٹ کر دیکھ لیتی تو پتہ چلتا کہ اس کی ساری زندگی اس جھٹ
کے پیچھے لڑی لڑی رہ جاتی۔
”بیلا“ ۳۴ نمبروں نے اسے دوبارہ آواز دی تھی اس کا جواب نہ پا کر اس کے برابر آگئے۔
”فی الحال ان دونوں سے کہنا اس بات کو عام نہ کریں۔ میں مہمانوں کے جانے کے بعد خود کسی
دن۔“ پھر جیسے بات کو مکمل کرنا بالکل بے مٹی لگا۔
”مہمان ایک دو روز میں رخصت ہونے کو ہیں۔ ۳۵ نمبروں نے اسے یقین دلایا۔
”ہر شے ٹھیک ہے۔“ ۳۶ نے جیسے سکون سے گردن گھما کر ان کی آنکھوں میں اس رازداری کا یقین
دلایا۔ صرف لمحہ بھر کو وہ سوچتی ہوئی گری آنکھیں جھپکیں بالوں کے پیچھے جھلکائی آنکھوں سے نکلاں۔
لیکن صرف لمحہ بھر کو۔
پھر وہ سکون سے مسکرا دی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔
کوئی دیکھ مہر بھر کے لیے نہیں آتا۔ کوئی روگ ساری عمر کے لیے نہیں لگتا۔ اس کی ذات نے بہت بڑے
بڑے روگ بڑی بڑی خوشی سے تھکے اس نے بہت پانی کے ساتھ نیچے واڈی میں نظر نہ دوڑاتے سوچا۔
جنگے ہونے بلالوں سے بھری ہوئی واڈی کا سارا احسن ماند پڑ گیا تھا۔ ساری خوب صورتی جھاگ ہو گئی
تھی۔
اس نے قدموں میں بکھری اس حسین واڈی پر ایک اچھی سی نظر ڈالی۔
ہاں اسے واڈی کے جال میں نہیں الجھنا تھا اسے سرزنش کا رنگ بالکل ایسی جگہ کی ہوئی تھی جہاں سے

اسے لوگوں کے سامنے بکھر کر دکھانا نہیں تھا۔ وہ طلسمانی کمرے کے اسرار و رموز سے بچ کر ہنسی
مسکرائی یا ہر وہ آہنی تھی۔ اپنے اندر کی توڑ پھوڑ کو مخاطب سے چھپا کر مکمل کی۔
”آپ تو خوش ہیں۔“ میں ناں؟“ وائیل خان نے چہرے پر بکھرے سب رنگ سب اسرار سمیٹ کر
ستھیں شجیدگی سے اسے چہرہ اٹھایا تھا۔ ”میں اس سے کس جواب کی توقع کر رہے تھے۔“
”ہاں بہت بہت شکریہ۔“
اس کے خشک سے لہجے نے جیسے ان کو پوس کر دیا تھا کا ڈالا۔
کتنے لوگوں کے آنسو اس نے اسے کندھوں پر خشک کیے تھے ابھی چند دن پہلے یہاں اس واڈی میں
سرزنش کا رنگ اس کو رازداری کے لیے چن کر اس پر ایک بڑا ظلم کیا تھا۔ لیکن وہ یہ ظلم کسی اور پر نہیں توڑ
سکتی تھی۔
موجزن ڈار نہیں مری گل وہ کس سے کہتی کس کو بتاتی۔
ہر انسان کا ایک گوشہ ہے جہاں وہ ساری کٹافینی انڈیل کر عافیت ستر ہو جاتا ہے۔
اس کے پاس ایسا کوئی ٹھکانہ نہیں۔
کتنی شدت سے اس کا دل چاہا وہ لپٹ جائے۔ نہیں سے ناکام اپوس۔ موشی کے پاس چلی جائے
یا کہیں اور نکل جائے۔
اپنے لیے منتخب خود سرائے جلاوطن کے جتنے دن وہ پورے کر سکتی تھی۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں
تھی۔
اب آئے کوئی شخص اس کی ہمدردی کا امتحان لینے۔
ہاں ہاں ہمدرد نہیں۔ وہ پامت نہیں کون ہے اس پر شغفات اٹانے والا۔
اب وہ میدان سے بھاگ کر کھارے کی کرائی بی بی کائنات میں گڑھی صلی خان جیسا تھا اس کو اس
کے لیے کٹری کا وہ جالا خلافت نہیں ہو سکا۔ وہ کوئے کھدروں کی پجاری نہیں۔ دنیا اس ہر شخص کے لیے
کھلی ہوئی ہے جو اس میں سنا چاہتا ہے چہرے کے بل سے دیکھا جائے تو نہایت ڈراؤنی لگتی ہے۔
اس نے واپسی کے بچے ارادے کے باوجود اپنی محبوبہ ہندی ترک نہیں کی۔ وہ اسی طرح عورتوں کو
درس دیتی اور بچوں کو عمارت میں پڑھاتے سوچتی رہتی۔ اس پر آخری آخری دن اپنی پھر وہاں سب سے
رخصت ہو جاتے گی۔ مگر رخصت ہونے کا تصور اس کی روح تک پہنچ لیتا تھا۔
اس بہتی میں اس نے قدم قدم پر ظلم ہی ظلم دیکھا تھا۔ لیکن پتا نہیں اس بہتی میں وہ کون سی کشش
تھی اور کہاں تھی۔ جو انسان کو بے دم کیے دیتی۔ لیکن ہاں اگر بہتی کے ان لوگوں کے دلوں میں ایک جج
بھی بویا اور اس میں سے ایک کو شیل بھی پھوٹ نکلتی تو یہ بڑی کامیابی ہوگی۔
اس۔ بچوں کے اسکول میں وہی روز کا سوختہ دھریا جس کو کن کن کران کے کان پک گئے تھے اور
اس کو دھرا لے کر چراتے اس کی زبان بچ گئی تھی۔
”خدا کی دین پر ساری کائنات ایک جیسی ہے۔ ہم میں سے کوئی کسی سے برتر نہیں۔“
”کیا پشیمان بھی نہیں؟“ یہی جہت سے پوچھتی۔ وہ ہر روز جہت فوہ ہو جاتی ہے۔
کوئی دو مہرے سے برا نہیں پشیمان، بخالی مہر ایک ہی ملک میں رہتے ہیں۔ ہم سب ایک جیسے ہیں۔

یہی آموختہ اس نے غور توں کے درمیان بیٹھ کر دہرایا تھا۔
ہاں وہ تو چلی جائے گی۔ لیکن ایک راستان جوشہ کے لیے دہرائے کو چھوڑ جائے گی۔ اگر اس کا
سکھایا ایک سبق بھی اگلی نسل نے دہرایا تو سمجھو سرجن غار سے کیا ہوا وندہ اس نے پورا کیا اور اب
آئے والی سلسلے یہ فرض چکانی رہیں گی۔
کبھی کبھی انسان ونباید لئے فکرتا ہے اور خود کو کسی افلاطون سے کم نہیں سمجھتا۔
لیکن زندگی سے تھک بار کرنا یوں ہو کر اسے بتا چلتا ہے۔ یہ سب مذاق نہیں تھا۔ اندگی تو بہت سخت
ہے۔ کروڑوں سالوں نے اس کو اس حال میں پہنچایا ہے کہ لے والے اسے دونوں میں نہیں بدل سکتے
پتا نہیں اسے اتنی مایوسی کس بات سے ہوئی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کا سہولت سے اعتراف کر کے خود بھی
اشرہ ہو گئی تھی۔ اتنی مدت سے وہ کام کاغذ میں دلائی تھی اور ہی تھی۔ لیکن اب تو اسے ایسا لگتا جیسے
کسی قدر زندہ مریض کی طرح وہ اپنی جگہ سے مل بھی نہیں سکتی۔
وہ اتنی باکل تو نہیں تھی۔
لیکن پتا نہیں کیوں زندگی نے اس کو اتنی بڑی ہشتی دی تھی کہ اس کو سہارا بھی آسان نہیں رہا تھا۔

اس دن وہ بونہی کھانے کی میز پر کھتی دیر اپنی بیٹی رہ گئی۔
کھانا کھاتا بھی کیا اور اٹھایا بھی۔ لیکن جیسے وہ بونہی عادتاً "میرے غیر مرنی ذرات سمیٹتی وقت کو
ست روی سے گزرتے دیکھ رہی۔ ست ویر تک اس کی کاہلی کا ساتھ ہے بے لویا پھر واٹھ گئیں۔ جب
سے مہمان رخصت ہوئے تھے ان کی اپنی زندگی ان کو واپس مل گئی تھی۔ وہ فرصت سے عبادتیں کرتی
تو کدوں کی دیکھ بھال اور رخت خان کے ساتھ میں ان کو پھر سے ملا آئے لگا تھا وہاں انھیں اور شیریں جیسے ان
کو نکل گئی۔ کتنی دیر شیریں سے گھبراہٹ میں گرا لے لائی سے وہ مختلف کارروائی بناتی رہی۔
اس کی دو سراجھٹ کی غرض سے ایک اکیلا بیٹھا آدمی اس کو اپنے آپ سے اٹھتے دیکھ کر مڑا لیتا رہا۔
"خیر گرم ہے کہ آپ واپس جاری ہیں۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں بات کے وزن کو ہلکا چھلکا
کر دیا تھا۔
"ہاں کل خان۔" اس نے خلاف توقع بڑی رمانیت سے کہا۔ "میں تم سے اس موضوع پر تفصیل سے
بات کرنا چاہتی تھی لیکن۔۔۔"
"لیکن بات تو میں نے کی ہے۔ اب آپ نمبر بناری ہیں۔"
"میرا مطلب جانے سے پہلے میں سب سے بات کر کے ہر حساب صاف کر کے ہی جاتی۔"
"اور اب میرا حساب بے باقی ہو رہا ہے۔ کیا روز مختصر آگیا؟"
"میں نے تمہارا اور تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ پھر غریب روز مختصر کیا چکر ہے۔"
"ہو سکتا ہو میں نے آپ کا کچھ نہ بگاڑا ہو۔ لیکن آپ نے تو میرا ست بگاڑا ہے۔" وہ ہنس دیا۔
"میلی علی میں تمہیں اس قدر تو بھول نہیں سمجھتا تھا۔ آخر کس سے ڈر کر بھاگ رہی ہو۔ اور کیا بھاگ
جانے سے مسئلے پیچھے پیچھے نہیں آتے۔"
"حق ہو تم۔" اس نے آکھٹ سے کہا۔ "میں کہیں بھاگ نہ آگ۔" میرا دانہ پانی اب نہ مل

224

سے اٹھ گیا ہے۔ اس اور میں یہاں وہ کرکول کی بھی کیا۔"
"لیکن آپ جانیں گی کہاں۔" اس کی لگرمندی اسے بہت اچھی لگی۔ وہ مسکرا دی۔ کبھی ہمیں پتا ہی
نہیں چلتا اور کوئی ہمارے لیے کتنا فکر مند رہا ہو تاکہ۔
"نہرا کی لکھن کے بارے میں وہی غار سی دلا محاورہ بولوں؟"
"اس زمین پر میں بھی بہت خوباہوں مل گئی۔ لیکن جس خیال کو بھلانے کے لیے انسان مارا مارا پھرتا
ہے وہ وہیں ملے گا۔ اس میں اسی طرح جاگزیں رہتا ہے۔"
وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش ہو گئے۔
"تم سے ایک بات پوچھوں خان کل۔" اس نے قوطی سے لیچے میں گردن جھکائے کھا۔ خان
گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کی طرف سے اس کو ہر سوال پر جواب کی از خود اجازت تھی۔
"تم نے میرے جشن پر انشیاں خان کا فیصلہ سنا تھا؟"
"نہن لیا تھا۔ اور میں تبھی سمجھ گیا تھا۔ اب تم یہاں نہیں رکھنے والی۔"
"نہا جبرے خان کل۔" اس نے اس کے لہجے کی معنی خیزی کو نظر انداز کر دیا۔ "میری یہاں تو کڑی کا
مقصد ہی اس دن تم ہو جائے گا۔ لیکن میں تم سے کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اگر۔۔۔" وہ انک کرک گئی۔
"اگر بستی والے سرجن غار اور شیریں کو قیل نہ کریں تو تم شیریں کو اپنا لینا۔ خان کل اعلیٰ ظرفی کے ساتھ
بغیر کوئی احسان نہ کرے۔"
وہ حیرت سے اس کو دیکھتا رہا۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے۔ بلا۔ میں خود کو بیش و انیال خان سے بہتر انسان سمجھتا رہا ہوں۔ اور ایسا سمجھنے
کی وجہ صرف یہ نہیں کہ میں سمجھتا ہوں اپنے میں۔ میں دیکھو بیلا۔ انیال خان اس بستی کے بلا شرکت
غیر سے اک ہیں۔ ان میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کسی بھی لڑکی کے خوابوں کے شہزادے میں ہو سکتی ہیں۔ اپنی
بڑی جاگزیں۔ موانہ و جاہت ان کی خدائی اور اوپر سے ان کا غور سمجھے ہر کام پر ہر اندام پر ان سے مقابلہ کرنا
پڑا ہے لیکن اتفاق سے ہی مجھے Approval ان کے مقابلے میں زیادہ ملا ہے۔
کیا ہی اچھا ہوتا آگے۔ اگر تم یہ مطالبہ شیریں کے حق میں نہ کرتیں۔ جہاں اس بات کو پی جاتیں۔ چھوڑ
دیتیں۔ مجھے کتنے روہڑے کا اتنا احساس نہ ہو کہ۔ میں محبت کے معاملے میں شدت پرست ہوں۔ عمل ہو
اور پھر پور جس کے داغ اور بیل پر کوئی اور ہو اور اس کے جسم کو اپنی ملکیت بنا کر میری جاگزیں میں کیا اضافہ
ہوگا؟ ہاں اگر مجھے اس سے محبت ہوئی تو میں۔۔۔"
"میں نے سوچا تھا خان کل۔۔۔"

"میں بات ادھوری نہیں چھوڑ سکتا۔" اس نے آہ سے اس کی بات کا۔ ہی۔ "نور نہ مجھے ساری
عمر افسوس رہتا کہ میں نے تم سے کہا کیوں نہیں۔ کیا تم مجھے شادی کر سکو؟ بیلا۔ شاید یہ بات کہنے
میں میں نے دیر کروی اور عید پر مجھے احساس ہوا کہ کوئی اور بازی لے گیا۔ لیکن اگر کوئی اور نہیں تو کیا میں
بھی نہیں؟"

"تم بھینا۔" پاگل ہو گئے ہو خان گل۔ "اس نے غوت سے اس کی بات کا۔ ہی۔ "تمہارے خیال میں

225

میں اس بہتی میں اس لیے داخل ہوئی تھی کہ کسی سے عشق کر کے ہی نگلوں کوئی اور بقول
تمہارے کوئی اور نہیں تو تم اور تم میں تم؟ اس نے سوالیہ انداز میں ہنسی اچکا کر کہا۔ ”قیمت خان
کہ خست خان؟“

”تمہیں غلط فہمی ہے خان بھل۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ میں اس حد تک تمہارا دل بھی نہیں توڑنا
چاہتی۔ لیکن تمہیں کوئی آس بھی نہیں دانا چاہتی۔ میں جھوٹی بات نہیں کہہ سکتی۔ اس لیے تمہیں
صاف صاف کہہ دوں۔ میں اگر کسی شخص کو پسند کرتی ہوں تو وہ تمہارے ہے۔“

اس کو اپنی ہنک کا شدید احساس ہوا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا دل چاہا وہ بھٹے میں بھری پستول نکال کر اس کا
سیدھا دل ڈکے۔ لیکن پھر اس نے صبر کر لیا۔

”یہ اچھی صاف کوئی ہے جس نے انسان کو پھلتی پھلتی کر دیا۔“

”تم مجھ سے وعدہ کرنا۔ تم میری عمر کو عزت اور سزا دینا ضرور دو گے۔“

وہ جھٹلا گیا۔ ”اور تمہارا کیا خیال ہے میں جان بھرتی ہو کر تم سے وعدہ کر لی لوں گا اور تم سے عشق
کرتے ہوئے زندگی اس کے ساتھ گزار دوں گا اور آخری صفے پر تمہیں پہلے گا کہ آدھی تو مجھ پہ مرتا تھا۔
یہ زندگی ہے بیلائی لی، کوئی محبت بھرا ناول نہیں۔ جس کو پڑھ کر دل بھڑک اٹھے اور آنکھیں چھلک
اٹھیں۔ ہر کثیف مجھے خوشی ہے بیلا! تم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ ہاں دنیا میں تم سے اتنے لوگ بھی ہیں۔
لیکن وہ تم نہیں۔ میں تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو ہوں اور خواہش کرتا ہوں کہ تم مجھے بالکل ہی بھلا نہ
دینا۔ مجھے لگتا ہے میں نے تمہارے جانے کے فیصلے کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔ اور مزید قریب بھی۔“

”نہیں۔ یہ تو پہلے مستحکم تھا۔ ہاں وقت سے پہلے پچھن کر بھی میری ضرورت تو کبھی ہے۔ میں تو کبھی کے
بغیر ہی نہیں سکتی۔“

”اسکول میں پڑھاؤ۔“

”اسکول میں ہی پڑھاؤں گی۔ لیکن یہاں نہیں۔“

”یہاں کیوں نہیں۔ ہم لوگ تو یہاں ٹھہرتے ہی نہیں۔“

”پچھلے دنوں وانیل خان بتا رہے تھے کہ اس اسکول کی سرکاری تقریر ہو گئی ہے وہ آئے والا ہے۔“

”ہاں۔ سنو ویلا۔“ اس نے اسے جاتے جاتے روکا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ واقعی بہت اچھی ہو۔ جس
آوی سے شادی کرو گی مجھے ضرورتاً اور ضرور ملنا میں اس شخص کو کچھوں گا اور سلوٹ کروں گا۔ وہ اپنی
اس قابل ہو گا کہ تمہارا اتحاد جیت سکے۔“

”تم پرانہ منانا خان بھل! اس نے مننا کر کہا۔ ”میں یہ کہے بغیر نہیں سکتی تھی۔“

”میں نے قطعی برا نہیں منایا اور میں تو بہت خوش ہوں۔“ وہ اگلے قدموں باہر نکل گیا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں ہر تھامے پائوس اور شکست خوردہ سی لڑی بیٹھی رہی۔ انسان کا اپنی زندگی پر اس
سے زیادہ اختیار نہیں۔ انہی اوقات وہ دونوں کو خوشیاں دینے لگتا ہے اس میں کامیاب بھی ہو جائے۔
لیکن اس کے اپنے عقیدوں کوئی خوشی نہیں ہوتی۔

کاش وہ سر جی ٹار کو سہرا باندھ کر اس بہتی میں آتا کہنے کی سعادت حاصل کر سکتی۔ لیکن اسے یہاں
سے بھر حال میں طے جانا تھا۔ وہ یہاں ٹھہری نہیں سکتی تھی۔

وہ اپنے ارادے میں اتنی سخت اور اتنی اعلیٰ تھی کہ اس نے ان تمام لوگوں کا ساتھ بالکل ہی چھوڑ دیا جو
اس کے ارادے کو کنٹرول کرنے کی ہر وہ جدوجہد میں مصروف تھے۔

یہ بے اسے پیغام بھیج کر ملائی رہیں، لیکن وہ نہ سر پہلے بیسے سری پٹ بنی رہتی جاتی تو رسمی سی
منگتوں سے اپنا پہلہ پتھر لیتی۔ وہ حیران پریشان سی تھیں۔ ہلانے ایسی انوکھی انوکھی حرکتیں تو بھی کی تھیں
تھیں۔ اور یہ بھی وہ ان لوگوں سے سن رہی تھیں کہ وہ عجز و عیب جانے والی ہے۔ کیا وہ واقعی چل جائے گی۔
یا شاید مہمانوں کی موجودگی نے اس کو اس قدر چڑا کر دیا تھا۔ لیکن اب تو وہ جا چکے تھے اور کوئی رکاوٹ
کوئی وجہ جھجھلاہٹان کے سامنے بھی نہیں تھی۔

وہ خان بھل کا سامنا کرنے سے کتنا ہی اگر مجبوراً ہی اس کو ان لوگوں کی محفل میں بیٹھنا پڑ جاتا تو جیسے
رہتے تھے ان کی کوشش میں لگا رہتی۔

شیریں جیسی گزرا کر داپس چلی گئی۔ مہمان رونق ساتھ لے گئے۔ (ساتھ ہی دل کا سکون بھی) اور وہ اپنی
جگہ دینے کی دیر سے تھی۔ یہ عجیب لوگ ہیں جو ایک لڑکی کو گھر سے دور و راز ایک ایسے روشنی میں پڑھنے کی
اجازت تو دے دیتے ہیں۔ اور اس پر غور بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کو شادی میں اپنی مرضی کا اختیار نہیں
دیتے۔

پھر بے سوچتیں۔ اگر اس نے واقعی جانے کا سوچ لیا ہے تو یہ باقی کیوں نہیں۔ کون سی بات
کون کی وجہ اس کے لیے رکاوٹ بن سکتی ہے۔

بے شک وہ چاہتی نہیں سکتی تھی۔ تاؤ فیکٹ وہ اس سے ملنے لے

وہ دن ہی شاید سستی میں اس کا آخری دن ہو۔

اور اس دن نے آنے میں بہت دن نہیں لگے۔ اگلے ہی روز اس کو پتا چلا سستی میں کوئی بیچون آ گیا
ہے۔ وانیل خان نے جرمے کو شیریں کی شادی کے مسئلے پر اکٹھا کیا تھا۔ اپنی رائے پیش کی تھی اور ان کی
رائے لینے کے لیے وہ بے قابو ہجوم کو ہماری کر رہے تھے کہ قیمت خان نے کوئی اطلاع دی اور مجمع تیزتر
ہو گیا۔

پری نے سب سے اسے بتایا تھا ”مجمع وانیل خان کے کہنے پر تیزتر ہو گیا لیکن پتا نہیں خان نے کیا بات
کہی کہ ہجوم غصے سے بالکل ہو رہا تھا۔ ابھی بات بدھ ہی رہی تھی کہ وانیل کوئی اطلاع دلائی اس کے بعد بابا شہر
سے باہر چلا گیا۔ خان بھی شاید کیا آپس میں جھگڑا ہو گیا ہو۔ ہم سب کو چھوڑ کر؟“



گھوڑا تیار تھا ہمیشہ کی طرح اور وہ بھی چاکس دست سے سوار ہو گئی۔ پیش کی طرح۔
اگر قیمت خان سید شریف بھی چلا گیا اور اس نے صرف آنا جانا ہی کیا تو بھی چھ سات گھنٹے سے کم کا فاصلہ
ہی نہیں۔ ہاں یہ دن یقیناً ”بستی میں آخری دن تھا اس کو فیصلہ کرنے میں بھی سہولت ہو گئی۔

اس نے گھوڑا مخصوص جگہ روکا تو اس کو لگا اس کے گھر میں آج نمایاں تبدیلی ہے۔
گھر کا دروازہ چوہت کھلا ہے جیسے رہنے والے کسی کے انتظار میں عمر بھر کے لیے کھڑا کر دیا ہو۔ رون غیر
مسلح چلنے والی ہوا سے کبھی بھی لہرا کر رہا ہوتا تھا۔ وہ بغیر رکے دوڑتی دوڑتی اندر چلی گئی۔ یہ وہی گھر تھا

جہاں بہت سے دکھ و آسانی سے جھاڑ کر باہر آئی تھی۔
 وہ اس کا کچھ بھی نہیں تھا اور سب کچھ تھا۔
 اس قسم کے ناتے کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی نام دینا کتنا دشوار ہے لیکن یہاں اگر آپ ہلکے
 پھلکے ہو جائے ہیں خوش باش۔
 وہ کئے دروازے سے سکون سے اندر آئی۔
 ہلا کر وہی اس کا تھا اور تکیوں کے سارے مسہری کی پشت سے ٹیک لگائے جیسے شدید بیمار تھا وہ
 آئی تھی اتنی مدت بعد تھی۔ معلوم نہیں بے چارہ کب سے بیمار تھا۔ اچانک ہی اس کے سر اور داڑھی کے
 بالوں میں بہت سفید بال آگئے تھے۔ چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی قناعت پاتی تھی۔ اس نے کوئی بھی
 سخت سی تکلیف جھیلی ہے۔ کسی عجیب مفاسد سے وہ اتنے بے وقت میں اس کے کام نہیں آسکتی
 لیکن اپنے لیے وہ پیشہ سے ہٹاؤ ڈالنے لگی تھی۔
 اس نے نیک نظر باپتی کی ہلاکی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ صحت مند توانا مسکراہٹ۔
 کیونکہ بیماری جسم کو آتی ہے۔ نہ بے تحیف نہیں ہوتی۔
 "تو یہ قبولت کی گھڑی تھی۔ میں اس وقت اللہ سے تمہارے آنے کی دعا مانگ رہا تھا لڑکی!"
 "آپ کچھ اور مانگ لیتے۔" وہ مامف سے اس کے بستر کے نزدیک پڑی آرام دہ کر سی پر دراز ہو گئی۔
 "مشاوہ؟"
 "مثلاً رپائی کی دعا۔"
 "نہیں بچی اب رپائی کی بھی تو مر مر جائیں گے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے سیادے چار گرے اور جانے
 کس کس سے ماوس ہو گئے ہیں۔ یہی ہو؟"
 "آپ کیسے ہیں؟" اس نے الٹ کر پوچھ لیا۔ "بیمار ہیں۔"
 "تھکا ہار۔" وہ مسکرایا۔ اب تو نہیں ہوں، لیکن قہقہے تو کی تو میں اچھا ہو جاؤں گا۔ تم بہت اچھی
 لڑکی ہو۔ کتنی دوست۔" اس نے قناعت سے کہا۔ "اگر تم اس پاس نہ رہیں تو میرا کیا بنے گا؟" وہ سخت بیمار
 تھا لیکن۔
 "مگر دوست اس قابل ہوتی تو تم پہلے ہی اس کے پاس ٹھہرتیں۔"
 "پہلے وہاں نہ ٹھہرنے کی ایک جذباتی وجہ تھی لیکن اس ایک سال نے مجھے میوڑ کر دیا ہے۔ اب
 کوئی وجہ نہیں اب میں سب کا سامنا کر سکتی ہوں۔"
 وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اس نے ایک گہری نظر اس کی طرف دیکھا۔
 "اس کا مطلب ہے کہ تم سچ بچہ ملی جاؤ گی۔ کیا ایسی ہی کوئی جذباتی وجہ یہاں سے تو نہیں لے
 جا رہی ہو؟"
 وہ لنگ رہ گئی۔ ہمیشہ اس جن سے ڈرتی تھی۔ اسے انسانوں کو چھانی میں چھان کر دانہ علیحدہ
 کر دینے کا ہنر آتا تھا۔
 وہ ساری دنیا سے منہ پھیرے کتنا انسان شناس تھا۔
 مسکراتا تھا، محض دوسروں کی بولچوٹی کی خاطر۔

اس بستی میں ہر جگہ خلوص کی فراوانی تھی اور اس فراوانی نے معاشیات کی رو سے خلوص جیسی چیز کو
 بنیاد بنا کر رکھا تھا۔
 اس کی آنکھیں غم ہو گئیں۔
 "آپ کو ہوا کیا ہے؟"
 "میں تو بیمار تھا لیکن تمہیں کیا ہوا ہے؟"
 وہ جھنجھکی۔ وہ اپنے تیز چہرے میں سرخ دم مارا۔ وہ تھا تھا اس سے چھینا، رازداری برتا یا پڑا
 میں رہنا سخت عذاب، وہ دیر تک اس کے چہرے پر اپنی تیار نگہیں گڑے کچھ سوچتا رہا۔
 "۳ فرس ہو۔"
 "نہیں تو میں دورا اصل یہ بتانے آئی تھی کہ میں یہ بستی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔"
 "اور کبھی چھوڑی نہیں جاتی۔ دیکھ لو یہ کیسی منحوس جگہ ہے۔"
 "لیکن میں تو چھوڑ رہی ہوں۔"
 "ہاں پر خوشی خوشی میں سو رہے چھوڑ چکی ہو تم۔"
 "میں نے سرب آپ کو خدا حافظ کئے کے انتظار میں اتنا وقت لگایا ہے۔" اس کی سادہ چٹائیاں ہمیشہ
 اس کی جان جلاتی تھیں۔
 "آپ مل چکی ہوں تو پلی جاؤں گی۔"
 وہ تھوڑا سا متحکم ہو گیا۔ میں تمہارے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا، تم کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو اور
 اتنی دور تک کیسے پہنچ گئیں۔ اب معلوم نہیں تم کہاں پہنچ رہی ہو وہاں میرے تصور کی رسائی ہے، کبھی۔"
 وہ خاموش رہ گئی۔ وہ تو یہ دعویٰ کرنے سے بھی قاصر تھی کہ یہ بستی چھوڑ دینے کے بعد اس کے تصور
 کی رسائی یہاں تک ہو گی کہ نہیں۔
 "میں تو لاہور سے آئی تھی۔" اس نے اس کی بات کا کیولے کر کرنا شروع کیا۔ "وہاں میرا گھر تھا۔"
 "ارے تو کیا تم گھر سے ہٹا کر آئی تھیں۔" اس نے استغناء سے پوچھا۔
 "جی نہیں، میرا گھر مجھ سے چھین گیا تھا اور ماں باپ فوت ہو گئے تھے۔"
 وہ خاموش ہو گیا۔ بعض باتیں سنگین نوعیت کی سنجیدگی میں داخل ہو جاتی ہیں، ان سے مذاق کرنا بھونڈا
 پن ہے۔ چپ چاپ، بیٹھا جیسے اس کی ہاوری کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔
 "۴ فرس ہے بعض سوالات پہلے دن میں نے غیر ضروری اور رسمی سمجھ کر ترک کر دیے تھے۔ حالانکہ
 کر لینے چاہیے تھے۔"
 "اس سے کیا ہوتا ہے؟"
 "مثلاً یہی طرح تم بھی روایت ممکن ہو۔ میں تمہیں ابھی سے ڈرا دیتا ہوں لڑکی۔ روایت توڑنے کی
 پاداش میں لمحہ لمحہ سنگسار ہونا پڑا ہے۔ ہر قدم پر ٹھوکر، ہر لفظ کھ، وہ کسی شاعر کا کیا اچھا شعر ہے۔ جو تم
 لکھائیں چھوڑ کر گئی تھیں۔ میں نے اس میں پڑھا تھا۔
 رواجیتا، بھی نہ دیکھے ہماری سمت کہ ہم
 ہزار مصلحتیں شہر کرتے ہیں

تب اک زخم جگر اختیار کرتے ہیں
 ”آپ شاید نہ ہوں۔“ اس نے افسردہ لہجے سے کہا۔ ”لیکن میں اپنی روایات کا ایک حصہ ہوں۔“
 ”میرا اسے انٹرویو تو پھر کہاں جاؤ گی۔“ اس نے تشویش سے پوچھا۔
 ”میری ایک دوست ہے۔“
 ”میں نے جذباتیت ترک کر دی ہے۔“ اس نے چور سے لمحے میں کہا۔
 ”میں سوچ رہی ہوں کہ بعض اوقات واپسی کے راستے بند تو نہیں ابھک ضرور ہو جاتے ہیں۔“
 ”نہ سہی واپسی۔ انسان آگے بھی ڈنکل سکتا ہے۔“
 ”آگے تو جنگل ہے۔ اور مشہور ہے کہ جنگل میں درندے ہوتے ہیں۔“
 ”ضروری تو نہیں کہ جو بات مشہور ہو وہ صحیح بھی ہو۔ یہ بھی تو مشہور تھا اس گھر میں ایک خوف ناک چیتا رہتا ہے۔“
 ”میں ایک چیتا ہی ہوں۔ خوف ناک، مخوف اور پھر بھاڑ کر کھا جائے والا بچاؤ لڑکی۔“ اس نے اپنا الجھ بھل کر مایوسی سے کہا۔
 ”گو میں چاہتا تھا میری زندگی میں تم یہیں ٹھہرو۔ لیکن میں تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بننا چاہتا۔ مگر میں سوچتا ہوں انسان جہاں رہتا ہے وہاں کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ تم ان سب چیزوں کو کیسے چھوڑ دے گی۔ یہاں بہت سی اور رکاوٹیں ہیں۔ یہ سچی ہے۔ لیکن سچی کے لوگ ہیں اور وانیال خان ہے، ہو سکتا ہے تم ان کو سہولت سے چھوڑ دو اور وہ تمہیں چھوڑ بھی نہ سکیں۔“
 اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔
 ”کتنے دن سے ضبط کرتے پھرے بٹھائے بندھن باندھتے آنسو۔“
 اس نے پیروائی سے اس انجی آوی کے سامنے بولنے لگا۔
 ”ان میں سے کسی کو بھی میری پروا نہیں ہے۔“
 اس نے سوچا بھی نہیں تھا ایک دن اس پر یوں بھول کی طرح رقت طاری ہوگی وہ اپنے سارے کھڑے ایک ایسے شخص کے سامنے کھول بیٹھے گی۔ جس کو وہ ڈھٹکتے جاتی بھی نہیں۔
 وہ اس کے رونے سے گھبرا گیا، کھیل سچاؤں لگا کر وہ سر پر بیٹھے پر اسان سا ہو گیا۔
 ”یہ تم سے کس نے کہہ دیا میں جانتا ہوں وانیال خان کو تمہاری کتنی پروا ہے۔ تمہارا کتنا خیال ہے۔ اور تم سے کتنا پیار ہے۔“
 ”اور شاید اسی لیے وہ حد لے خشک سے شادی کر رہے ہیں۔“
 اس نے خاموشی سے اس کا سراپے کندھوں پر رکھ لیا اس دورانے میں ایک انتہی دوست کے کندھے پر سر رکھ کر کسی دور کے اجنبی کے لیے رونا اس کو بہت عجیب لیکن بہت اچھا لگا بہت دیر وہ فرصت سے اس کے کندھے سے کئی آنسو بہاتی رہی۔ وہ خاموشی سے اس کو غبار لٹکتے کاموئیں دے کر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ شاید لفظوں کی سناپی اور نظروں کی کاریگری ساری دھڑی رہ گئی۔
 اور رونے کو ایک بھی معقول لفظ نہیں بچا۔
 اس نے اس کے آنسو پونچھے تھے نہ رونے سے منع کیا تھا۔ جس شدت سے اس کے آنسو گرے تھے

اسی ریلے میں رک گئے۔
 وہ قید تھا اور بنا رہی بجائے اس کا حال پوچھنے کے وہ اپنے دکھنے لے بیٹھی۔ وہ بڑی خاموشی سے پیار سے اس کی پیٹھ چمکتا جیسے اس کو انا سارے بچے کے خاموش حربے آنا نہ رہا۔
 اس نے آنکھیں خشک کر لیں۔
 ”آپ نے کچھ کھلایا بھی؟“ آپ تو پیار ہیں۔ آج آپ کا کھانا کون بنائے گا۔ جیسے اس نے کمال رکھ کر ایک فیصلہ کر لیا۔
 ”میں آپ کے لیے سوپ بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ اس کے منع کرنے کے باوجود اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔
 خالص گرمی کی طرح وہ دروازے میں سے سر نکال نکال کر اس سے گپ لگاتی رہی۔
 ”کیا پیار ہے جو آپ کو جس کا علاج نہیں ہو رہا۔ کیا یہ لوگ آپ کو مار رہا ہے؟“
 وہ مسکرایا وہ اپنی ہمدردی میں حالیہ بڑی کے رونے کو چھپانے کے سارے شبنم گری تھی۔
 ”زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے لڑکی۔“
 ”اور انسان کے ہاتھ میں کیا ہے۔“
 ”چولے پر رکھ کر ہڈیوں کا عرق چھین چھین کر کے ابلادہ دروازے میں سے اپنا مسلسل گپ لگاتا سر ہٹا کر چولے کی طرف دوڑی۔“
 ”مجھے پورا یقین ہے۔“ اس نے باورچی خانے میں کھڑے کھڑے اپنی آواز کے نقیض کو بلند کیا کہ وہ وانیال خان ہرگز نہیں جانتے آپ قید ہیں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ وہ کسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔“
 آگ بجلی کر کے وہ باورچی خانے کے دروازے سے باہر آئی۔ اور خوف سے اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔
 ”سوجن غار اور وانیال خان اس کے بستر کے بالکل نزدیک خاموشی سے کھڑے تھے۔ انہوں نے باورچی خانے سے بلند ہوتی آوازیں بھی سنی تھیں۔ اور دروازے سے نکلنے کے بجائے اپنی جگہ کم صم اسے دیکھا بھی تھا۔ لیکن انہوں نے اس کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔ وہ باپائی کی روانی سے بستر کی طرف لپکے۔
 وہ ہنس دیا۔
 ”ام بھی ابھی یہ لڑکی تمہارے خلاف بہت بول رہی تھی وانیال خان۔ میں گواہ ہوں، عینی شاہد۔“ ان کی آوازیں کمزوری کا غلبہ تھا۔
 وانیال خان نے پلٹ کر پھر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔
 کتنی دیر وہ حیرت سے پتھر کی مورتی بنی اپنی جگہ گڑی رہی۔ وانیال خان نہ صرف یہاں آتے جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی قیدی سے کتنی کہیں ان کا اظہار ہن بھی نمایاں تھا۔
 جیسے وہ ایک دورے سے خوب آگاہ ہوں۔
 انہوں نے پلٹ کر اس طرح باورچی خانے کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر بھی کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اعتراض تو درکنار انہوں نے معمولی سی حیرت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ وانیال خان اس کے بستر پر بیٹھے

اس کے بیمار چہرے پر جھٹکے اپنی زبان میں جانے کون سی کراہتیں کہہ رہے تھے۔
اور ان کے بستر کے بالکل نزدیک ہاتھ میں اپنا میڈیکل ایڈکس کھڑے سرجن غار خاموش اور سنجیدہ
لیکن قطعی لائق تھا۔ پتا نہیں یہ سکون اور ہمدردی کا کتنا بڑا اثر تھا۔ کبھی دیر سے جانے کب وانیل خان
اپنا چلا آئیں اور پچھتے ہیں۔ سرجن غار۔ اس نے گن اکھیں سے سرجن غار کی طرف دیکھا، سرجن
غار کو روایات توڑنا برا لگتا ہے شاید وہ بھی اس کا ساتھ نہ دیں یا شاید سرجن غار کی وجہ سے اس کی گلو
خلاصی ہو سکے یا وہ قیدی وہ آسانی سے اس کا تماشا نہیں بنے گا۔ اس میں شکایت کے باوجود اس کی
حفاظت کا جذبہ موجود ہے۔

ان دونوں کے درمیان جھڑکرات تھے غالباً کسی مرحلے پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوئے سرجن غار اپنا
بکس کھولنے لگا۔ وانیل خان پہلی مرتبہ اس کی طرف پلٹے۔
”ذرا دیکھنا یاد رہی خانے میں گرم پانی ہوگا۔“ ایسے وہ دوزخ ہی اس سے یہاں ملاقات کے غامدی
تھے سرجن غار کی تیاری میں تیز دھار سے ڈھنگ لائو اثر کی پیشی کا گناہ کھائے گئے۔

”اور ایک گلاس دودھ لا کر گرم گرم مہربانی کر کے“
وہ خاموشی سے ان کے احکامات کیل کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔
”یہ مہربانی کر کے“ لفظ پورے فحشے میں جیسے ٹھوسا ہوا لگ رہا تھا۔ ٹھوسا لگتا ہوا پانی لیے
سرجن غار کی طرف چلی گئی۔

”لو کی تم بھی ان کے ساتھ مل گئی ہو؟“ وہ تیاری میں ہنسنے کی کوشش کرتے بولا۔
”یہ سرجن غار نے تو میرے بازو چھلی کھینچے ہیں۔“ اس نے قمیص کی آستین دھول کر کے اور
چڑھائی۔

”افسوس ہے۔ لیکن بہت ضروری ہے۔“ اس کو مت عجیب لگا ہر وقت مذاق کے موڑ میں رہنے والے
سرجن غار بالکل سنجیدہ بالکل خاموش تھے۔
”میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے وانیل خان اس دن بھی میں نے کوئی چالائی تھی تو تم نے ہاتھ مار کر
اپنی ٹانگ زخمی کر لی تھی۔“

غیر شعوری طور پر وانیل خان کی نظریں لوکڑا کر بٹلا سے گرائیں۔ پھر انہوں نے ہل بس۔
”تھلا اس طرح نہیں ہوتے۔“ انہوں نے اسی کی سی جہت دھری کا مظاہرہ کیا تھا۔
”آپ ابھی ہمارے ساتھ اسپتال چلیں گے اسی وقت۔“

”میں یہ گڑھی چھوڑ کر چلا جاؤں۔“ انہوں نے چہنچہا کر اپنی زبان میں کہا۔
”اب اس وقت اگر میرا یہ آخری وقت ہے تو مجھے نہیں شک ہو سکتا۔“
وانیل خان کھتی دیر سے کسی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھا اور نہایت
شدیدی سرجن غار کو ڈاسا اس کی طرف تنگ اسی طرح مودب اور اسی طرح سنجیدہ۔

”ہم آپ کو واپس لے آئیں گے۔“ جو فنی آپ ٹھیک ہوئے یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔“
وہ شیلے کیس میں سر کو زور دے لٹکی میں بلا مارا۔
سرجن غار ایک قدم پیچھے ہٹ کر طرف چپ چاپ کھڑی رہا۔ انہوں نے ہلکا سا اشارہ کیا۔ وہ اس

سرجن غار ایک قدم پیچھے ہٹ کر طرف چپ چاپ کھڑی رہا۔ انہوں نے ہلکا سا اشارہ کیا۔ وہ اس

کو اکسار ہے تھ۔ بیلا نے حلق سے تھوک نکلایا۔ اس کو کیا کہنا چاہیے۔
”میری عمر بھر کی ریاضت برباد نہ کرو۔“ وہ اپنے فیصلے پر اسی طرح قائم تھا۔

اور اب وہ کیا کہے کیا کرے کون سے دلائل دے کس قسم کی باتوں سے قائل کرے۔ وہ کچھ بھی
آگاہ نہیں تھی۔ پھر وہ خاموشی سے آگے بڑھی، سرجن غار کسی کے لیے غلط فیصلے نہیں کر سکتے۔ اس نے
حتیٰ کچھ نہیں سوچا۔ پھر اس نے ان زرد تار ہاتھوں کو آہستہ سے اپنے ہاتھوں میں چپکنے ہوئے کہا۔

”چیز اسچنانچہ رجم کریں ہم سب کی خاطر۔“
اس نے مہمان لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا اور ہنس دیا۔ ”یہ شہروں کی دوا اس غرضی تک آئی
ہے۔ سنار شہر اس طرح جانا ہے؟ کیا بندوبست ہے؟“ وہ نیم رضامندی سے ادھر ادھر دیکھتے بولا۔

”آپ دودھ پی لیں۔“ بندوبست سب ہے۔“
وہ چپ چاپ گرم دودھ کے گھونٹ بھر کر بٹلا۔ پھر اس نے خالی گلاس کو پکڑا دیا۔
انجھٹن کے زیر اثر وہ آہستہ آہستہ غفلت کی سی نیند میں جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ بڑھ رہا بھی، پھر
اس نے آنکھیں موند لیں۔

”ذرا یہ دوسرے کمرے سے کیسے لاؤں۔“ وانیل خان اس کو سہارا دے لٹاتے ہوئے بولے۔
”میں کو پھر اٹھانا پڑے گا کیا نہیں نہیں ایک مرتبہ ہی ان کو گاڑی میں بٹھا کر۔“
”زرا ہ کر۔“ انہوں نے سختی سے اپنی آواز دہرائے ہوئے کہا۔ ”بہتر نہیں ہوگا کہ آپ مجھے نصیحت
کرنے کے بجائے میری بات مان لیں۔“

وہ بے ساختگی میں لپکی معلقہ دروازہ کھول کر وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئی، سرب ایک لمحے نے اس کو
چوڑا سا دیا۔ سارا کمرہ مختلف مجسموں سے اُبل رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ ظالم چہرے والا مجسمہ بوگیلری کے عین سامنے
اس کو خوف زدہ کر رہا تھا۔ یہاں بے حجب تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر فرصت سے مجسموں کی تاریخ پر بحث
نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے وارڈ روم کھول کر کچے نکالے اور تیز رفتاری سے نکل گئی۔
انہوں نے نیم غنڈگی میں بدوش اس کے سر کے اوپر بچوں کے نیچے کھیلے سہارے دیا۔
”یہاں سے ہلنا نہیں بیلا۔“ انہوں نے بنا کسی کو مخاطب کیے وقتوں سے کہا ”نیچلی رہنا۔“

اسے بیٹھنا ہی تھا، وہ جب بیٹھی رہی وانیل خان تیزی میں نکل گئے۔ سرجن غار وقتے وقتے سے
مریض کی ٹانگ اور نبض چیک کرتے رہے۔ وہ سبھی ہوتی خاموش کھڑی رہی۔
زندگی کتنی عجیب چیز ہے۔ ابھی وہ ہنس بول رہا تھا، ابھی اس کی جان پر بن گئی۔ شاید اسے معلوم بھی
نہیں تھا تھوڑی دیر تک وہ بدوش دوا سے بے گانہ ہو جائے گا، اور کیا معلوم وہ جانتا ہی ہو۔ اس کی
جادوگری سے کوئی پتہ نہیں۔ اس کی ہمت نہیں پڑی مریض کی صحت کے بارے میں سرجن غار سے کوئی
سوال کرے۔ پتا نہیں سرجن غار اس کو کیا کہیں اور کیا نہیں۔

باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ سرجن غار تیرکی سی تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔ اسی تیزی میں
قیمت خان بہت سے لوگوں اور بہت سے آلات کے ساتھ آیا تھا۔ وہ لوگ سرجن غار سے کچھ تفصیلات
پوچھنے لگے۔ پھر انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کو امیر لینس بٹرا ڈالا اور سارا منظر لہو بھر میں صاف ہو گیا۔

وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ بت کی مدت اور خاموشی کی خاموشی۔
اس نے بچپن میں ایک ڈوبے جہاز کی کہانی سنی تھی۔ اس میں یہ محسوس ہونے لگا کہ باپ نے اس کو وہیں
کھڑے رہنے کا حکم کیا تھا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے ڈوب گیا تھا اس کو بھی شاید ڈوبنے کا انتظار تھا۔
یا کچھ فیصلے کا وہ ڈوبتے ڈوبتے پوچھ رہا تھا بابا میرے لیے کیا حکم ہے؟
وہ خاموشی اسی طرح سہکتی کھڑی ڈوبنے کی منتظر تھی کہ اچانک قیمت خان پلٹ آیا اس کا لہجہ پیشہ کی
طرح بنیادہ سرد اور سنگین تھا۔
”خان کا حکم ہے آپ کو کھڑے ہونا چاہیے۔“ اس نے دیکھا مہربان لہجے میں بھی وہ کس قدر گستاخ تھا۔
”جلدی کیجئے“ اس نے اس کو خاموشی دیکھ کر کہا۔ ”مجھے اسپتال پہنچنا ہے۔“
بابا وانیل خان کی جیب کا گھلا دورا زنا اس کا منتظر تھا وہ چپ چاپ اس میں جاتی تھی۔
پچھلے پلٹ کر اس نے ایک نظر عقیدہ کھڑکی طرف دیکھا۔ اواس اور ویران معلوم نہیں وہ اس گھر کو پھر
کب دیکھ پائے گی۔ اس گھر نے بہت مرتبہ اس کی انگلی شون کی تھی حتیٰ کہ ایسے کڑے وقت میں بھی وہ
اس کے ساتھ تھا۔
”جلدی کریں جی۔“ اس نے اس کے کھڑے ہونے کو دیکھ کر زاری سے اس سے مخاطب تھا۔
آکٹا اور تنگ تنگ۔

پوشی و لاکھ جی جاس کی۔ ہر چیز پر رکھے۔
”کیوں قیمت خان تمہارے ہاتھ لگا کر نہیں چلائی۔“
”آپ کی یہاں موجودگی سے ہم میں سے کوئی بھی کبھی بھی لاکھ نہیں رہا۔“ اس نے گاڑی سمجھ میں
ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ہم نہایت ہی نامعقول پہنچا رہے ہوں گے۔ اگر آپ کی ان سرگرمیوں سے لاعلم
رہیں۔ ہم ایسے ہوتے تو راتوں رات ہماری سستی کوئی اکھاڑ کر لے جائے اور ہمیں علم نہ ہو سکے۔ تو سردار
وانیل خان مجھے جن کے حکم پر ہم چپ رہیں۔“ اس کا لہجہ رسیا ہی لا قطع تھا۔
وہ اپنا سامنے لے کر پیچھے بھاگتے درختوں کی کٹی کرتے لگی۔ راستہ ناہموار تھا اور جیب بے تحاشا
پکونے کھارہی تھی مثل غلابا۔ ”کیوں دور بھی جب وہ اس کو گھر کے سامنے اتار کر بیٹری میں ڈالے۔
عجیب و غریب وقت گزر رہی جائے گا وہ رات تک خود کو مختلف چیزوں میں الجھائے رہی۔ اسے یہاں
سے سرکھ جانا تھا لیکن اب تو جانا جیسے بالکل ہی واجب ہو گیا تھا۔
وانیل خان کتنی مرتبہ اس کی نظروں سے گزرتے اور اٹھتے تھے۔
لیکن یہ ایک عجیب حادثہ تھا کہ وہ ایک آدمی کو قید کر کے اس کی جان سے کھیل گئے۔ وہ قاتلوں کے اس
کھیل میں لکھ بھر کے لیے بھی شریک نہیں ہو سکتی۔ خواہ اس بستی کو چھوڑنے کی اس کو کوئی بھی قیمت
کیوں نہ دینی پڑے۔

لیکن پتہ ریل کی طرح پیچھے چھپاتے بھاگنے کے بجائے وہ کھلم کھلا اعلان کر کے جانے لگی۔ وہ دشمنوں پر
ان کے سامنے راہ نام کر کے جانے لگی۔ اس بستی میں جس میں قدم قدم پر اپنی بستی ہے۔ وہ سرجن غار
اور شیریں کو شادی کر کے سے روکنے والے کون ہوتے ہیں۔
اس نے اشتعال میں اپنا ہور سے لایا بیگ کھینچا۔ اور وہاں سے لائی چیزیں سمیٹ کر جلدی جلدی

بیک میں گرائے گئی۔
رات گئے اسے پتا چلا وانیل خان اپنی لائبریری میں کسی بیوی مصروفیت میں اٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے
رکھی اجازت ماننے والاے طاق رکھ کر بیٹری میں وہ وہیں بیٹریاں عبور کر لیں۔
وہ برائی پوسیدہ نالوں سے کچھ تلاش کر رہے تھے اس کو وہاں دیکھ کر کچھ بھر کے لیے ان کے چہرے پر
روشنی گونڈی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے لپکتے عروا نمودار بھی دکھنے چھپے نہیں تھے۔
”اوپر بلا۔“ انہوں نے جھٹکے جھٹکے سے لہجے میں کہا۔
وہ کچھ دیر چپ چاپ دروازے کے اس لگی خاموشی کھڑی رہی۔ بھلا وہ لفظوں کی سادہ سچائی بیان کرنے
کے لیے اندر آکر صوفوں میں جم جانے کی کیا مصیبت تھی۔
”تم جانے کون کون سی باتوں پر مجھ سے خفا ہو رہا۔“ وہ ٹانگیں دھپکاتا مگر اگر خاموشی سے اپنے مخصوص
آرام دہ صوفے پر اترے۔
”مور تمہاریس“ بھی جاری ہو۔ میں تمہاری ساری خفگیوں تو دور نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمارے شادی کے
لیے تم سے کیے وعدے پر میں قائم ہوں۔ تم اس شادی میں تو شرکت کر لو۔ بے کو تو اس تارائش کی
وجہ بتاؤ۔ وہ بہت بڑی بڑی چیزیں اور بہت بڑی باتیں۔ ان سے شاید یہ صدمہ برداشت نہ ہو۔ اور شریں خان
میں کیا تم نے سوچ لیا ہے۔ تم کسی کی خوشی کے لیے چند دن بھی نہیں ٹھہرو گی۔ ان کی آواز منت کے سے
لہجے سے شروع ہو کر ہنسیا بہت میں داخل ہو گئی تھی۔
”تم بہت خود غرض ہو رہا۔“ پیرا خیال ہے میں ہو کچھ دن تک تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں مجھے
اس مسئلے میں اپنی رائے بدل لینی چاہیے۔ تمہیں تو اس شخص کا بھی احساس نہیں جو اس وقت بار بار
زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔“
”دو بے غرض، تو تو آپ سی ہیں۔ جو اس کو اپنی جنگ میں جھونک کر یہاں مزے سے اپنی جاگ میں
اشافہ کرتے۔“
”مجھے تمہیں اس کی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر خفگی سے
کہا۔ ”لیکن یہ اسی کی ضرورت کے چند مطلوبہ دستورات ہیں جن میں تلاش کر رہا ہوں تاکہ زندگی کو اس
کے لیے چند دن اور دھونڈ سکوں۔“
”کیونکہ تو جاس گئے نا؟“ اس کی آواز پھر اپنی ہو گئی تھی۔
”کیونکہ تو کریں گے بھی کیا؟“
”وانیل خان۔“ اس نے پہلی مرتبہ ان کو فیصلہ کن لہجے میں ان کے نام سے پکارا تھا۔ اور وہ بھی اس
انداز میں کہ جس نے وانیل خان کو پتہ لگا دیا۔
”آپ نے ایک شخص کو اپنی ذاتی وجہ سے قید کر لیا۔“ آپ نے ان کو تیار کر دیا۔ ساری زندگی وہ ملانے سے
محروم رہے۔ جی کہ وہ موت کے منہ میں جا پہنچا۔ اب آپ ان کے لیے زندگی دھونڈ رہے ہیں۔
میں تو اس بستی سے چلی ہی جاؤں گی۔ لیکن مجھے میری خود غرضی یا دولا نے سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ
آپ کی اس شخص سے کیا دشمنی تھی۔ کیا لگاؤ تھا اس نے آپ کا؟“
”دشمنی۔“ انہوں نے حیرت سے دہرایا۔

”تو تم کچھ نہیں جانتیں کیا؟“ وہ اس کے برابر اگڑے ہوئے۔ ”وہ میرا گھائی ہے۔ گھاس نے اسے جیتوں کے آگے نہیں ڈالا۔ بہتی واولوں کے خوف سے چھپا دیا۔“

کسی بہت ہی اوق زمان میں بولے گئے ان لفظوں کے جسے وہ معنی سے آگاہ نہیں تھی۔ کبھی غلطی سے بھی اس کا حسیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ کیا وہ اتنی ہی کٹھن آکسی ہی کم عقل تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مخاطب کے اس انکشاف پر یقین کر لینے کی ہی کیفیت سے وہ چار پریشان ہو رہی تھی۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ اور حیرت اس قیدی کے ضبط پر ہے جس نے اتنی معمولی بات کو اتنا برا اور زنا کر بھی زبان نہیں کھلی۔ حالانکہ وہ اس سے کتنا بار کٹھنی بھی۔ کتنا احترام دیتی تھی۔ لیکن اس نے اپنی زندگی کے اس مسئول سے سبق میں بھی اس کو شامل کرنا پسند نہیں کیا گیا وہ اس کا بھی اشارہ بھی کے ظالموں میں سے کرتا تھا۔ اس کو اچانک جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی۔ کیا اس کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ اس پر محروس کرنا اور اپنی کمائی کا ڈاکہ اس کا پارا اور بے غرض ما دوست جسے بالکل روکھا اور انجینی اجبی ہو چکا تھا وہ غالباً اس کو بھی بہتی کے چند ظالموں میں سے سمجھتا تھا۔ دل اور ذہن کے سارے رشتے اس کے نزدیک ہے وہ بے کار اور رمی ہی ہوئے۔ اس میں اور قیمت خان میں کیا فرق ہوا؟ انیل خان کے بھائی نے غالباً اس کو بھی قیمت خان سمجھ لیا تھا، محض بہتی کا خیر خواہ ایک مٹھیں ایک چٹا روپے والا بڑھ بھس کی سیلیوں کے پیچھے نہ دل ہے نہ کھوپڑی کی بڑی مٹی بیچر کا لٹہ ایلانی بیچو قلمہ تم کو کسی کی ایک اپنی ملازمہ ہو لڑنا تمہیں وہ مرتبہ دیا ہی نہیں جاسکتا ہو کھر اور اس کے کینوں کو حاصل ہونا ہے۔

جسم سے سارا خون ایک گتہ جمع ہو کر اس کے چہرے پر آگیا۔

اس نے سوچا وہ تیار ہے۔ لہذا ایسے کٹھن وقت میں خود رنجی ترک کر کے اس کو حقیقت کا سامنا کرنا ہو گا۔ وہ ایک گولہ سراس نے سر پہنا کر چپ ہو گئے تھے۔ اس نے سرائی کران کی طرف دیکھا چاہا لیکن اچانک سر جیسے ستون ڈھکیا۔

بعض اوقات انسان شناسی کے دعوے کس قدر ناکارہ ثابت ہوتے ہیں اسے خود انسان کے اندر تک اتر جائے گا جو گمان تھا، وہ کتا بوا نہایت ہوا، وہ آج تک مخاطب کو ظالم و جار اور چالے کیا کیا سمجھتی تھی۔ کبھی کبھی خود بخود سوچ بدل جاتے ہیں۔ جو ہمیں ظالم لگتے تھے وہ ایک دن مظلوم ہو جاتے ہیں اور درحقیقت جو ظلم بھگاتا ہے وہ محسوس کرکھائی دیتا ہے۔

کون بانیے ہر ایسے ظالم کے اندر دکھ کے لئے لازماً سنگ رہے ہوں؟ وہ اندر سے کتنا بے تزلزل کتنا سادہ اور کتنا خالص ہو۔ اس نے اسی خاموشی کو طویل دیے سر جھکائے رکھا اس میں سر اٹھانے اور مقابل کی نظروں کا سامنا کرنے کی تاب بھی نہیں تھی۔

کڑھی مٹی خان کے اس قیام میں اس نے قدم قدم پر انیل خان سے نکلی تھی۔ ان کو برا بھلا کہا تھا، ان کی توہین کی تھی اور اپنے ہتھیار اکیمز روپے میں انہیں بھی ایسا موقع نہیں دیا کہ وہ دشمنانیت سے کبھی مہر و سروں کو گرا آئے گرا تے خود گر جاتے ہیں۔

”سوری“ جیسا بے کار اور حقیر لفظ اس کو اپنی عزامت کے سامنے بے معنی لگے وہ بچھتاہوں کی رسم

236

اٹنے روایتی انداز میں ٹھہرائی نہیں سکتی تھی۔ وہ خاموش کٹھنی اپنے سے چند انچ مقابل کھڑے بیروں پر نظر پر ہمارے خورے ابھتی رہی۔

”لیکن افسوس ہے جلالی بی! اگر آپ نے کبھی انسانوں کو سراہا ہی نہیں۔ کسی کو کچھ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ نہ کسی کا اعتبار کیا نہ کسی کو اچھا دیا، آپ کے نزدیک ہر شخص کینہ اور بد خلعت ہے۔ ہر شخص ظالم ہے، سب سب سے نفرت کرتی ہیں۔ خواہ وہ میرا بھائی ہو۔ بے پے ہوں تھان کس ہوں اور میرا تو کوئی مرتبہ ہی نہیں۔“

آپ کے نزدیک ہم محض پھان ہیں، اور آپ محض چٹائی ہمارا آپ کا رشتہ سرحدوں کے حسیب سے تعین کیا جاتا ہے۔ جہاں آپ کا علاقہ ختم ہوتا ہے وہاں سے رشتے داریاں بھی ختم ہوجاتی ہیں۔ آپ کو تو سرجن شاعر سے بھی کوئی دلچسپی نہ ہوتی اگر وہ آپ کے صوبے سے نہ ہوتے اور شاید انہی کے غفیل شیریں کو آپ کا رستہ شفقت حاصل ہے۔“

انہوں نے کہہ دیا رک کر اپنی باتوں کا رد عمل اس کے چہرے پر جھانک گھرے سرخ رنگ کے ساتھ وہ چوڑے جھکے مسلسل ان کے بولوں کی چمکتی نور نظرس جھلنے لگے کسب کچھ چھپائے ہوئے تھے۔

انہوں نے اس کے سر کو اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں جکڑ کر اونچا کر دیا۔ کتنی دیر وہ اس کی آنکھوں کے جھلنے رنگ پر نظرس جمائے اس کے تیزی سے حرکت کرتے ڈھیلوں کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے رہے۔

”بہت تیار، نکلی تعلق یہ سب چیزیں تو آپ کے لیے قطعی بے کار اور بے معنی ہیں۔ ان کا نہ کوئی مفہوم ہے نہ مقصد۔ کیونکہ آپ نے خود کسی سے پیار کیا ہے نہ کسی کو اس قابل سمجھا ہے کہ وہ آپ کو چاہ سکے؟ انہوں نے رک کر لامنت سے کہا تھا۔

”اور آپ کے نزدیک تو ایک مرتبہ ہونے آدمی کے لیے چہرہ سال پانے نکاح ہائے کی تلاش بھی بے مصروف ہے کیونکہ اس سے اس کی زندگی میں گھنٹوں کا نہیں تو لمحوں کا ہی اضافہ ہو سکتا ہے۔“ اس نے سر کو ہلکی سی جھنجھٹا کر ان کی جھنجھلائی گرفت سے آزاد کر لیا۔

”ہاں، آپ چاہیے واپس ہم سب آپ کے لیے رنگ ابلو پرزے ہیں۔ ہماری آپ کو ضرورت ہی کیا ہے؟ کون ہے یہاں جس کے لئے میں آپ غمخوار ہوں؟ کس کی خاطر؟ اور کیوں؟ آپ کے لیے تو وہ شخص بھی بے معنی ہے جس سے ملنے کے لیے آپ اچھے برے موسموں میں چوری چوری حوڑا ڈرتا رہے۔ تالی سے جاتی تھیں۔ آپ نے بھی اس کا دل نہیں چاہا، کبھی اس کے دل کی جلن بھی معلوم نہیں کی، کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟“

اس کا کچھ چاہا وہ جھنجھلا کر چیخ پڑے۔

وہ کون تھا کسی اور شخص کے بارے میں اس سے باز پرس کرنے والا۔

وہ اس کا کیا لگتا تھا۔ اور کس حد تک عزیز تھا؟ اس بات کی وضاحتیں اور توجہات اس کو دینا بھر میں کسی کے سامنے نہیں کھلی تھیں۔ کسی کے آگے جواب نہ نہیں تھی۔ وہ اسی طرح چپ رہی۔ سوری نہیں وہ جو سوالات کرتے تھیں ان کے جوابات بھی ان کو مسیحا کیے جاتے تھے۔

پھر وہ اس کی مسلسل خاموشی سے چڑھ گئے انہوں نے اس کی دونوں کمزیاں مضبوطی سے پکڑ کر جھنجھوڑ

وایس۔
”جیسے کوئی حادثہ کوئی واقعہ میں چڑکا سکا بیلا وہ کسی کی موت ہو یا شادی، جاؤ جا کر جشن مناؤ، جاؤ واپس اس ان بڑے لوگوں کی بستی سے“ اپنے شہر میں جا کر لوگوں کو داستانیں سناتا کہ تمہارا کب سے موت سے توجہ دل سکنے کے لیے چھوڑ آئی ہو اور تم اپنی انا پرست اور خود راہ کو کہ ان میں سے ایک سے بھی تمہارا دل نہیں پیچھا۔ کوئی تمہیں رام نہیں کرے گا۔ تم کو نیچا رکھانے آگئی ہو۔ جاؤ۔“
انہوں نے اپنی اپنی گرفت میں جھنجھوڑتے جھنجھوڑتے اسے ایک دم چھوڑ دیا۔

وہ جھوٹا سا کھاکر کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔
اس کے بازوؤں پر جہاں ابھی اس ظالم شخص کی مضبوط گرفت تھی، مسٹانٹ سی ہو رہی تھی۔
لیکن اس نے خلاف عادت کوئی گل نہیں چھایا۔
پلٹ پلٹ کر کھڑے کھڑے جواب نہیں دیے۔ جھگڑتے ہوئے اس شخص کی حسب عادت تشویش نہیں کی کہ ہر کھڑے کھڑے جواب نہیں دیے۔ جھگڑتے ہوئے اس شخص کی حسب عادت تشویش

وہ مجرم تھی اور خاموشی سے اسے اور عائد فرما رہی تھی۔ سلسلہ دار اور ترتیب دار سن رہی تھی۔ یہ اس کے اپنے ظلموں کی داستان تھی جس کی تاریخ اس کو کسی میں لوگ جانے کب سے لکھ رہے تھے۔
انہوں نے اس کو جھنجھوڑا لگا تھا، اور شاید وہ اسے دکھاوے کو کر رہی تھی۔ لیکن اس کے مسلسل سکتے نے ان کو جلد سا کر دیا۔ شکست خوردہ ہر حال سے دانیال خان اپنی آرام کری پر گرنے والے انداز میں جا بیٹھے وہ نہایت ناموشی سے مصنوعی گلابوں کی دھبکی آگ سے لپکتے شعلوں پر نظریں جمائے لیٹے پھر کے لیے ساکن ہو گئے۔ چاہیں یہ کتنے شعلے کتنی کھاس کھاس بھڑک رہے تھے۔ ان کے ارد گرد بھی ان کے اندر بھی۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ اس کو نیچے بچے کی طرح محسوس اور سچے لگے خوابوں میں بھی رکھتا ہے، جھنجھوڑ کر اپنے کھلنے بھی بٹھکتا ہے۔ لیکن کبھی اس کی ہر ضد پوری بھی نہیں کی جاتی۔
اس کے پاس معذرت کے الفاظ کا تمام ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ ان سے سست کچھ کرنا چاہتی تھی۔ معافیوں اور کوتاہیوں اپنی کتابوں کی معذرت سمجھنے والے کی خلاف

”کئی اہم سوری۔“ بہت دیر بعد ان کی غیر معمولی طور پر بھاری اور بوجھل سی آواز ابھری۔ انہوں نے اپنی گردن کمر سے زیادہ آتش وان کی طرف کر رکھا تھا۔ جیسے وہ اس سے دیر تک کچھ چھپاتے رہے تھے۔
”آپ کچھ خیال نہ کیجئے گا۔ میں کچھ الجھ گیا ہوں۔“ وہ دانستہ طور پر خود کو چھپا۔ کرناگ کو دکھا رہے تھے۔

وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ بل پائی۔ جیسے بڑی فراخ دلی سے اس نے ان کی معذرت قبول کر لی ہو۔
یہ وہ موقع تھا جب بیان دانی کے بڑے بڑے دعوے جھوٹے پڑ جاتے ہیں وہ ان سے اس وقت کچھ بھی کہتی۔ ایسے لگا جیسے ان پر رحم کھایا جا رہا ہے۔ ان پر کسی کو ترس آگیا ہے۔
ہاں وہ مظلوم تھے لیکن اسے اور ترس کھلوانا بھی ان کو پسند نہیں تھا۔
رحم ان کے لیے کچھ پسندیدہ فعل نہ ہوتا کہ وہ رحم اور ترس بانٹتے آئے ہیں۔

ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر قسٹ خان اندر آیا۔
اس کے سینے سے وہ خاموش اور ساکن کھڑی تھی۔
صاحب مختلف انداز میں اس لڑکی سے رخ پھیرے جیسے کسی کیفیت سے گزر رہے تھے۔
ان کے کرب کا سبب یہ لڑکی ہو رہی ہے یا شہت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اس صورتحال میں اچانک اندر چلا آیا لیکن اس نے کوئی معذرت نہیں کی۔ شاید اس کے پاس وقت نہیں تھا اس نے ایک کڑی نظر دیا پر ڈال دیا وہ اس لڑکی سے اکٹرا چکا تھا۔ جب بھی جہاں بھی فساد ہوتا ہے وہاں یہ لڑکی ضرور موجود ہوتی ہے۔

”وقت کم ہے صاحب۔ بھاگتے بھاگتے چلیں تو تمہیں گھینے نہ کم کیا لگیں گے۔“
”ہاں۔“ انہوں نے چونک کر کھاک کی طرف دیکھا۔
”واقعی بہت دیر ہو گئی۔“

وہ تیزی میں لپٹے تو ان کا چہرہ شدت سے سرخ ہو رہا تھا، ”کبھی جیسے شدت برداشت سے لال ہو جاتی تھیں۔ وہ اس کو نظر انداز کر کے اس کے برابر سے گزر گئے۔
”گاڑی تیار ہے؟ گاڑی بدلا گیا؟“
”صاحب۔“

وہ دو توں کا ”گاما“ تیز قدموں سے دروازے کی طرف چل پڑے۔
”میں بھی ساتھ چلوں؟“ تیز قدم اس کی دھڑکنے والی آواز کے سامنے ایک دم رک گئے۔
ان دونوں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ ان دونوں کا تاثر ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف تھا۔ قسٹ خان کے پس میں ہوتا تو ایسے انتہائی غمی معاملے میں اس کی بداعلت برداشت بھی نہ کرتا۔ لیکن جانے وہ اسے کب سے برداشت کر رہا تھا۔ اس نے ایک برہم سی نظر اس پر ڈالی اور صاحب کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے وہی نظر صاحب پر بھی جھینکی تھی اور کڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ صاحب کو وقت کی ہلاکت خیزی سے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں۔ ضرور۔“ وہ سرد سے سچے میں کہہ کر آگے نکل گئے۔
اس نے ان کے روئے کھلے سے کوئی مطلب اخذ کرنے کے بجائے ان کے پیچھے بھاگتا مناسب سمجھا۔
”سب کو بتا دوں؟“ اس نے اجازت لینے والے انداز میں دوڑنے دوڑتے ہوئے چھاپا۔ وہ اس ظالم شخص کے سر کے نیچے کے پاس رک گئے۔ وہ ہمیشہ ان پیچھے لیوں والے شخص کو ظالم سمجھتی تھی۔ لیکن اب تو اس کے ظلم کی داستان اس پر بھی عیاں ہو چکی تھی۔ یہ سردار دانیال خان اور سردار بندے آل خان کلبا ہی تھا۔

”کیا بتاؤں؟“ انہوں نے وہ سچے میں رانت بھیج کر پوچھا کہ بندے آل کو ہم نے قتل کرنے کے بجائے آج چند سال بعد ہسپتال میں داخل کر دیا ہے۔

وہ نال سی گئی۔ ”اگر ان کے علم میں آتا تو میں کیا جواب دوں گی۔“
”آپ کہہ دیجئے گا کہ آپ کچھ بھی کہہ دیجئے گا میں سنبھال لوں گا۔“
انہوں نے جیب کی پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لیے اگلی نشست کی بیک گرائی۔ اور جلدی جلدی اپنی

شیشیں بند نہ لیں۔
گاڑی قیمت خان چلا رہا تھا۔ اور رات بالکل تاریک تھی۔
”وہ پے کر کم کپڑے تو مناسب بہن رکھے ہیں نا؟“
وہ جانتی تھی وہ اس وقت وضع داری سمجھا رہے ہیں۔
”جی ہاں۔“
”یہ تقریباً“ میں ساڑھے تین گھنٹے کا سفر ہے۔ پیچھے کتنے رکھے ہوں گے۔“
”چھٹی کی۔“

پھر دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ یہ ایک خاموش رات کی ویران سڑک تھی۔ گہری کھائیوں اور دیو قامت پہاڑوں کے بہوت کے سوا سڑک پر کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب بار بار موڑ کا تکی تھی قیمت خان اپنے ماہر ہاتھ مضبوطی سے اسٹرینک پر رکھے ہوئے سولے سے جیب بھٹکا رہا تھا۔ تیز روشنی کا ہلکا سڑک پر دوڑتے پھیلا ہوا تھا اور وہ اس روشنی کے پیچھے پیچھے اور تازہ جیسے نور کی تلاش میں تھا۔ قیمت خان کو جیب کے اندر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا سارا دھیان باہر کی طرف تھا۔ اندر کیا رہا تھا۔ اس کی ہلا سے۔

اس نے ایک اچھٹی سی نظر ڈرا میور کے ساتھ بیٹھے شخص پر ڈالی۔ ان کی پٹھانوں ایسی سرخ و سفید گرہن پر ملیے سے کترے ہوئے بال کار کے نزدیک آ رہے تھے۔ ان کی اپنی شخصیت کی طرح اجلا املا اور اکڑا اکڑا کار۔ اس نے مددگار میں یوں ان کو نزدیک سے دیکھا تھا۔ اور فرصت سے دیکھا تھا۔ کیونکہ اس وقت یوں اس کا تھکیل سے جائزہ لیتا چکا نہیں جاسکتا تھا کہ ان کی آنکھیں پیچھے کی طرف نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

پتا نہیں یہ شخص ظالم تھا یا مظلوم؟ ہر روز اس کی کتاب سے ایک نیا ورق کھل جاتا۔ اور ایک نئی الجھن نیا مسئلہ سامنے رکھ دیتی۔
”کسی دن اور بھی فرصت سے اس شخص کا اس دنیا میں مرتبہ اور مقام کھوجنا تھا۔“
لیکن اب کیا مجھے؟

اچھے ہوئے چوڑے شانوں کے اوپر وقار سے سجا ہوا سر۔ کسی بھی ظالم انسان کا نہیں ہو سکتا۔ اپنی ذات پر یہ اعتماد اور سکون انسان کو صرف ضمیر کے آئینے میں ملتا ہے۔ وہ آج تک اس پر وجود بڑے بڑے بہتان باندھتی رہی تھی وہ ان ہی سے مبرا تھا۔
نہ اس نے کسی کو قتل کیا تھا نہ قید کر رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک ہی کڑی کے دو برے تھے۔

اب وہ اس پر الزام لگائے تو کیا۔ اور الزامات کی خلافی چاہے تو کیسے۔
بے ساختگی میں اس کی نگاہ شیشے کی طرف اٹھی۔ وہ اس کو بغور دیکھا۔ دیکھ رہے تھے وہ جمل ہی ہو گئی۔

ایسی باتوں کی وضاحت کے لیے معذرت کے کوئی طریقہ بھی باہجاء نہیں ہوئے۔
اس نے کڑی سے ہاتھ دھکا۔ رات کی تاریکی اور سیاہ ہو گئی تھی۔ راک کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی۔ رات کا جانے کون سا پتہ تھا۔ جب جیب ایک ویران سڑک آبادی کے قدرے باوقر ہسپتال میں داخل ہوئی۔ بہت مدت بعد اس نے شہر آبادی کے اثرات دیکھے۔ رات تاریک تھی لیکن مریضوں کے

لوہا حتمی برآمدوں اور بار کول میں گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسپرٹ اور فٹائل کی تیزبو کے ہتھکے باغ میں اترے تو اسے محسوس ہوا وہ ہسپتال میں آچکی ہے۔ یہ سوائت کے کسی سابق شہزادے کا ہسپتال تھا۔ اس کا نام اور تاریخ تعمیر ہسپتال کی پیشانی پر نمایاں طور پر آ کر اس تھی اور برقی قہقہوں سے جھلک رہی تھی اپنے نام کو ہر وقت روشن دیکھنے کی شہرہ خواہش نے کم از کم ایک ٹھیک تو کروائی ہے۔
ہسپتال کے فرش جگمگا رہے تھے گاڑی پارکنگ ایریا میں گہری گڑبڑ کر کے قیمت خان باہر آیا تو دانیال خان پہلے ہی ہسپتال کے رہسبھشن تک پہنچ چکے تھے۔ قیمت خان اس کی ہمراہی کے لیے تھوڑا سا سست پر گیا۔ چھت پر نصب نیم کول بیلوں میں فرش پر ان کے ساتھ پانی میں لڑاتے عکس کی طرح ڈول رہے تھے۔ جیسے وہ کوئین آف شیا تھی۔ حالانکہ یہ عمل اس کا نہیں تھا۔

قیمت خان نے تھوڑا سا موب ہو کر روانہ ہوا اور اس کے اندر داخل ہونے کا انتظار کرنے لگا تینوں آگے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔
رات کے اس آخری پیریش بھی وہ جاگ رہا تھا۔
اور مٹھتا تھا؟

مٹھتا تھا کہ اس کی آنکھیں دروازے کی سمت مڑی ہوئی تھیں۔ ان تینوں کو تیزی سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کے بے رونق چہرے پر ہلکا سا ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ نڈھال تھا۔ دنوں کے بھانے جیسے برسوں کا مزاح لگ رہا تھا۔ شہر بھرے کواڑی میں گئی تھی۔ آنکھوں کے حقے میں گڑھے اور نمایاں اور سیاہ ہو چکے تھے۔ متحرک ناپتے مٹتے ڈھیلے جیسی زندگی سے بالکل محروم ہو چکے تھے۔ آنکھوں سے برقی موتی نے اس کا دل دھک سے گزرا۔ اس نے کچھ دیر پہلے اس کو اتنا خف آؤ ڈھال تو نہیں دیکھا تھا۔

”علی گیلہ۔“ اس کا نگاہ کسی پر نہیں پڑی سوائے دانیال کے۔ اس کی آواز کی بے آلی ہلا سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اسے جس چیز کی ضرورت تھی اس آس نے دانیال اس کو بغیر دانیال کے مزید زندگی دی تھی۔
”علی گیلہ۔“ انہوں نے ایک بوسیدہ سا چار حصوں میں تقسیم کھنڈ موٹی لفافے میں لپیٹا اس کو تھما دیا۔ وہ کاچتا ہاتھوں سے لفافہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش اور رعشہ بہت نمایاں تھا۔ دانیال خان نے جیسے اسے خودی اچھٹے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ شاید اسی میں ان کے لیے کوئی مصلحت ہو۔ تاکہ وہ اپنی خوشی کو آہستہ آہستہ پائیں۔ یا شاید اس لیے کہ ان کا یوں خالی پڑے موت کی راہ دیکھنے سے کسی کاہ میں مصروف رہنا بہتر تھا۔

لیکن اس سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے سکون سے لفافے کی لٹھیں کھولیں۔ بندے دل کی نظر پہلی مرتبہ اس پر پڑی تھی۔
اس کو مصروف عمل دیکھ کر اس کی مود آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی لہر دوڑی۔
”یہاں بہت اچھی لڑکی ہے دانیال۔“ اس نے دانیال کے چہرے پر کچھ ڈھونڈھو نہ کر کہا تھا۔
”میں جانتا ہوں۔“ وہ قطعیت سے کہہ کر خاموش ہو گئے۔

ان دونوں کی طرف سے بے درجہ لٹائے گئے ان سرخ و سفید کھنڈوں میں کتنا خلوص تھا اور کتنا رواداری۔ اس سے پوشیدہ نہیں رہا۔ قیمت خان نے ایک خاموش نظر چاروں طرف ڈالی۔ پھر خاموشی سے دروازہ

کھول کر ہر نکل گیا۔
اس نے کھلا ہوا۔ عداوت کا فضا پلٹ کر دیکھا۔ ایک تائیدی سی نظر ان پر پڑی۔ جیسے اسے یقین ہو گیا کہ اس سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔ اسے بھلا یا نہیں گیا۔
”ہاں۔ کی۔ بالکل کی۔“ لکھی دیر جیسے وہ اس کی ایک سزا اور کر رہا۔
الفاظ اور ہر تار پر۔ رقوم ہلکے آواز میں پڑھتے دیکھ کر اس نے ہنس کر کہا۔
”جو مذاہب میں نے بروا کرتے کیے ہیں وہ تم نہیں کرتا۔“
اس نے تندی دینی انداز میں جیسے انہیں کچھ بتانا چاہا تھا۔ وانیل خان نے اس کی نصیحت کو لا پرواہی سے سنا جیسے اپنی شدید بیماری میں کچھ اول فوٹ کی ہوتی رہے تھے۔
”تم نے سنا وانیل۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“
”میں نے سن لیا۔ آپ جانتے ہیں آپ کی سب باتیں میں وضاحت سے سنتا ہوں۔ آپ ابھی تک سوئے نہیں۔ کیسے ہیں۔؟“ انہوں نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے گرم ہوش ہاتھوں میں دیا۔
”چائیں۔ مجھے لگتا تھا یہ کھانڈھے مل گیا تو زندگی مل جائے گی۔ لیکن زندگی کا لٹنا شاید آسان نہیں۔“
اور مٹی خیر انداز میں ہنس دیکھے۔
”ساتھ میں وانیل۔ زندگی ایک مرتبہ ملتی ہے۔ بڑھل مت۔ بھلا۔ یہ برقی چھوڑ دینا۔ دیکھا چھوڑ دینا۔“
لیکن۔
”آپ نے روایا۔؟“ انہوں نے بڑھل کر ان کی بات کاٹ دی۔ وہ بھائی کا فخر و مکمل سننے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ بولا کہ جیسے وہ خود ان دونوں کی گفتگو میں رکاوٹ کا سبب ہے۔ وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کر دوا کی شیشی دیکھنے لگے۔
”میں نے لیٹی تھی شاید۔ ترس کچھ دے کر تو جی تھی۔ اس ہسپتال میں دیکھ بھال اچھی ہوتی ہے۔ یہ تو مزید بھی بہت ہو گا وانیل۔“
وہ ان کا دھیان پڑانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔
”آپ اب بھی مزید نہیں کہ آپ سے مزید ہو۔“
ان کے ان نظروں میں محبت کے علاوہ اظہار پر فزاد اور تھا۔ اور شاید اس وقت ان کو کھلے اظہار کی شدید ضرورت تھی۔
”تم نے اپنی کرلی۔ مجھے لے آئے۔ چلو کرو کچھ۔“ ان کے نظروں میں زندگی سے مایوسی کی شدید بر آتی تھی۔
”اور یہ لڑکی کیوں کڑی ہے جب سے؟ آپ اس کو کس بات کی سزا مل رہی ہے۔“
وانیل خان نے ایک نظر اس کے اوپر اور خاموشی جڑے کو دیکھا۔ کمرے میں اضافی بلیک کے علاوہ کرسیاں تھیں۔ لیکن شدید وہ ہال بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے ان کے پاس کی جگہ خالی کر دی۔
وہ وانیل خان کی چھوڑی ہوئی جگہ پر خاموشی سے ان کے بید کے بالکل پاس ان کے نزدیک آ بیٹھی۔
انہوں نے اپنا ہاتھ لگا کر۔ آہوا اور ٹھاسا ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔
”آپ ابھی ہو جائیں گے۔“ اس نے پیار سے کہا تھا۔

”جھوٹ بولنا کہ ہے لڑکی۔“ انہوں نے اپنی برائی جو بچال آرا زبہ حال کرنے کی کوشش کی۔ ”اور پاپوس ہونا اس سے بھی بڑا۔“
وہ ایک دم ہنس دیکھے۔ ”اب یہ کچھ کہہ رہی ہے۔ وانیل۔ اور تم نے اپنا ہاتھ نہ بھلا دیا۔؟“
”کیوں سنا؟“
”میں اس سے نہ جانے کا۔“ وہ سرخ پڑ گئی۔ لیکن اس موضوع پر بات چیت نہ تباہی کا رہی سمجھا۔ وہ چپکی رہی۔ بغیر کسی موضوع پر کوئی بحث کیے۔
وانیل خان نے کمرے کمرے ہی چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔
”آپ دو دنوں اپنی معنی خیز گفتگو جاری رکھیے۔ میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔“
بڑا کرگاہ۔ راستہ وہاں سے چلے گئے تھے۔
شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ بندے اکل خان اپنے ذہن کو ہلکا پھلکا کر لیں۔ اپنا بوجھ کسی اور کے سر پر ڈال کر۔
”آپ کا دل چاہے تو مجھے آواز دے لیں۔ میں ڈاکٹر زروم میں ہوں۔“
پھر وہ چلے گئے۔ اور وہ دونوں خاموشی سے ہو گئے۔ اس کا جی چاہا وہ ان سے اسی طرح باتیں کرے ان کو چیتے۔ ان سے جھڑپ مول لے۔ شاید اسی طرح مرض کی شدت میں کمی آجائے۔ شاید اس طرح کھٹک ہو جائیں۔ لیکن یہ وقت بہت تکلف ہو سکتا ہے۔
اسی لیے ”نانا“ وانیل خان اس کمرے کو چھوڑ گئے ہیں۔ وہ بھی سچائی کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں۔ وہ اپنی نگاہ اور ہر اصرار سے بھٹانے لگی۔ اب کون سا موضوع چیتے کرے۔ کون سی بات کرے؟
لیکن وہ بڑھل نہیں تھے۔ وہ بٹکے سے مسکرائے اور انہوں نے بڑے سکون سے بال اپنے رنگ میں کرلی۔ ”اگر تم اس سے ملتیں تو خوش ہو جائیں۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ بھلا۔“
”وہ کہاں تھی۔؟“ بھلا نے مری سی آواز میں پوچھا تھا۔
”اس زمین کے نیچے جہاں آخر کار ہم سب کو جانا ہے۔“ انہوں نے خاموشی سے جیسے کہیں اور جاتے کہا تھا۔
”وہ تمہارے جیسی تھی بھلا۔ وقت نے اس کو مہلت نہیں دی۔ ورنہ تم دیکھتیں۔ یہ قسمت بھی عجیب چیز ہے بھلا۔ وہ ہمارے دشمن کی بیٹی تھی۔ اور تم یقین کرو گی وہ پہلی مرتبہ ہمارے گاؤں میں کیوں آئی تھی۔؟“ دو دو لکھی شدت سے سزا دینے لگے۔
دراصل ان کے گاؤں میں آگ لگنے والے اور لوگ تھے۔ اور انہوں نے سمجھ لیا یہ آگ مہلے لگائی ہے۔ ہمارے ہاں سب سے ہمارا وہ ہے جو سب سے بڑا انتقام لے سکتا ہے۔ سو وہ ہم سے انتقام لینے آئی تھی۔ ہماری روایت یہ بھی ہے کہ ہم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ اس کا خیال تھا کہ آگ لگا کر چپ چاپ چلی جائے گی اور کسی کو گمان بھی نہیں گزرے گا کہ ایک لڑکی ایسا دلیرانہ قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔
مجھے ان دنوں بھی راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ میں یہ مٹی جنگوں میں گم ہو رہا تھا۔ اپنے لیے کوئی لینڈ ایکسپلوسو کرنا۔ شاعری کرنا۔ اور ہانسی پٹایا کرنا تھا۔ اس دن میں نے دیکھا۔ ایک آوی کیل میں اپنا ہاتھ میں ایک گھسٹریکڑے پلا کر رہا ہے۔ اور اس نے مجھے دیکھ بھی لیا ہے۔ چاند پورا تھا۔ جنگل نور میں نمایا

ہوا تھا اور مجھے اس پر کوئی شبہ بھی نہیں تھا۔ وہ خڑا ہو ہی نہ سکا۔ اور میں نے اس کو دو چھلانگوں میں چالایا۔ میں جرات نہ کیا کہ وہ کوئی آدمی نہیں ایک معمولی سی لڑکی تھی۔

معمولی لڑکی تھا۔ لیکن بالکل غیر معمولی۔ اس نے مجھ سے کوئی بصوت نہیں بولا۔ اس نے مجھ سے سب کچھ کہہ سنا لی۔

اس نے آگ بھی نہیں لگائی۔ لیکن لگائی۔

میں نے بھی اس سے بدلہ لے لیا۔ اسے گرفتار کر لیا۔ عمر بھر کے لیے۔ وہ اس وقت وہاں سے چلی گئی لیکن پھر مرد و زرات کو ہم چاہتے تھے۔ بس اسی جگہ سے رہے۔

جی کہ طوفان آگیا۔ نیا مت برپا ہو گیا۔

پابست ظالم تھے۔ بلا حلالہ ہم ایک دوسرے سے ہمت یار کرتے تھے۔ یہی عزت کرتے تھے لیکن جانے کیوں پایا اور میرے بچ ایک دیوار آگئی۔ ان خیال تھا کہ میں دھوکا کھوں۔ دشمن کی لڑکی کو دھوکے سے لے آؤں۔ اور انتقام کی بجائے چڑھاؤں۔

اس کے علاوہ کے لوگ بھی میرے خون کے پیاسے تھے۔ لیکن ہم آخر ہاگ ہی گئے۔

یہ وہ کم ظالم تھے اور ہم بڑے۔ وہ بس آج تک جنگوں کو آگ لگاتے رہے۔ ہمارے محافظوں پر فائر کرتے رہے اور بس۔

پھر اس دن قیامت آگئی۔ اگر وانیال خان اور قیمت خان پھاڑیں کر رہے تھے میں حائل نہ ہو جاتے تو لوگ میری آنکھوں کے سامنے اس کی ٹکائی کر دیتے۔

انہوں نے ہم کو شادی کے بعد دیکھا۔ اور طوفان چلایا۔ دوسرے اپنے لوگ تھے اور ایک اس واقعہ سے پہلے مجھ سے ہمت محبت کرتے تھے۔ مجھے ان سے کوئی نفرت نہیں۔ وہ بھی ٹیک کتے تھے وہ ہمارے بدی انتہی دشمن کی بیٹی تھی۔ چاہتے تھے کہ میں بھی لگ گئی۔

وہ باتیں بھی تمہاری طرح کرتی تھی۔ بیلا بیلگوں جیسی ہر ایک سے لڑ پڑا ہوا کہ ہر ایک سے بھڑکانا۔ ایک دم خفا ہو جاتا۔ ایک دم سن جاتا۔

وہ چلی رہی تھی۔ اس کی اتنی عادتوں سے بھلا اتنی آگاہی اسے کس نے دی تھی۔ وہ تو اس کے سامنے نہ بھی لڑی تھی نہ مٹی۔

”اور خڑا تھا وہی یہ سمجھ لیتا کہ دنیا غلط ہے۔ اور میں اس کو بدل دوں گی۔ اور جیسے یہ چیکوں کا کام ہے۔ اور تم نے دیکھا تو نے اسے اس کو اس جنگ میں ہرا دیا۔ اس کا نشانہ ہی مٹا دیا۔ پھر اس رات باپا نے مجھے بیٹوں کے آگے ڈالنے کا حکم دیا۔ ان کے خیال میں میں نے دشمن کی بیٹی سے شادی کر کے ان کی ہدایات کا گنا گھونٹ دیا تھا۔ ان کے حکم کے مطابق وانیال مجھے لے کر چلا تو اس کا دل پھٹ گیا۔ بس وہ ہیں ساکت رہ گئی میرے دیکھتے دیکھتے ختم بھی ہو گئی۔ ٹھنڈی بھی بڑ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس پر مٹی ڈال دی۔ نہ ڈالتا تو شاید کسی اور پر بھروسہ نہ کرنا۔ اس کو وانیال نے اسی دشمن پر ڈال دیا۔ پھر مجھے ہار کر بی نہ گئے اور میں خاموشی سے اسی نشن پر آگیا جہاں وہ دفن تھی۔ اسی لیے میں وہ گھر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔“

وہ ساکت کی ساکت خاموش بیٹی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ زندگی کیسی عجیب کمانی ہے۔

”آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ بہت رات ہو گئی ہے۔“

انہوں نے تاجدار کی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور کتنی دیر نہ رکھیں۔ شاید وہ سو بھی گئے تھے۔ نرس رات کے اس پیر میں ان کو داہنے آئی لیکن ان کو سڑپ کر کے کے خیال سے پلٹ گئی۔ اس نے احتیاطاً گولی بٹاکے ہاتھ میں تھادی۔ ”جسب نہ باگ چائیں تو گولی کھادیتے گا جی۔“

جسبلی پر دھری ایک سفید رنگ کی عجمی اس کے داغ اور دل کی گہیر کے درمیان رکھی اس کو جذبات اور وقت کی نراکت کی کشش سے ڈرا رہی تھی۔

یہ وہ لوگ ہیں جو محبت میں کاروبار نہیں کرتے۔ جو زندگی میں کسی قسم کا بھی کوئی سودا کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ جو عشق اور محبت کے لیے جان سے گزر جاتے ہیں۔ ایک سی قید اور ایک لمبا دن باس گاٹ کر یہ شخص چند سال بعد پہلی مرتبہ گڑھی کے اس علاقے سے باہر نکلا تھا۔ اس نے وہ جرم کیا جو قہرات پاکستان میں کہیں دہری نہیں۔ جو شریعت کی کسی کتاب میں پریشانی نہیں۔ لیکن اس کی پاداش میں اس عمر گہری سزا کمانی ہے۔ اس کو اپنی زندگی کے برہانہ جانے کا کوئی بچہ تھا تو انہیں کوئی ملال بھی نہیں۔ چاہتے تھے اس نے عمر کا وہ ایک برس کتنا خوش رہا تھا کہ وہ عمر بھر تک ان دینے پر تیار تھا۔

اس وقت جب وانیال خان نے ان کو بے تحاشا باتیں کرنا سن کر کمرے کا دروازہ کھولا تھا تو ہڑے کل خانہ کمرہ رہے تھے۔ ”محبت میں عمر بسر کرنا معصیت ہے۔ بلا۔ اور میں جانتا ہوں وانیال خان کس عذاب سے گزر رہا ہے۔ لیکن اس میں راحت بھی ہے۔ اس نے سارے عذاب چکے لیے ہیں اور راحتیں ترک کر دی ہیں۔“

”کیا تیرے خنک ان سے اتنا عشق نہیں کرتی۔؟“ نظا ہر اس نے بڑی لا بولائی سے پوچھا تھا۔ لیکن انہوں نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

”کون تیرے خنک؟ میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔ اس نے تمہاری کتنی ہی باتیں مجھ سے کی ہیں۔ وہ سارا دن تمہارے قہقہے بیان کرتا ہے۔ لیکن وہ ڈرتا ہے۔ وہ تمہیں ہستی والوں کے سپرد نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کبھی نہیں سکے۔ وہ اپنی موت سے نہیں تمہاری موت سے ڈرتا ہے۔“

وہ ساکت کی ساکت اور خاموشی کی خاموشی رہ گئی۔ یہ انکشاف اس پر بہت بھاری تھا۔

”آپ کو اتنی باتیں نہیں کرنی چاہئیں لالا۔“ وانیال خان نے دروازہ کھول کر تنبیہ کی تھی۔

”کر نہ دو وانیال۔“ انہوں نے منت سے کہا تھا۔ ”کیا چاہتا میں کب چپ ہو جاؤں گا۔؟ وہ بہت دیر سے چپ پڑا تھا۔ اور وہاں کی سفید رنگ کی گولی اس کی تھیلی پر دھری تھی۔

پتا نہیں کیا وقت ہوا۔ اسے وہاں کا وقت گزرتا نہیں چاہیے۔

وہ بے نالی سے اٹھ کر بیٹھی۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا اور اسے اس طویل خاموشی سے خوف آ رہا تھا۔ جب تک بوتلا راہ وہ خوفزدہ رہی تھی۔ اب وہ چپ ہو گیا اور چپ ہو کر اسے اور ڈرا گیا تھا۔

اس نے آہستگی سے پیٹنگ پر جھک کر ان کو پکارا۔

”بندے آگ۔ بھائی۔ لالا۔“

سرگوشی نے خوف زدہ بلند آواز کی شکل اختیار کی۔ پھر اس نے گہرا کروغی آواز سے کہا۔ ”لالا“ رات کے اس پیر میں سب مارا۔ پتلا ایک خاموش سانس میں ڈوبا ہوا تھا۔ دل دھلا دینے والی ایک چیخ اس کے

حلق سے برآمد ہوئی۔
”ڈاکٹر خیال“

ہسپتال کا اسٹاف ’زمین‘ ڈاکٹر ز اور دانیال خان آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ اچانک ہی ایمرینس ہو گئی۔ انہوں نے آسپین کا مالک چڑھایا۔ ڈرپ دینے کی کوشش کی۔ رگیں کاٹیں۔ پھر انہوں نے مریض کے چہرے پر چارڈال دی۔
اب ان کے اور مریض کے درمیان کا رشتہ ختم ہو گیا۔
انہوں نے باری باری کمرہ چھوڑ دیا۔ ”واپس آئے۔ ڈرپ چیک کرنا“ مریض کا حال پوچھا جیسے انہوں نے آنکھیں مارتے پر رکھ لیں۔ اور قطعی غیر یقینی سے ان کے کمرے کے سامنے سے ٹک ٹک کرتے کسی اور کمرے میں گھس جاتے۔
اس نے ہمیشہ اس شخص کو بستر پر بستر کے آس پاس ہی دیکھا تھا لیکن اتنا خاموش ’انتہا سا کن۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں وحشت کی آتر رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے اعصاب ٹاکر ہو چکے ہیں۔ کتنی دفعہ اس کو لگا وہ چادر ہٹا کر دیکھے گی تو اس کے چہرے کے ساتھ اور کتنے چہرے ہوں گے۔ اس کی ماں کا چہرہ باب کا چہرہ۔

کتنی دفعہ اس کو لگا اس کی چادر کے نیچے اس کے سینے میں حرکت ہے۔
پھر نہیں سب لوگ کہاں چلے گئے تھے بس ایک گھوڑا اندر اور خاموشی۔ وہ کرسی پر ساکن بیٹھی بیٹھی بے آبی سے کمری ہو گئی۔ انہوں نے نہ صرف حرکت کی تھی بلکہ اس کو کار بھی تھا۔ لوگی۔
”وہ سانس لے رہے ہیں۔ وہ زندہ ہیں۔“ اس نے بلند آواز سے پکارا۔
کسی نے پیچھے اس کا کندھا تھپتھپایا۔
اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دانیال خان تھے۔ انہوں نے اس کا سر آہستگی سے اپنے کا لبر لٹکایا۔
وہ زار و قطار رونے لگی۔ ہسٹیک عورتوں کی طرح بلند سسکیوں کو ہونٹوں میں گھونٹ گھونٹ جیسے سارے جھٹکے ان کے سینے میں اتار رہی۔ وہ خاموشی سے اس کی کمر چھتکتے رہے۔ آہستہ آہستہ۔ حتیٰ کہ وہ پرسکون ہو گئی۔
تھک کر اور تڑھال ہو کر وہ جیسے کرسی پر گر گئی۔

دانیال خان برادری سے حالات کو سنبھالتے اور وقت کی نزاکت کو دیکھتے پھر رہے تھے۔
وہ ان کی قیمتی چیزوں کو سمیٹنے۔ ان کی نشانیوں کی حفاظت کرتے۔ دفعہ سرٹیفکیٹ کا حصول اور ایمرینس کی بازیابی۔
”حقیقت خان۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہاری کو گھر لے چلو۔“
سین مالک کو پھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ اس نے گستاخی سے نفرت کا اظہار کیا۔
”ہمیں دیر ہو جائے گی قیمت خان۔“ انہوں نے اسی محل سے کہا۔ ”مرجن ٹار ایمرینس ڈیپارٹمنٹ والوں کی طرف ہیں۔“
”میں ہرگز نہیں جوں گا۔“ قیمت خان جھنجھلا رہا تھا۔ اور اس نے اس طرح کی حکم عروسی بھی کبھی

246

نہیں کی تھی۔

”نمان جاؤ قیمت خان۔“ وہ دانیال خان کی آواز کے ٹھہراؤ اور چہرے کے ضبط پر حیرت زدہ رہی۔ وہ کہیں سے بھی غصوں اور گھبراہٹ کا شکار نہیں لگ رہے تھے۔
”ان کا ایمرینس میں جانا کسی صورت بھی ٹھیک نہیں۔“ پھر وہ اس کو پشتوں سمجھانے لگے۔ ”خالیا“
یہی کہ اس کو ایک لاش کے ساتھ سفر نہیں کرنا چاہیے۔ شاید وہ اس کو بنا بھر کے خلاف کمزور دل اور کچا جھنجھٹے لگے تھے کہ روٹی بسورٹی اور بین کرتی لاش کے ساتھ سفر کرے گی۔
اس کو برادری کے شخص بے دریغ لٹائے گئے اور ہمیشہ اس نے تمغوں کا بجا استعمال کیا تھا لیکن اس وقت اس کو ایک ناجائز برادری کے پہاڑ تلے دینے سے بچا لیا تھا۔
اب گفتگو دیا ر غیر کی بولی میں ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ قطعی ناواقف رہی کہ آخری فیصلہ کیا ہو یا۔
دانیال خان کا استحکام اور قیمت خان کی ہمت دھری اپنی اپنی جگہ قائم تھی۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھی سفید رنگت کی چادر میں سماکت لینے شخص کو سوہتی رہی۔ وہ کیا کیا نہیں بولا تھا۔ اور بولتے بولتے چپ ہو گیا تھا۔

”میں آخری وقت میں بولے مالک کو کیا نہیں جھوڑ سکتا۔“ وہ مرجن ٹار سے التجا کرنے لگا۔
”میں ساری زندگی ایک منہ کے لیے ان سے غافل نہیں ہوا۔“

پھر معاملہ ہتھوکی سپرداری میں چلا گیا۔
البتہ جب وہ کچن میں تھیں تو قیمت خان نے راکی کا اٹکا دروازہ اس کے لیے کھولا اور اس کے بیٹھ جانے کے بعد غائب ہو گیا۔

ایمرینس میں مرجن ٹار اور قیمت خان تھے۔
اور وہ بیارا اور میان شخص جس کی بدولت گویا میں اس کا ہر دن ایک نئے عزم اور حوصلے سے بسر ہوتا تھا۔ خاموشی اور سماکت ہسپتال کے اسٹیج پر لوگوں کے سہارے آتے۔ دارو پوائے اے اٹھائے ایمرینس کی طرف لا رہے تھے۔ اور اس کا سر آہستگی سے حرکت کر رہا تھا۔
”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔“

بلا کو لگا وہ مرکز بھی روایات کی نفی کر رہا ہے۔ وہ فرسودہ خیال لوگوں کے شکنجے میں آنے سے قطعی انکار کرتی ہے اور بلا کو بھی یہی آخری درس دے کر جانا چاہتا ہے۔
اور اس کا سر تیزی سے لیے چلے جانے کی وجہ سے ابھی تک لرز رہا تھا۔ خاموشی اور مرجن۔ سیدھے ہاتھ پاؤں۔ جو کبھی راہ عمل سے ہٹے۔ ہینکے اس کے ہنسنے پانچے آنکھوں کے سیاہ گولے ہماری بوجھل بچوں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ اس نے ان کو آخری حوالے میں بے رنگ بے جان پڑے دیکھا تھا۔
ایمرینس کے پیچھے چلنے ان کی راکی۔ رواں کی کے آخری محول میں دانیال خان اس کی برادری والی سیٹ پر آہستہ سے سرک دی ہی تھی جیسی آہستہ وقت اس نے دیکھی تھی۔ اس وقت اس کے دل میں کچھ اور عزائم تھے۔ لیکن اب زندگی میں حرکت ختم ہو گئی تھی اور اسی ساکن ہو جانے کو موت کہتے ہیں۔
کتنی مرتبہ آسو بہ کر اس کے گاہوں تک آئے کتنی مرتبہ اس نے بونہی بنے دیئے اور کتنی دفعہ اس نے بغیر حرکت کیے اندر سے کی سمیٹا ہی جنبش سے گاہوں سے ٹھک کر لیے۔

247

”رواں“ انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
 ہاں، یہ شخص جو اس کے برابر بیٹھا اپنے اعصاب اور بہادری کے سارے اعزازات سمیت اس کے
 اندر کہیں گڑھ تھا۔
 ”روئے میں کوئی حرج نہیں۔ خوش قسمت ہیں جو دوست ہیں۔“ وہ ہونٹ جھپٹے بڑی سنجیدگی سے
 ایمر لینس کے تقاب میں بھاگ رہے تھے۔
 ”کیا اب ان کو راتوں رات...“ وہ چپکے کر چپ ہوئی۔ ”راتوں رات دفن کر دیا جائے گا۔“
 ”ہوں۔“ انہوں نے ایک طویل خاموشی کے بعد سوالیہ انداز میں پوچھا۔ شاید ابھی تک انہوں نے
 خود بھی طے نہیں کیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ اسی طرح سوالیہ انداز میں سمجھیں اپنا کچھ فیصلہ یہ سوال
 کی اور سے بھی کرنا چاہتے تھے۔
 ”جنگ تک لوگوں کو یہ علم ہی نہ ہو سکے گا۔ اس جیتے کے مکان میں ایک اور خاموش بھوت مٹی کے پچے
 دبا دیا گیا۔ وہ بستی مسکرائی روز کی طرح بے گناہ کے پاس چائے کی ان کی خیریت دریافت کرے گی۔
 جیسے اس سے پہلے کے سچین حالات میں اس کو رازداروں کا بھرم رہتا رہا ہے۔
 بے سب کے سامنے ہنسے گی، مسکرائے گی، روزمرہ کی پچھلی پھولی باتوں پر بے لگے سوال۔
 لیکن شاید اب یہ ہونہ سکے۔
 کہ۔ ہر روز ناہنجی کی ایکسٹریکٹ کی طرح ایک ہی بھرا سین دہراتے دہراتے اس کا دل اکتا گیا تھا۔ ہر
 روز وہ سینے پر جھجھکا کر اس پر گر جائے پڑا تھا۔ پھر مرے۔
 کیا اس روز روز کی موت سے بندے اگل خان کی ایک دن کی موت اچھی نہیں تھی۔
 بعض باتیں سوچنے میں اتنی مشکل نہیں ہوتیں لیکن ان کو اب کرنا کتنا دشوار ہو جاتا ہے۔ سن کے وہ
 جاتی تھی وانیال خان کا غم کتنا ہے۔ اور اس کے اپنے غم کی شدت کیا ہے۔ کیا کانا کدہ وہ ایک سو سے
 فضول الفاظ استعمال کریں۔ اپنا وقت ضائع کریں اور کہیں کدہ شخص جواب ہمارے درمیان میں نہیں رہا
 ہمیں یکساں عزت تھا۔ اور یہ کہ اس قدر عزیز کہ شاید پانے کی اور ترافڈیں تو لے نہ سکیں۔
 بہت جرمہ پہلے ہی اس گڑھی میں اسی طرح خاموش اور افسردہ داخل ہوئی تھی۔ لیکن تب زندگی میں
 ایک منزل تھی۔ کچھ کرگزرنے کی تمنا تھی۔ کچھ ارادے تھے۔ اب سب کچھ خاک ہو چکا تھا۔ نہ کوئی منزل
 نہ راستہ نہ نشان۔ اب اس نے پھر ایک عزت گواہ کیا تھا۔ اب پھر ایک پیارے کا نقصان ہوا تھا۔
 وہ کسی سے کیا کہتی۔ وانیال خان سے بھی کیا کہ۔
 کہ ان سب چاہئے والوں کو اس پر رونے کا حق ہے۔ کوئی اس کا باپ ہے، بھائی ہے، دوست۔ خادم
 ہے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں۔
 نہ کوئی خون رشتہ ہے نہ جذباتی سہاں ایک روح کا دوسری روح سے ایک۔ خوشگوار سا تعلق تھا۔
 وانیال خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پر بالوں کو چھتا ہوا تھا۔ یاد دہندہ
 شیط کے شاید اس کے طلق سے پھر کوئی سسکی پھسکی تھی۔
 انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن ہاں مرنے والے پر اس کا کوئی حق تھا۔ کم از کم انہوں نے یہ
 تسلیم تو کر لیا تھا۔

جس وقت ان کی گاڑی گڑھی کے اس کیٹ سے اندر داخل ہوئی جہاں مسلح گارڈز کس کڑی تھی۔ تو
 اس کو نامعلوم ہی ایسی آگئی۔ بعض اوقات ہمارا اسلحہ ہماری طاقت ہماری زبان ہماری روایات۔ سب
 مل کر ہمارا جانی ہیں اور سزا یافتہ مجرم جیسے سے کھٹک بھی لیتا ہے۔ اب کون سی بدوق اس کا نقصان کر سکتی
 تھی اب کون سا چٹا اس کو پھانسا کھانے کے شوق میں چٹا ہو گا کہ قدرت خالص کے ساتھ بڑا سچین
 مذاق کر لے گا۔
 مسجد کا موزن جی ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس اعلان کے ساتھ کہ خدا عظیم ہے۔
 واقعی وہی سب سے بلند تر اور تر ہے۔
 لیکن گاڑی ایمر لینس سے آگے نکل گرنے لپے گھر کی طرف گئی۔ بندہ اگل خان کے خاموش چوٹے
 کے گھر کی طرف سے گاڑی دوڑاتے نقب میں اترے اور کبھی کی طرف ہلنے والے کے راستے پر بے
 تماشاً دوڑنے لگے۔ ایمر لینس سے مسلسل باہر بچلا جا رہا تھا۔ غالباً انہوں سے اگلی گاڑی کی سمت معلوم
 کی جانے کی خواہش تھی۔
 یا وانیال خان کے ممکنہ ارادوں سے آگاہی کے بعد قیامت خان اور سرجن ٹارا نہیں چو کنا کرنا چاہتے
 تھے انہوں نے کسی کی بھی نہیں سنی۔
 وہ اپنی گاڑی سے اترے۔ ایمر لینس کھولی۔ انہوں نے صبح صبح مسجد کے دروازے پر ان کی لاش ڈاکر
 رکھ دی۔ مسجد نمازی آہستہ آہستہ آتی رہے تھے۔
 ”انہوں نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔
 ”گڑھی والو یہ بے وقوف ہیں۔ جس کو تم نے مرے ہوئے چوٹے کی طرح دھتکار کر پھینک دیا تھا۔
 جس کے ناپاک پلچھ قدموں کو تم نے اپنی پاک بستی سے دور کر دیا تھا۔
 یہ آج پھر تمہارے درمیان آ گیا ہے۔ آج اس کی سزا ختم ہو گئی ہے۔
 لو اب اپنی روایتوں سے بغاوت کا انتقام۔ لو اب اس کی لاش کے ٹکڑے ازاو۔ اس کو پھیل کھول کے
 حوالے کر دو۔ آؤ باری باری میرے سامنے آؤ۔“
 وانیال خان کے جھمٹانے چمے اور بلے آواز سن کر لوگ گروں سے نکل کر باہر آنے لگے۔ وہ سراسر
 تھک وانیال خان کے کے ہوئے لفظوں کے مضبوطی کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔
 قیمت خان نے پستول کی تختی اپنے ہاتھ پر محسوس کی۔ جہاں اس کے برابر کھڑی تھی۔ اس نے دیکھا وہ
 جہاں سے لرز رہا تھا۔ اگر وانیال خان کی دعوت کے باوجود کوئی شخص اس لاش کی طرف ہاتھ بھی اٹھاتا تو
 قیمت خان اسے بھون کر رکھ دیتا۔ ذرا ہی دیر میں بندے اگل کی نشن پر بھی لاش کے ستر پچ کے گرو بستی
 اٹھتی ہوئی تھی۔
 اس نے کدھی میں کبھی اتنے لوگ اسٹے نہیں دیکھے تھے۔
 جانے سوا وانیال کس کا جنازہ اٹھا لیا ہے۔
 وہ اتنے غم میں کیوں ہے۔
 اور یہ کیا دل بول رہا ہے۔
 جڑے کے کسی بزرگ رکن نے ہرہہ کر چاؤر کا کونا سر کیا۔

”ہوٹ مالک“ مورچہ رگرگراوا۔
 لمحہ بھر میں پستوں میں بیٹھ کر یہ خبر میں ہفتی کی طرح گردش کر گئی کہ اس چادر کے نیچے کون ہے۔
 آوازوں کے شور میں لوگ قیمت خان کو جھوڑے تھے وہ احتجاج کر رہے تھے کہ بڑے مالک کو اب
 تک کس پردے میں رکھا گیا۔
 وہ اس کے نام لیا تھے۔ فداوار تھے اس پر اپنی جان بھگور کرنے پر آمادہ تھے۔
 بندے اس نے ہسپتال میں بڑا کراچ بٹایا تھا۔ مجمع کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن اب بہت دیر
 ہو گئی تھی۔ مجبوروں کے اظہار میں ہمیشہ کام چوری اور سستی کرتے آئے ہیں۔
 اور اسی غفلت کے نتیجے میں وہ شخص ہمیشہ کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔ آپ کا پارا اس کے لیے موت
 کے بعد دوا ہے۔
 وہ دوا ٹیس مار مار کر رو رہے تھے۔ آوازوں سے چلا رہے تھے۔ انہوں نے جنازہ کندھوں پر اٹھایا اور
 بستی کی طرف چلے۔ انہوں نے سرائوں کے شایان شان میت کو غسل دینا اور کھانا تھا اور جنازہ و حوم
 سے اٹھنا تھا۔ وہ جنازے کو لے کر روٹے جارہے تھے کہ قیمت خان بے تابی سے ان کے پیچھے دوڑا۔
 لوگوں کی تیزی میں دانیل خان سرجن بیمار اور پیلا پیچھے رہ گئے تھے۔
 اسے لگا دوڑ جاتے جنازے میں بندے اسے کھان اٹھ کر پیچھے گئے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ ”دیکھا لڑکی۔
 اس بستی میں یوں چاہا جاتا ہے۔“
 جیسے انہوں نے اپنا استقبال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور تسلی کر لی ہے۔ اگر بستی والے غلطی
 کرتے ہیں تو غلطیوں پر نشان بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا مطلب انسان ہیں۔ ان کے اندر کی انسانیت ابھی
 ختم نہیں ہوئی۔ یہ اچھا انسان ان کے اندر بالکل ہی مر نہیں گیا۔
 سرجن فداوار نے دانیل خان کی کمر کے گرد بانڈو رکھا اور ان کو آہستہ سے لیے لیے بستی والوں کے پیچھے
 جانے لگا۔
 وہ ایک لمبے پوڑے میدان بن تھا رہ گئی۔
 وہ مانتے در سر تھا۔ لاٹری طرف اسکول۔ اور بستی کی ان عورتوں کے گھر جہاں کے بچے چپے سے وہ
 آگاہ تھے۔ جہاں قدم قدم پر چھوڑا تھا۔
 چائیں کتنے عرصے سے اس دیوانے میں بالکل اکیلی تھی وہاں اور خاموش کھڑی تھی۔
 یا شاید کھول میں یہاں طوفان اٹھا اور چلا بھی گیا۔ بریادی اور جہاں کے نشانات پھیلا کر وہ چپ چاپ
 ساکن کھڑی رہی۔ بغیر جنبش کے۔ لیٹر ایک نقطہ منہ سے ادا کیے۔
 ”ہیلا۔“ اسے کسی نے پکارا تھا۔
 اس نے گھوم کر دیکھا۔ چپ ہی رہی۔ وہ خان گل تھا۔
 چائیں وہ بھی اس تماشے میں شامل تھا اب بعد میں کہیں سے نمودار ہو گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے
 متقابل سمت دیر کے لیے خاموش کھڑے رہ گئے۔
 ”ہلو ہیلا۔“ اس نے دیکھے سے کہا۔ ”میں تمہیں گھر چھوڑوں۔“
 ”ہاں خان گل۔“ اس نے غویل اور کمر اسٹس لیا۔

گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ تیز روشنیوں اور پیڑ میکس کے چیمکیوں والی برقی
 گاڑیاں ٹرین کے ساتھ ساتھ جانے لگیں۔ لاہور کے پلیٹ فارم کا مخصوص طوفان اور غلغلہ کھڑکیوں کے
 راستے در آیا۔ آگے جانے والے کھڑکی دروازوں سے اپنا سامان اندر پیچھنک رہے تھے اور اترنے والے
 تیزی میں چھٹا تھکس مار رہے تھے۔
 اسے اترنے کی جلدی تھی نہ چڑھنے کی۔ سارے راستے ساری منٹوں میں بے نشان رہ گئی تھیں۔
 یہ وہی جگہ تھی یہاں سے سال بھر پہلے وہ نے اراہوں سے والوں سے نقلی تھی۔ کچھ کرگڑنے کی
 خواہش کچھ بین جانے کی حسرت۔ گاڑی آہستہ آہستہ سے آواز پیدا کر کے رک گئی۔ اس نے اپنا کلوٹا سوت
 کیس اٹھایا اور خاموشی سے افرا تفری چائے والوں کا تماشا دیکھنے لگی۔ لینے والوں اور رخصت کرنے
 والوں کی رفتار مسافروں سے گئی تھی۔ اور وہ مسافروں سے زیادہ مشتاق اور مسافروں سے زیادہ بد حال
 تھے۔
 گاڑی کاؤبہ اور پلیٹ فارم ہمواری سے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ اس نے سکون سے قدم رکھا۔ یہ
 لاہور کا پلیٹ فارم اسٹیشن تھا۔ اسٹیشن کا سب سے زندہ اور بھرپور اسٹیشن۔ یہاں لوگ تھے اور اپنے ہونے
 کا ثبوت دیتے تھے۔ لوگ لوگوں سے مل رہے تھے چھوڑے گئے والوں کا حال در وقت کر رہے تھے۔
 آگے جانے والوں کو بے تابی سے دیکھتے تھے۔
 اسے نہ کوئی لینے آیا تھا نہ رخصت کر لے۔ اس کا کوئی سہماں نہیں تھا۔ یہاں سے جانے وقت رحیم
 چاچا اور ان کی پوتلیاں تو تھیں۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ اس نے ایک مدت بعد اناٹا شور مٹا تھا اور اس کے
 کان اس شور کے مادی نہیں ہو پارہے تھے۔ محض ایک سال۔ اور ایک سال نے اس کو سناٹوں کا اس قدر
 عادی کر دیا تھا کہ یہ زندہ جاوید جیتا جاتا ہنگامہ اس کے اعصاب کو توڑ چھوڑ رہا تھا۔
 اس نے اپنے سوٹ کیس کا تسمہ پکڑا اور بالٹو کی طرح کھینچ نکلی چلی گئی۔ قلوں نے ”ٹیلی
 سواری“ کو تماشا دیکھا۔ جیسے وہ اپنے گھر کے سامنے بے لٹ پاتھر پر شام کی تقریر کے لیے نقلی
 ہو۔ قلمی قرار سے اس کی طرف لیکر ایسی مجبور ساریاں پیسے زیادہ دے بھی جاتی ہیں۔
 لیکن وہ محض سامنے دیکھتے ہی تے قدموں سے پلیٹ فارم کی میڑھیاں عبور کرتی رہی۔ جیسے اس کے
 ہاتھ میں وزن نہیں۔ اس کا نامہ اعمال تھا۔ اس کا سارا کپا چٹا تھا۔ اس کا سارا ہاشی اس کے سامنے تھا۔
 اور آگے کچھ بھی نہیں۔ اس نے پلیٹ فارم نمبر پانچ اور چار باتر تیب عبور کر کے ایک مدت بعد میدانوں
 کی نین پر قدم رکھا۔ اب وہ پانچوں پر سے اتر آئی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔
 زندگی میں ہو کچھ ہوتا ہے جس طرح ہوتا ہے اب اس کی ملا سے۔
 گول دائرے والے چوک کے گرد بے تماشا بجا گناہ رنگ گاڑیوں کے بارن۔ اوپر اچھے قد اور قسمی

اشہد اراستائش کے آس پاس اونچے اونچے ہوٹلوں کی تعمیر۔ جیسے ایک سال پہلے وہ جو کچھ چھوڑ کر گئی تھی۔ سب میں اسی جگہ کھڑا اس کا منظر تھا۔ صرف اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا تھا۔
ملکسی والوں کے اٹنے کے پاس رک کر اس نے رکشا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ وہاں بھاگتی رہاں وہاں ٹریفک کے درمیان گھری جیسے اجنبی شہر کے اجنبی حصے میں کھڑی تھی۔ اس نے رکشا ملکسی روکنے کی کوشش کی لیکن اس کو بہت عجیب سا لگتا تھا۔ وہ سب اس سے اجنبی تھے اور کسی اجنبی زبان میں اس سے بات نہ کیا کیا کہہ رہے تھے۔ پتا نہیں۔ وہ الفاظ ہی نا آشنا تھا۔ یا اس کے سننے والے کان شناس نہیں رہے۔

وہ ہیک ٹھیکتی بے حاشا ہارن وئی ٹریفک کے درمیان سے نکلتی۔ آگے چلی آئی۔ راستہ طویل تھا۔ اور وہ اسٹیشن سے کچھ آگے نکل آئی تھی کہ کسی رکشا والے نے رکشا روک کر اس کا سامان سیٹ پر رکھا۔ اس کو بیٹھنے کا راستہ دیا۔

”کہاں جانا ہے بی بی۔“
”کہاں“ وہ سوچ میں گرفتار ہو گئی۔ رکشا کی مسلسل گھڑ گھڑاٹ اس کے اعصاب ناکارہ بنا کر اس کو چڑھا کر رہی تھی۔ اور وہ یہ فیصلہ کرنے سے بالکل عاجز تھی کہ سینکڑوں میل دور سے بھاگتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔ اور یہاں سے اسے کہاں جانا ہے۔ یہ اس کے علم میں نہیں تھا۔ رکشے والے نے رکشا اسٹارٹ کر دیا۔ بلکہ رکشہ تھوڑا بھجھکی سوار کی کے جواب کا منظر تھا۔

پہلی مرتبہ اس کو پتا چلا کہ اتنی مختصر سی دنیا کتنی وسیع و عریض ہے۔ اور کتنی عجیب۔ جہاں اس کا وجود بے نام و نشان تھا۔ اسے کس کے گھر جا کر دستک دینی ہے۔ کون اس کا منظر ہے۔ اس نے رکشے والے کو کس کے گھر کا پتہ دیا۔ کون سے موٹر وائی ٹیوں سے راستوں پر گھمائی وہ رکشے والے کی رہبری میں جس منزل پر اتاری تو وہ دستک ہی رہ گئی۔

وہ اپنے گھر پہنچی تھی۔
گھر۔۔۔ کہ جب بھی قدم ان راستوں پر اٹھتے اور ٹپکتے ہیں ٹپک لے آتے تھے۔ یہ وہ گھر تھا جسے وہ ایک سال تک مسلسل اپنے خوابوں میں دیکھتی رہی۔ خواہش کا کوئی حصہ ”آرزو کا کوئی گوشہ“ اس گھر کے کسی کونے سے خالی نہیں تھا۔

گھر؟
جس پر اب اس کا حق تھا۔ فرض نہ تھی کہ کالے سیاہ گھٹ پر جھولتا سرخ لاکھ میں لپٹا لالہ بھی ہر اہل حالہ کا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اس عمارت کی طرف دیکھا۔ جہاں سے وہ بھاگی تھی لیکن شاید اسی طرف بھاگی تھی۔ یا پھر شاید اتنی گول تھی کہ وہ پھر بھاگ بھاگ کر ایک دن اسی پتھر اور سیمنٹ کے بے جان تودوں کے سامنے کھڑی تھی۔

اسے جوش لگا تھا وہ جب بھی گھر جائے گی۔ گھر اسے دیکھ کر بے تاب ہو جائے گا۔ جیسے اس کے محلے میں بائیس ال کر پھوٹ پھوٹ کر روئے گا۔ جیسے اس کے پلے جانے کے گلے اس کے چھوڑ کر بھاگ جانے کے گلوے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

لیکن وہ اسی طرح کھڑا تھا۔ بے پان۔ بے بات کسی کے آنے جانے اور چلے جانے میں کوئی دلچسپی

نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی اپنی بلند ہمت گھر کی طرف دیکھتی رہتی۔
جیسے ہم کسی بہت اونچے کو بہت دور سے دیکھتے ہیں۔

”بیلا۔“ اسے جیسے کسی نے یقین کرنے اور نہ کرنے کے انداز میں پکارا تھا۔ وہ اس وقت یہاں کے موڑ میں بھی نہیں تھی لیکن اس ایک عدا نے اس کا سارا ظلم توڑ دیا۔ رکشے کا انجیل اسی طرح شور مچا رہا تھا۔

”وہ رک سی گئی۔“
”ریاض بھائی۔“ میکان کی ایک لہر اس کے چہرے پر چڑھی اور اتر گئی۔
”کب آئیں تم۔ اس طرح کیوں کھڑی ہو۔ اندر کیوں نہیں آتیں۔“
”اندر۔“

وہ جی سی ہو گئی۔ وہ تو یہ جاننے سے بھی قاصر تھی کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچی تھی۔ پتا نہیں۔ وہ کہاں سے نکلی تھی اور کہاں چل پڑی۔ اس جگہ تک آنے کا پتا ہر اس کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس شر میں اس کے قدم انہی گلیوں انہی سڑکوں کے عادی سے تھے۔ ریاض نے اس کو اس طرح کم صدمہ کھلا اور خاموشی سے اس کی ٹیکہ رکشے سے ٹھیک لیا۔

”اور کوئی چیز تو نہیں ہے؟“ اس نے بیلا سے پوچھا۔ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔
”نہل دے دیا۔“ اب گئے وہ رکشے والے سے مخاطب تھا۔

اس نے خاموشی سی پتلون کی حجب میں ہاتھ ڈال کر اپنا ہاتھ کھینچا۔
”ہم چلاؤ اندر۔“ اس نے خاموش کھڑے اسے ٹوکا۔ لیکن جب وہ ادا ہو کر کے پلٹا تو وہ اسی طرح چپ چاپ کھڑی زمین دیکھ رہی تھی۔ پہلے اس نے اپنا سر قدرے بلند کر رکھا تھا۔ اب زمین کی طرف نیہو ڈالے جیسے کسی سوچ میں گم تھی۔ ریاض کو اس کی یہ حرکات کچھ عجیب سی لگیں۔ لیکن وہ اس سے بہت مدت بعد مل رہا تھا۔ اور اس مدت میں جو انقلابات آئے تھے وہ ان سب کو بھی سن بیٹھا تھا۔ وہ اب اس کو کیا کہتا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا جیسا کہ کیا ضرور اس کے باپ کے غم کا رونا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

”آپ کب آئے ریاض بھائی؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔
”کریں گے کریں گے فرمت سے بات چیت۔ مجھے تو ابھی تمہارے کان کھینچنے ہیں اچھی طرح۔ پر یا تو میں ہی تھا۔ مجھے ہی تم نے بے خبر رکھا۔ دلا لفظ لکھ کر ہی ڈال دیتیں۔“
”سو ریاض بھائی۔“

”بڑے بڑے رسمی فقرے کچھ آئے ہو اور ایسے بول رہی ہو جیسے صبح بھئی تھیں۔ شام کو آگئی ہو۔“
”آپ بھی تو ایک درت سے غائب تھے۔“

”ہاں۔ لیکن اب تو نہیں تھا۔ جہاں تھا تمہارے علم میں تھا۔“
پھر وہ چپ ہو گیا۔ بعض اوقات بڑی بڑی باتوں کو دور کر کے لے لے کر دل بہت بھونکا کر پڑا ہے۔

تقریباً کے دور میں بولوں کے عوض اسے اور کتنی باتوں کو اس کرنی ہوگی۔ وہ بچے سا بن گیا تھا۔ لیکن اس نے اپنے بڑے بزرگوں والے سر وپ کو پچھرتے اپنے اوپر مان لیا۔
”وہ طعنائیں سب کو کتنا حیران کرنا ہوں۔“

اس نے اس کا سوٹ کیس فرش پر چھوڑا۔ اور زور سے دس دس دی۔

”ہاں۔ گوشتی۔ مٹھی جیسے وہ کچھ کھلونا تھی اور ذرا سی غفلت اس کو زیرہ ریزہ کر دے گی۔“

اس نے بیلا کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس تو کر لیا تھا لیکن وجہ سمجھنے سے قاصر ہی رہی۔ اس نے ابھی تک اپنے حالات نہیں بتائے تھے۔ وہاں کے بارے میں زبان نہیں کھولی تھی۔ اور شاید زبان کھول کر پھنسا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے گرد آلود چوہا و پال آئینے میں دیکھے اور غسل خانے میں گھس گئی۔ اس نے گوشتی کا توقع سے بھی نہیں ڈانڈا وقت غسل خانے میں بسر کیا۔ البتہ نواہو کر جب وہ باہر نکلی تو اتنی وحشت ریشاش نہیں تو تھوڑی سی ناہودم ضرور ہو گئی تھی۔ چھوٹی بیلا کی پررنگی چائے کے سامنے اس کی عزیز دوست اسی طرح اس سے خوف زدہ اس کی شہرہ نشینی تھی۔

”اور گوشتی۔ زندگی کیسی گزری؟“ گوشتی کو لگا کہ اس کا ہال اسی پر ڈال کر بیٹھ رہی ہے۔

”اب تمہیں کیا جواب دوں۔ کہ میری بی بی اس کی دور رس حال میں دیکھے یا دور سے کہوں۔ اس۔“

بیلا خاموش رہ گئی۔ چائے کے گھونٹ گھونٹ بھرے بھرے بھی اسے شہرہ رسا وہ اب بھی اس سے شکوہ کرے گی۔

کدو اسے ملے بغیر اچھے چائے بغیر کیوں پہلی گئی۔

لیکن بیلا کے سارے خدشے بے بنیاد رہے اور کسی نے بھی اس سے کوئی آواز نکل میں ڈال دینے والا سوال نہیں کیا۔ رات تک وہ اس کو گھیرے میں لیے سیاست سے نشہ نشن تک ہر موضوع پر بات کرتے رہے۔ اس کی خاطر و ارات اس کی دلچسپی۔ جسے کوئی پرہیز نہیں کرتا۔ انسانوں کی بہت سی باتیں آجائے۔ وہ اس قابل تو نہیں تھی۔ اس نے شہرہ نشینی سے سوچا۔ لیکن بارہا ہمیں سست سے عذراؤں سے بھلا انا ہے کھانے کی میز پر۔ یہاں تک بھری ہوئی تھی اور وہ اس ڈانٹے کو ترس بھی گئی تھی۔ یاد آؤں اور مچوں والا یہ کھانا جس میں ہلدی کی رنگت بھی شامل تھی۔ بلا سے کوئی اس کا منہ مٹانے کیلئے اس آٹو کو تھپتھپ سے بڑی قوت تو کوئی اور نہیں اتاری۔ اس نے نواہے ڈبو ڈبو کر مٹا کر نہیں کیا کیا کھایا اور کتنا۔

ریاض بھائی اس کا ذرا اتنا بنائے غسل کو ہلکا بھلکا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

لیکن رات کی خاموشی میں اسے لگا کہ وہ سو نہیں سکے گی۔ کتنی دور وہ ساکت بیٹی فینڈ سے لڑنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹی گوشتی جیسے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی۔ اسی لیے اس نے کڑوٹ لینے کا ارادہ بالکل ترک کر کے نگاہ پست پر مبادی۔

کتنی دیر اس نے چست پر آنکھیں گاڑے گاڑے سوئے کی کوشش کی کہ اس وقت گزری میں کیا ہو رہا ہوگا۔ کس نے اس کی کمی محسوس بھی کی ہوگی۔ شاید نہ بھی کی ہو۔

کہ وہ اپنے غم میں بھرے ادھ مومے ہو گئے ہوں گے۔

اور خان گل نے شاید ان لوگوں تک اطلاع پہنچا دی ہو۔ لیکن اس وقت اس کو بار کرنے کی فرصت بھلا کس کے پاس ہوگی۔ ہاں البتہ جب کچھ دن بعد ایک دن سبے بے ایک دم سوچیں گی بیلا کہاں سے بیلا نظر نہیں آ رہی۔ تب خان گل انہیں بتائے گا۔ اور شاید وہ خود اس میں سوچے گا کہ اس نے کیا غلطی کی۔

کتنا درست فیصلہ کیا شاید۔

لیکن اس کی ایک معمولی ضد سے وہ بندے آل کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا ہوگا۔

اور سرجن ثار۔ دو تھو تھوے سے ایک اچھٹی نظر اس پر ڈالتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ بھی دانیال

”گوشتی۔ دیکھو میں کسے کان پکڑ کر لایا ہوں۔“

وہ اس ساہو بی پرسکون ٹیکری میں کھڑی بے چین ہو رہی تھی۔ بھائی کی آواز کی شدت کے ساتھ گوشتی کی وحش سے چھلانگ کی آواز آئی۔ گوشتی نے پچھتاہٹیں پھوڑا۔ پانچ نہیں اس وقت وہ کہاں چڑھ کر گیا کر رہی تھی۔ مٹی شاید نزدیک تھیں۔ وہ کھلے دروازے سے چاہے سے سامنے آئیں۔

”ارے ہاں۔“ ان کے منہ سے نکلی ہمہ می آوازوں نے گوشتی کے خیم تیز کر دیے۔

جیسے ہاہوں طرف افراغری کا دور دورہ چ گیا۔ مٹی اسے گلے لگائے ایک دوا تر سے رو رہی تھیں۔ لوگ گھروں سے نکل نکل کر جمع ہونے لگے۔ چاروں طرف ایک بھیڑی چ گئی۔ سب لوگ منہ اٹھائے اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے صبر کر رہے ہوں۔ ہر شخص اپنی بولی بول رہا تھا۔ کیا سے لے کر مہترانی تک۔ وہ بتا نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے۔ لیکن ہر کیف اس سے کوئی خاص تھا۔ وہ اس کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ کتنی دیر سے ان کے درمیان چپ چاپ بیٹھے پتھری مورٹی کی طرح ساکت بغیر ہلکیں بھٹکانے کھڑی رہی تھی۔ پھر اس کو اچانک اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔ جو کچھ اس پر گزری تھی وہ اس کی ذات کا ایک حصہ تھا اور دنیا والوں کی شرکت اس میں مناسب بھی نہیں۔ اس کو اپنی تقدیر کے ساتھ کیے سارے ستم خود سنے ہوں گے۔ لوگوں کو ہم رازہ کر مظلومیت کا ڈھونگ۔ چائے سے کیا حاصل۔ اس نے اپنا پرس گرا دیا۔ اور باری باری لوگوں سے گلے لینے لگی۔

گوشتی وہ ڈیوڑھی اتلی تھی۔ اسے گمان ساہو کہ آئے والا بیلا کے سوا کون ہو سکتا ہے۔

لیکن اسے کانوں پر نہیں تھا۔ آنکھوں پر۔

حالانکہ اس نے ریاض بھائی کی آواز بھی سن لی۔ اور اس نے اس کو کھڑے بھی دیکھ لیا تھا۔

لیکن ہر چیز جیسے پیشین سے دور ہو چکی تھی۔

لیکن یہ تو بیلا ہی تھی۔

بالکل وہی بیلا۔ لیکن خاموشی کم کم سال بھر کی طویل مسافت نے اس کو تھکا ڈالا تھا۔ یا جیسے اس کی یادداشت۔ بیشہ بیشہ کے لیے کھو گئی تھی۔ وہ انجان نظموں سے ایک ایک کو دیکھتی۔ زبان اور دل سے ادا ہونے والے ہزاروں سوالوں کی پلٹا میں کھڑی جیسے کسی کا بھی جواب نہیں دے رہی تھی۔ جواب نہ سننے کے باوجود لوگوں کے سوال ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ پھر وہ طویل گمراہی سے لے کر مسکرا دی۔

اور خوشی خوشی ہنسنے مسکراتے فقرے لانا لگی۔

ہاں۔ یہ وہی بیلا تھی۔

اگر اسے خوب قابو پایا دے۔ اگر اس نے اپنے آپ سے اختیار نہیں کھو یا تو یہ وہی بیلا ہے۔

اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے آکر مسکرا دیں۔

”یہ مٹھو دیکھنے کے لیے میری آنکھیں بے چین تھیں۔“ ریاض بھائی نے شرارت سے کہا۔

گوشتی ان آنکھیں چٹک چٹک تھیں۔ مٹی نے خاموشی سے اپنے آنسو رگڑا لے اور انکل جیشہ دیواری سے بار بار اس کے نزدیک سے گزرتے رہے۔ آیا اہل بین ہیں بھئی نہیں۔ آج انہیں بہت اہتمام کرنا تھا۔

”کچھ خیال کرو گوشتی۔“ مٹی کی آواز میں لرزش ابھی تک باقی تھی۔

”بیلا کہہ کرے میں لے چلا۔ اس کو آرام کرنے دو۔“

خان کے ساتھ بہت آگے نکل گئے تھے۔ وہ شاید کڑھی سے فوراً واپس چلے بھی گئے ہوں۔
اور دانیال خان کیا ان کے پاس اتنی مہلت ہوگی۔ کیا اس وقت ان کو اس کی ضرورت ہوگی۔ کتنی مرتبہ
انہوں نے اسے کمرے کے وقت میں پکارا تھا۔ اب اگر وہ پکاریں بھی تو شاید ان کی آواز میں شک نہ پہنچ سکے۔
بیلا بیلا۔

اسپتے خان کے بالکل قریب جیسے درویش ڈوب کر کسی نے اسے آواز دی تھی۔ یہ ممداتی واضح اور اتنی
بے چین کروینے والی تھی کہ وہ بے تابی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس وقت کس کو اس کی ضرورت ہے؟

کون اس کو بولے تالی سے آواز دے رہا ہے؟

”نہیں نہیں آری۔“ گوشت کی ٹھکر بھری نرم آواز نے جیسے رات کی سیاہی کو لگا سا دھندلا کر دیا۔

”نہیں۔ تمہارے بستر آجائوں؟“ گوشت کی لگا جیسے اس کا جواب ایک آہ تھی۔

”آجائے۔“ اس نے جلدی سے اس کے ساتھ اس کے لیے اور فری جاکے چلی۔

”تم کیا سوچ رہی ہو بیلا؟“ وہ سمٹ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔

”کچھ بھی نہیں۔“

”نواؤ نواؤ ہی بھیا رہی ہو۔“ اس نے جھنجھار کر کہا۔

”نہیں سوچ رہی تھی۔ اب۔ اب۔“ اس نے الٹ الٹ کر کہا۔ ”اب کیا کروں گی۔ میرا مطلب ہے

آئندہ کچھ عجیب عجیب سی آوازیں زرداری ہیں۔ مجھے آئندہ سے ڈر آ رہا تھا گوشتی۔“

”تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”جتنے ہی تمہیں سانے سے منع کر دیا۔ کبھی کا خیال تھا تم برداشت نہیں کر سکو گی۔ دراصل ایک

مہینہ آؤں نے تمہارے منہ سے کاسارا کا کھم کھل کر دیا ہے۔ بالاکا یا نثر برا فراڈی تھا۔ اس نے بایا سے

دھوکے سے کاغذات سائن کروا لیے۔ وہ کسی مشترکہ کہانی پر مہربان لگا رہے تھے۔ جو فراڈ تھی۔ اور سانے

اپنی وفات سے پہلے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔

دیکھو بیلا۔ دنیا میں کتنا قریب ہے۔ وہ ان کا کارہ سال پرانی بات نہ تھا۔ ان دونوں نے مل کر گھر کا اثاثہ تک

گروی رکھ دیا تھا۔ اس میں ان کو بے پناہ نتائج کی توقع تھی۔ لیکن اس کے بدل میں بے ایمانی آگئی۔ وہ تو شکر

کہ خدا کے ایک نیک بندے نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ تفصیل تو ہمیں ڈیڑی بتائیں گے۔ لیکن

عدالت نے گھر اور گھر کا سارا سامان تمہارے حوالے کر دیا ہے۔“ اس نے ایک طویل گھبراہٹ سے کہا۔

یہ بھی چھپائی ہوا۔ اور وہیں نہ بھی ہوتا تو اب اس نے جینے کا ڈھنگ دیکھ لیا تھا۔

قدرت ہر روز آپ کو ایک نیا سبق سکھاتی ہے۔

پہلے اس نے اس گھر کے اور ان کے مالکوں کے بغیر جینے کا ڈھنگ دیکھا تھا۔ اب اسے اس کو ایک اور

گھر اور اس گھر میں بسنے والے افراد کے بغیر زندہ رہنے کی تربیت ملنی ہوگی۔

ہاں اس وقت وہ بے شک کمزور پڑی تھی۔ لیکن یہ کمزوری محض رات کی تاریکی کی وجہ سے ہوتی

ہے۔ مگر وہ پھر شاش بکاش ہوگی۔ ہر طرح کی نئی ذمہ داریاں اور نئے حالات کو نمٹانے کے لیے چالیں

چومد۔

پھر وہ اس سے پرانے دوستوں کی بابت ہلکی چٹکن سی باتیں کرنے لگی۔ بی بیور شی کو اور حور ابھوڑنے
کے قصے۔ پھر اس نے چپاؤں پھیلائے۔ تھوڑا سا ٹھکر پھیلا۔ سر ہٹایا۔ اور جیسے بے فکری کی نیند سو گئی۔
وہ تو بے فکری کی نیند سو گئی۔ لیکن گوشتی کو مستقل تشویش میں مبتلا کر گئی۔ آخر وہ وہاں کی باتیں کیوں
نہیں کرتی۔ وہ جہاں ایک سال بسر کر کے آئی ہے اس سے مستقل بچھا کیوں چھڑا رہی ہے۔

کیا اس شہر سے کوئی الٹا دکھ بات وابستہ ہے۔ اگر ہے تو اسے چھپایا کیوں جا رہا ہے۔ بیلا کئی راتوں سے

جاگ رہی تھی۔ وہ خود تو گھر کی نیند میں چلی گئی۔ البتہ گوشتی کی نیند ہوا ہوئی۔ وہ کتنی دیراٹھ اٹھ کر صبح

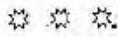
رہی۔ آیا امان تھج کے لیے ابھی تھیں۔ باقی ماندہ کمروں میں گھرا سکوت تھا۔ اور وہی بہتر روشنی۔ پتا نہیں

بیلا کو ساتھ کیا جاتی۔ وہ اپنے بار میں کب ٹپکے گی۔ کب پٹائے گی۔ اور پٹائے گی بھی کہ نہیں۔

لیکن واقعی اس کے کچھ پٹانے کے ارادے بھی نہیں تھے۔ اس نے زندگی کو اس طرح نئے سرے

سے بسر کرنا شروع کر دیا جیسے یہ ایک سال اس کی زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔ ہاں صرف اپنی خود سری

تک کر کے وہ ہر روز صبح ریاض بھائی اور ڈیڈی سے مشورہ کر لیتی۔



”ریاض بھائی۔ مجھے اچھا ہے۔ اے کر لیا چاہیے۔ کیا خیال ہے۔ میری پردھانی اور حوری رہ گئی تھی۔“ گوشتی
کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پتا نہیں پردھانی کے اور حورے رہ جانے میں کس بچھاؤ کے کا دخل ہے۔ مرکز
ایک برس کے بارے میں وہ شرمسار ہے بھی یا نہیں۔ وہ اپنے فیصلوں پر اب شرمندہ بھی ہے کہ نہیں۔

پھر وہ ریاض بھائی کے گھر اور بی بیور شی جاتے ہوئے ڈیڈی سے اجازت لیتی اور بھی سے دے دے۔

وہ جاتے وقت جتنی تضحی ہو رہی تھی اتنی ہی ناگہاری سے اس کی واپسی اس کی شخصیت کو شکوک

بٹا رہی تھی۔ مگر ڈیڈی اس کی واپسی سے اس قدر شاداں تھے کہ انہوں نے بھی اس کی شخصیت کی اس

تبدیلی پر غور کی بات۔ سوچائی نہیں۔ ”بیلا کو دال چاہی۔ بہت پسند ہے۔ دوپہر کو پٹنے کی دال پٹا لینا۔“ مگر

اس کی بی بیور شی سے واپسی سے پہلے پوچھا پوچھا کر باور جمی جانے کے چکر لگا تھی۔

”مسلمان بنایا ہے کہ نہیں۔ پھر بیٹن کارا۔ تمہیں کما نہیں بیلا بیٹن نہیں کھاتی۔“

لیکن مگر نے بھی غور نہیں کیا۔ اس کا لڑاؤ اس کی ضد منہ کشی سب کچھ ہوا ہوئی۔ وہ کس سکون سے

بیٹن کارا لٹ لٹ لٹ رہی ہے اور احمیتان سے کھاتی رہتی ہے۔ سہ دال کے لیے رغبت کا اظہار کرتی نہ بیٹن

سے آکر بہت کال۔

دو واپس آگئی تھی۔ اور ان کی اپنی تھی۔ بس۔

ریاض بھائی کی کہنا سے واپسی اتنی مدت بعد ہوئی تھی کہ بیلا کی شخصیت کی بدلتی تھیں کے بارے میں

نہ ان کو علم تھا نہ آگئی۔ وہ ان کی سن کی دوست تھی اور بی بیور شی سے وہ اپنی دیوار کے اس طرف اس

چھوٹے سے خانہ ان کو آباد دیکھ رہے تھے بیٹن میں انہوں نے گوشتی ہی کی طرح اس کی ضد منہ کشی پوری کی

تھیں۔ اس کے نخرے اٹھاتے تھے۔ وہ صحت عرصے بعد ملے تھے۔ اب شاید وہ پڑی ہو گئی ہے۔ اور بی بیور

بس۔

”کیا اسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ اگر میں اسے معاف کرتا ہوں۔“

”وہیں نہیں بلکہ یہ قوانین کا مقدمہ ہے۔ آپ تو اس مقدمے میں پارٹی بھی نہیں بنیں۔ اور اگر ایسے لوگوں پر رحم کیا جا رہا ہے تو قانون، مقدمے، عدالت، فیصلے سب بے ہودہ باتیں بن جائیں گی۔“ انہوں نے قائل نہ کر دی۔ چچوں کی یہ روٹی روٹ سمول گئی۔ اور راجھ کھٹے ہوئے۔

”میں آپ کے والد صاحب کا پرانا قانونی وکیل ہوں۔ اور آپ کا خادمہ آپ کو جس طرح بھی ضرورت ہو میں ہر طرح حاضر ہوں۔“

”ہمت بہت شکر! انکل۔“ اس کے لہجہ میں دلی اطمینان اور سکون تھا۔
 پھر وہیل صاحب، میجر صاحب چلے گئے، گر واور میں سے بھرے گھر اس کی بیک گراؤنڈ پر اکثرے لوگ
 اس کے اپنے اس کے بہت نزدیک، لیکن ہاتھ نہیں لگا دوں۔
 ”اگر آپ ادا عازت، ہوؤ رُف، میں اس شخص میں نہ لوں۔“

”وہ کھول نہیں۔“ وہی نے بے سہارا پیٹ کہا تھا۔
 ”وہ توں لگے تمہارا لے لے ہے۔ جہاں تم خوش رہو۔ تمہیں امید مان ہو۔“

وہ اکیلی بیٹھی رہی۔ ہائیڈریس باریک دیکھ چکے تھے۔ کوئی اسے سست قدموں اور سری چال سے سوچا تھا۔ اس کو شور و نوک کی۔ وہ بھی اس کے بغیر اس گھریں رہی نہیں تھی۔ اس کو یوڈین بھی اس کے بغیر نہ دیکھ سکتا تھا۔ ہائیڈریس باریک دیکھ چکے تھے۔ کوئی اسے سست قدموں اور سری چال سے سوچا تھا۔ اس کو شور و نوک کی۔ وہ بھی اس کے بغیر اس گھریں رہی نہیں تھی۔ اس کو یوڈین بھی اس کے بغیر نہ دیکھ سکتا تھا۔ ہائیڈریس باریک دیکھ چکے تھے۔ کوئی اسے سست قدموں اور سری چال سے سوچا تھا۔ اس کو شور و نوک کی۔ وہ بھی اس کے بغیر اس گھریں رہی نہیں تھی۔ اس کو یوڈین بھی اس کے بغیر نہ دیکھ سکتا تھا۔

گوشتی نے اس کی مدد کے لیے مصطفیٰ کو رائے کے لیے جن افراد کو روانہ کیا تھا اس نے انہیں بھی واپس کر دیا۔ سب وہ شادیست بن چکے تھے، گوشتی نے کہا کہ ضرورت نہیں رہی۔ گوشتی نے فخر کو سزا دیا تھا۔ لیکن اس کی ذلت کے لیے جتنی کم نہیں ہوئی، سہا نہیں دیا وہاں کیا کر رہی ہے۔ نہیں وہ ایکلے بیٹھ کر چپکے چپکے روتی ہو نہیں اسے کچھ ہونے چاہئے۔

رات کو ڈیڑھ بجے اسے واپس لئے مجھے گوشی چلے پھر کلب کی طرح صحن میں عربی بھردی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ ڈیڑھ بجے کے ساتھ بحث کرے گی اور ان کے گھر رہنے کے بجائے اکیلے گھر میں رہے گا تو جیسے

کے لیے ملا کر لائے گی۔ لیکن وہ ان کا نام نہ کر سکوں گے ان کے ساتھ چل پڑی۔ اور کرشی نے دیکھا نہ وہ روٹی تھی نہ اس کا چہرہ میں تھا نہ اس پر کوئی باریک کاری تھی۔

صرف اس نے اپنا کمر ٹھیک کیا اور فاطمیں پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

آخر وہ اپنی تزکیہ نفس کے کمن مراطل سے گزری ہے۔؟

اس نے اپنی بات کو سن کر بڑے استغنائوں سے گزرا اور گراحتی جلا دی ہے۔ کس نے اس کو نکلنا دیا؟

”آپ کو یہاں عجیب نہیں لگتی ریاض بھائی۔“

وہ صوفے میں اور اخبار میں یکے وقت غرق تھے۔

”عجیب کیوں بھئی۔“ انہوں نے لاپرواہی سے پوچھا تھا۔

”وہ بہت ہل گئی ہے۔“ اس نے فحشگی سے کہا۔

”اس کا سبب کچھ بدل گیا۔ کیا اسے بدنامتیں چاہئے تھیں۔“ ریاض بھائی نے حیرت سے اس کو دیکھا۔

”اس کے بال بپ۔ اس کا گھر۔ اس کا شہر۔ اس کے دوست، مہاشی۔ ہر چیز تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ نہ

”میں نے“

”میں نے سب کچھ اس نے اپنی ہمد سے تبدیل کیا تھا۔ اس کو سب منع کر رہے تھے۔“
 ”اس نے اچھا کیا۔ کیا دانش مندان فیصلہ تھا۔ وہ سال، ہجران، حالات سے دور رہی۔ اسی لیے ایسا سے

صبر کیا ہے؟

”اب کسی سے پیار نہیں کرتا۔ اسے ہم میں سے کسی کی ضرورت نہیں۔“

”کیونکہ میں نے تم سے بیمار اور زہ موٹو بھیج دیا ہے کہ جس سے وہ شرارت سے منہ رہے“

تسلی ہو گا ساسرین پڑائی۔

اسے تو کوئی دلچسپی ہی نہیں اس نے تو مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا۔

”اے ہو۔ آریہ بات نہیں۔“ انہوں نے کہا ہوا اخبار دوبارہ اٹھالیا۔ ”میں نہیں کہتا اس سے۔“

ہماری گوشت سے اس کی منتیتری ہامیں لیا۔
 ... مار غتا ہو گئے۔ وہ خود کو بیلنس کر رہی ہے گوشت۔ خوشیاں اس کو ملیں بھی اور چھڑتی بھی رہیں

ابا اگر وہ خود کبر تمام کی سی کیفیت میں غرق رکھے اور ایک ہی بات کا رونا روائے تو گزارہ کیسے ہوگا۔“

چپ سے زندہ تھی۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ درست۔ لیکن ان لوگوں کو کیہ فکر بچھاپائے کہ اس کا اور بیلا کا سلسلہ

لڑی تھی جو کوئی اس غرض سے آئی تھی کہ کوئی انقلاب لائے گی۔ دوپہر کے ڈھائی بجے کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں بند خوب خوب اس کو برا بھلا کہتا ہو گا۔ اس کے گلے میں پھر کوئی گولہ سا اٹک گیا۔ اس وقت شام کے پونے سات بجے ہیں۔ آہستہ آہستہ ڈانگ بیل میں جمع ہونے والے لوگوں کو یہ یاد بھی نہیں رہا ہو گا کہ ایک مستقل طور پر آباد رہنے والی کرسی اب خالی پڑی ہے۔ ہل ایک شخص تھا۔ جو اس کے لیے گھڑی دیکھتا تھا۔ جو اس کا منتظر تھا۔ لیکن اب وقت اور زمانے کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔

اس دوپہر شام میں جب گھر میں سرور اور اندازاً بڑھتا جا رہا ہو گا تو کیا ڈھائی تین ماہ کی یہ وقتہ ان کو ایک لڑکی کے بھلاؤ دینے کے لیے کافی نہیں ہو گا۔ کیا وہ واقعی اتنی غیر اہم ہے کہ اس کو بھلا دینا بالکل آسان ہے۔ اس کا بی چاہا وہ کسی کو کچھ سنائے کچھ نہ کہے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح جرات کے اعلیٰ ترین اعزازات دے کر اس کو بیڑہ بیل پر بٹھا دیا گیا ہے۔ لہذا اب اسے اپنے آنسو بھی خود ہی خشک کرنے ہوں گے۔ کون اس کی مدد کو آئے گا۔ سوائے کاروباری معاملات کے کہ ریاض بھائی کو جانا تھا اور جانے سے پہلے ایڈمنسٹریشن کے سارے سبق گھول کر لے کر لے جاتا تھا۔

”پریس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھو۔ ویسے تو دنیا میں آنکھیں کھول کر ہی جینا پڑتا ہے۔ اور جب ضرورت پڑے آنکھیں مارتے پڑ رہے لو۔ جب کسی فائل کے بارے میں فیصلہ کر دے اس کی ہر چیز کو بھلا دو۔ جب تک کاغذ کا ایک ایک لفظ نہ بڑھ لو ہرگز نہ بھولنا۔ گویا وہ تمہارا نگار تاملہ ہی کیوں نہ ہو۔ کسی پر اعتبار مت کرو۔ لیکن ہر شخص کو یہ یقین دلانا کہ وہ آخر شخص ہے جس پر تم یقین رکھتی ہو۔“ اس کا مطلب پریس کا دوسرا نام منافقت ہے۔ اور منافقت کی زندگی بولنا کر نہیں سکتی۔ اس نے حتیٰ الجس میں سوچا۔ لیکن اب جو بھی فیصلہ اس نے کر لیا تھا اس پر سرکف اس کو عمل کر کے دکھانا تھا۔ رات کی خاموشی میں وہ بستر پر پڑی گوشی کو خشک سے دیکھتی ہوئے خبریں سوچتی تھی۔ اس کی زندگی میں نہ بچپن کے تھکے نہ بڑھاپے کی دھندل۔ اسے ملنے کی خوشی تھی نہ بچپن کے خوف۔ ریاض بھائی اور ڈیڑی نے بتایا تھا اس کے گھر میں قیام کے دوران ایک بہت معقول آدمی سے اس کی گفتگو ہوئی تھی۔ جس کا تعلق بھی ان کی بڑی برادری سے تھا۔ اس نے گوشی کو اپنے منبیر کے لیے تڑپے دیکھا تھا نہ بچپن کے ہال دو ڈھائی ماہ کی تیاری کے بعد ان کی شادی ہو جانا تھی اور پریس۔ کتنی قابل رشک زندگی ہے۔ غیر محسوس طریقے پر اس کو احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں سے کوئی گہرا مٹی کی چیز مسلسل نیک رہی ہے۔ کسی ایسے شخص سے طبعاً ہونا کتنا تکلیف دہ ہے جب کہ آپ خود کو بھی ساری عمر کی نشیں دلاتے رہیں کہ وہ شخص کسی بھی آپ کے لیے انتہائی اہم نہیں کہ آپ اس سے بچھڑ کر آنسو بہائیں۔

اور کون چاہے یہی منافقت سے عیارت لیس رہنے والا سیدھا راستہ۔ اس نے پچھلے آنسو پونچھے تو آگے بہہ آنے والے آنسوؤں نے آنکھیں اور چہرہ تر کر دیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے بھلا رانی اس نے خود کو بڑے دھارے منبیر کرنے کی کوشش کی۔ رات

دشاواری ایسا نہیں تھا۔ وہ تو سو نہیں سکتی تھی جب تک ان بھر کی روداد اسے سنا نہ لیتی۔ نہ جانتی تھی اب بھی وہ اسی لیے جاگے جا رہی ہے کہ اس نے اپنے دل میں کوئی بہاؤ ایسا راز چھپا رکھا ہے۔ بیلا واپس آئی تو مسلسل شیط کی وجہ سے خود سے بلند اور بہت تر گد رہی تھی۔ چہرے وہ آہستہ آہستہ بہت دور جا رہی ہو۔ خدا جانے اسے یہ یقین بننے کا شوق کیوں چرایا ہے۔ لیکن وہ جانتی تھی وہ جہاں بھی جائے اس سے زیادہ دور نہیں جاسکتی۔ ایک دن اسے پلٹ کر آنکھیں پڑے گا۔ بس گوشی کو صرف اس کی واپس ہی کا انتظار تھا۔

لب و لڑکی سی نہیں رہی تھی۔ وہ ریاض بھائی اور ڈیڑی سے بات کرتی تو دفتر کی فائل کی پریس کی اور دنیا میں بیٹے کوئی روٹا ہی نہیں رہا۔ آواہان کیسے اور تو حادوں گھر سے ملحقہ دفتر میں گزار کر رہا رات کو سونے کے لیے گھر آتی تو اپنی وقت دفتر کی فائل کو دیکھنے کے لیے ڈیڑی کے کان لگاتی رہتی۔ ان کے سہ ماہیہ میٹر ایک سال کی طویل پروڈکٹری کے بعد حال ہی میں کسی نپنی سے وابستہ ہوئے تھے۔ مالک کی وفات سے بیٹے نے دل دینا سے انکسار کیا تھا۔ اور بیلا کے ساتھ کام کرنے پر وہ خود کو تادم نہیں کیا رہے تھے۔ انہوں نے بیلا کی رانیسی کا سنا تو اس سے ملے آئے۔ مقدمہ جیتنے کی مبارک دے کر اور کام نہ کر سکتے کی مذمت کر کے چلے گئے۔

ریاض بھائی کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ وہ اس سے زیادہ عرصہ رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور پریس کی چھٹی فائل کو کھل سکتے تھے۔ انہوں نے دفتر چلا کر دے کے لیے شروع کر دی تھی۔ لیکن دفتر کو ہر کیف ایک باقاعدہ مینجری کی ضرورت تھی۔ کچھ سہ ماہی لوگ جو ابھی تک پروڈکٹری سے تھے۔ حال ہو گئے۔ جن آٹھ دس لوگوں کی مزید ضرورت تھی ان کی تقرری مینجری کے بعد کی جاسکتی تھی۔ اب ہر کیف اس کی اس ایک ذمہ داری کی جواب دہی تھی۔

اس نے پہلے پبل بلیک کی کرسی سنبھالی تو اسے بہت عجیب لگا۔ لیکن ہر کیف یہ دینا ہے۔ اس نے سوچا۔ اور اس کو اس طرح چلانا ہے۔ اور یہ بڑی سستی کی جذباتیت ہوگی اگر وہ گروہ بدل لے یا کرسی بدل لے۔ ہاں دنیا والوں کے سامنے اسے بہادر رہی ہن کر رہنا ہے۔ اور ویسے بھی اب تو ہمدردی کے پڑے زحول کو بچانے کی عادت کی پڑ گئی تھی اس سے ہمیشہ یہی توقع کی جاتی رہی ہے کہ وہ بہادر ہے اور بہادر بن کر دکھائے۔ ہاں ایک شخص جو ہر آزمائش میں اس کی ہمدردی آنا لے اٹھ کھڑا ہو نا تھا۔ اور اس شخص کے تصور نے پریس کی آنکھیں غم کو اس اب جیسے اس کو اتناؤں میں پڑنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس نے یہ مرضی ہی نہ کر سکتی تھی کہ گھر گھر کر کے بیک نہ کیا۔

سامنے آ رہا یہ ستری کا کا کہ وقت اسے اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا تھا۔ یہ صبح کے دس بجے ہیں۔

اب دوپہر کے ڈھائی بجے ہیں۔ شام کے پونے سات بجے ہیں۔ پہلے بے نے تو دس بجے کی چائے پیئے ہوئے میرے پارے میں کیا سوچا ہو گا کہ میں دھوکے باز تھی، فراڈ تھی۔ ان سب کو جل دے کر نکل آئی۔ اور آگران سے معذرت کے دو لفظ بھی تحریر نہیں کیے۔ لیکن وہ خانہ کل سے جھگڑتے وقت ضرور اس کی ڈھال بن جاتی ہوں گی۔ لیکن وہ شخص۔ ہاں جو اس کی ہمدردی چکانے والی عادت سے تنگ پڑ چکا تھا۔ اپنی اٹھدی میں ہمیشہ اس کے خلاف سوچتا ہو گا۔ کہ وہ بھی ایک

”بیلا۔ بیلا۔“ گوشتی اسے دبا ترے پکارا، تجھ کو ڈر رہی تھی۔
 مجھے اب کسی کو یاد نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے خاصوشتی سے انگو کر لیا تھا، ہوا سہرا میں بھر کے شہقت
 کرتے بازوؤں پر لگا لیا۔

”بیلا پلیر کیا ہوا ہے“ گوشہ ننگے پاؤں ہیرا نماں سی کھڑی تھی۔

”سورجی گوشت میں نے کوئی فضول سا خواب دیکھا تھا۔“

”کیا ایکھا تھا تم نے خواب میں۔“ وہ خاموش ہو کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ ”تم نہیں نہیں کر رہی تھیں۔“

میں خرد کو سمجھا رہی تھی کوئی کہ مجھے رونا نہیں چاہیے۔ بچہ کوئی نے پڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا غصہ دھکا چھپا نہیں تھا اس لیے اس نے جھٹکا کر کہہ دیا۔

”تم کیا تھپارہی ہو؟ بیلا اور کیوں؟“

”میں کیا چھپاؤں گی۔ اور کیوں؟“ اس نے بے ساختگی میں ہی جواب دیا۔

گوشی چپ سی روٹھی۔ ”ٹھیک ہے اگر تم سمجھتی ہو نہیں سمجھ سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تو یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اس نے اس کو اکڑتے اور روٹھتے دیکھا۔

”بات یہ ہے کوشی۔“ اس نے اطمینان سے کہنا چاہا۔

”میں جہاں رہتی تھی۔ اس علاقہ میں ایک بہت بڑی مریخوئی ہو گئی تھی۔ وہاں کے سردار کے بڑے بھائی اچانک فوت ہو گئے۔ جس دن میں اسے ستر کیا ناں۔ اس دن“

”سروا رکے پڑے بھائی۔ آچھر سروا ر تو وہ خود ہوئے۔“
 ”ہاں۔“ وہ ہلکے پکچائے۔ یہ ایک سی کہانی تھی۔ وہ روپوش تھے اچانک سانسے بھی آئے اور قسم بھی

150 151 152 153 154 155 156 157 158 159 160 161 162 163 164 165 166 167 168 169 170 171 172 173 174 175 176 177 178 179 180 181 182 183 184 185 186 187 188 189 190 191 192 193 194 195 196 197 198 199 200 201 202 203 204 205 206 207 208 209 210 211 212 213 214 215 216 217 218 219 220 221 222 223 224 225 226 227 228 229 230 231 232 233 234 235 236 237 238 239 240 241 242 243 244 245 246 247 248 249 250 251 252 253 254 255 256 257 258 259 260 261 262 263 264 265 266 267 268 269 270 271 272 273 274 275 276 277 278 279 280 281 282 283 284 285 286 287 288 289 290 291 292 293 294 295 296 297 298 299 300 301 302 303 304 305 306 307 308 309 310 311 312 313 314 315 316 317 318 319 320 321 322 323 324 325 326 327 328 329 330 331 332 333 334 335 336 337 338 339 340 341 342 343 344 345 346 347 348 349 350 351 352 353 354 355 356 357 358 359 360 361 362 363 364 365 366 367 368 369 370 371 372 373 374 375 376 377 378 379 380 381 382 383 384 385 386 387 388 389 390 391 392 393 394 395 396 397 398 399 400 401 402 403 404 405 406 407 408 409 410 411 412 413 414 415 416 417 418 419 420 421 422 423 424 425 426 427 428 429 430 431 432 433 434 435 436 437 438 439 440 441 442 443 444 445 446 447 448 449 450 451 452 453 454 455 456 457 458 459 460 461 462 463 464 465 466 467 468 469 470 471 472 473 474 475 476 477 478 479 480 481 482 483 484 485 486 487 488 489 490 491 492 493 494 495 496 497 498 499 500 501 502 503 504 505 506 507 508 509 510 511 512 513 514 515 516 517 518 519 520 521 522 523 524 525 526 527 528 529 530 531 532 533 534 535 536 537 538 539 540 541 542 543 544 545 546 547 548 549 550 551 552 553 554 555 556 557 558 559 560 561 562 563 564 565 566 567 568 569 570 571 572 573 574 575 576 577 578 579 580 581 582 583 584 585 586 587 588 589 590 591 592 593 594 595 596 597 598 599 600 601 602 603 604 605 606 607 608 609 610 611 612 613 614 615 616 617 618 619 620 621 622 623 624 625 626 627 628 629 630 631 632 633 634 635 636 637 638 639 640 641 642 643 644 645 646 647 648 649 650 651 652 653 654 655 656 657 658 659 660 661 662 663 664 665 666 667 668 669 670 671 672 673 674 675 676 677 678 679 680 681 682 683 684 685 686 687 688 689 690 691 692 693 694 695 696 697 698 699 700 701 702 703 704 705 706 707 708 709 710 711 712 713 714 715 716 717 718 719 720 721 722 723 724 725 726 727 728 729 730 731 732 733 734 735 736 737 738 739 740 741 742 743 744 745 746 747 748 749 750 751 752 753 754 755 756 757 758 759 760 761 762 763 764 765 766 767 768 769 770 771 772 773 774 775 776 777 778 779 780 781 782 783 784 785 786 787 788 789 790 791 792 793 794 795 796 797 798 799 800 801 802 803 804 805 806 807 808 809 810 811 812 813 814 815 816 817 818 819 820 821 822 823 824 825 826 827 828 829 830 831 832 833 834 835 836 837 838 839 840 841 842 843 844 845 846 847 848 849 850 851 852 853 854 855 856 857 858 859 860 861 862 863 864 865 866 867 868 869 870 871 872 873 874 875 876 877 878 879 880 881 882 883 884 885 886 887 888 889 890 891 892 893 894 895 896 897 898 899 900 901 902 903 904 905 906 907 908 909 910 911 912 913 914 915 916 917 918 919 920 921 922 923 924 925 926 927 928 929 930 931 932 933 934 935 936 937 938 939 940 941 942 943 944 945 946 947 948 949 950 951 952 953 954 955 956 957 958 959 960 961 962 963 964 965 966 967 968 969 970 971 972 973 974 975 976 977 978 979 980 981 982 983 984 985 986 987 988 989 990 991 992 993 994 995 996 997 998 999 1000 1001 1002 1003 1004 1005 1006 1007 1008 1009 1010 1011 1012 1013 1014 1015 1016 1017 1018 1019 1020 1021 1022 1023 1024 1025 1026 1027 1028 1029 1030 1031 1032 1033 1034 1035 1036 1037 1038 1039 1040 1041 1042 1043 1044 1045 1046 1047 1048 1049 1050 1051 1052 1053 1054 1055 1056 1057 1058 1059 1060 1061 1062 1063 1064 1065 1066 1067 1068 1069 1070 1071 1072 1073 1074 1075 1076 1077 1078 1079 1080 1081 1082 1083 1084 1085 1086 1087 1088 1089 1090 1091 1092 1093 1094 1095 1096 1097 1098 1099 1100 1101 1102 1103 1104 1105 1106 1107 1108 1109 1110 1111 1112 1113 1114 1115 1116 1117 1118 1119 1120 1121 1122 1123 1124 1125 1126 1127 1128 1129 1130 1131 1132 1133 1134 1135 1136 1137 1138

”لِيَايَمِ اِنْ هِيَ مَحَبَّتُ لِرَبِّكَ
وَيُخَالِفُ لِرَبِّكَ اِنْ هِيَ كَرِهٌ

”مہیں۔۔۔ میں ہاں۔“

”ہمیں بھی۔ اور ہاں بھی۔“

”میرا مطلب محبت اور کرتی تھی لیکن اسی طرح نہیں جس طرح تمہارا مطلب تھا۔“

”جس طرح میرا مطلب تھا اس طرح تم کس سے محبت کرتی تھیں؟“ اس نے ایک دم گوشی کی قطعی سنجیدہ اور یقین کی آنکھوں کو دیکھا۔

اُسے یہ تو دیکھی تھی۔ اس کی ساری عمر کی دوست۔ بہہ بھجکے ہوئے والے۔ بے ہرک و دخل دینے والے۔ جو اس کی اتھاہ کو پہنچاتا تھی۔ جو اس کے اندر جھٹکنا جانتی تھی۔ اور اس سے زیادہ اس کو کون پہچان

سکتا تھا۔ اور اس سے بچ کر بھاگا بھی کہاں جاسکتا تھا۔

اس نے فرار کے بہتے راستے چنے تھے۔ لیکن اب ہر راستے پر ایک رکاوٹ ٹھہر چکی تھی اس کی دستداری تیار و زین نظر سے اس کے چہرے پر غریبی تھی۔ اب شاید بچا شکل تمام خالی راستے کہیں بھی نہیں تھا۔ (ہاں صراط مجھے تمہاری واپسی کا انتظار تھا۔ مجھے پتا تھا کہ راستے میں ہی طرف ضرور آئیں گے)

”وہ ایک شخص تھا۔“ اس نے اہستگی سے کہا۔

”ظاہر سے مست اچھٹا ہو گا۔ لیکن یہ رونا دھونا کیوں۔“

”دراصل۔“ اس نے ہچکچا کر کہا چاہا۔ ”پتا نہیں۔ یہ کہتا کتنا مشکل کام ہے لیکن دراصل اس کو مجھے

سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں تھی۔^{۱۰}

”کیوں۔ یہ تم نے کسے انداز لگایا۔“

”کیونکہ اس نے اس سے مختلف اور کوئی بات کہی نہیں تھی۔“

”تمہیں تمہارے تم سے لپٹا نہیں۔“

وہ نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں کہی ہے۔ ”مگر“

”مگر self pity اگر اس قدر سے محبت نہیں تو تم اس کے لیے کیوں زور دے رہے ہو۔“

”الوقت سب سے بڑا دشمن ہے۔ جو کوئی کام اس وقت سے کرے کہ اس وقت سے کرے۔ وہ کبھی کام نہ کرے۔“

”نیکو، تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ تم کو کچھ نہیں کہنا ہے۔ یہاں سے تم کہاں رہتا ہو۔“

۱۰۰

۱۱ - ۴ کج

اس سے

”نہیں۔“

”جہاں کر۔“

”نہیں۔“
”تم ہمیشہ اسی طرح قرار حاصل کرتی ہو۔ تم نہ کہیت کا شکار تو نہیں۔ تمہیں یہ سوچ سوچ کر مرنا آتا

ہوگا کہ لوگ تمہارے لیے

”کیوں اسے مت کرو“

”اچھا نہیں کرتی۔“ وہ اپنے بستر پر اسی طرح چلی گئی۔
 ”تمہارے زخم بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ اور اس کا درد چار دن کے لیے نہیں عمر بھر کے لیے ہوتا ہے۔“

سوچ لیتا ہوا۔ پھر آخری فیصلہ کرنا۔ "کوئی یہ اسمینان گلوب لمے لیٹھی سی۔"

لیکن یہاں کوہ چین کر رہی ہو سو یہ آخری رات تھی جو اس نے دورِ کُلی پہ آئندہ اسے رونا میسر ہے۔
آنسو جیسا تھیں سر پہ یوں پڑاؤ پر لگانے کے لیے نہیں ہوا۔ اس وقت گڑھی کے پر سکون و وسیع کمرے

میں سونے والے کے لیے اس کی بہانہ سمجھتی تھی تو کسی اور جگہ اس سے بار بار اپنی ہی کامیابیوں کی بات کر رہی تھی۔ پھر اس نے خود کو کامیاب نہیں کہہ کر لیا۔

263

روانہ کیے اور دفتر کو باقاعدہ دفتر بنا کر اس نے اپنی زندگی باپ کے راستے ہی کے لیے وقف کر دی۔
اس دن ان لوگوں کو دفتر کا شیر تماشہ کرنا تھا۔

پہلے روز گاری کی دھڑکی کہ ایک بے حد سوئی فائل اس کی ہیز پر آج کے انٹرویو کے لیے تیار ہو گئی۔
ڈیفنی کسی ضروری کام سے ان دونوں اپنے آفس میں مصروف تھے اور ریاض بھائی نہایت لاپرواہی سے
اسلام آباد روانہ ہو گئے تھے انہیں فارن آفس سے متعلق کوئی کام تھا۔ وہ نہ بھی جانتے لیکن جانے سے
پہلے انہوں نے پلاز سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کی عادت ڈالو۔ انگلی پکڑ کر بول چلتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ تم مجھ کو نہ بول دو جو کا
نو کوئی بھی کھسا سکتا ہے۔ میں بھی اور تم بھی۔ بہتر ہو گا کہ اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرو۔ نقصان اٹھانے کی
عادت ڈالو! تو قائد میں بھی مڑا آئے گا۔

ریاض بھائی دشمن نہیں تھے وہ فیصلہ بھی ٹھیک ہی کرتے تھے۔ اسے دشمنوں کے درمیان گزار دی
بہت سی شاموں میں سے دوستوں کو تلاش کرتا تھا۔

اس نے مولیٰ کی فائل کوئی جس میں کچھ نہیں تو ساٹھ سترہ سو خواتین منہ بانٹ دیا موجود تھیں۔ ان
سب کو جہاز میں تو غسانا نہیں تھا۔ اور اس نے ریاض بھائی کی پہلی شہادت ہی ایک فلم رو کر رکھی تھی۔
اس نے اس فائل کو کھولا تھا۔ پڑھنے کی زحمت کی تھی۔

شاید آہستہ آہستہ وہ عادی بھی ہو جائے۔ لیکن فی فائل تو اسے شدید کوفت ہوتی۔
ناگہلا بدست بن پیدا نکل۔ لڑا میا نکل۔

وہ اپنی مولیٰ فائل کی ایسی ہے، ہر وہ باتیں کمال تک پڑھیں ہاں انٹرویو دینے لوگ آئیں گے تو ان کا صف
بھی تفصیل سے پڑھ لے گی۔

پرویز رحیم ولد رحیم الدین۔ بن پیدا آتش انیس سو فٹاں۔ سابقہ تجارت اور ڈکریوں کا ذریعہ اس نے
پرویز رحیم کو پٹایا اور انٹرویو کرنے لگی۔ دوست اور دشمن کو برت کر تو تمیز کرنا مشکل نہیں ہوتا لیکن صرف
ایک صفحہ پر کبھی روئید اور اور انتہا کرتی نظروں سے کیا دیکھو اور کیسے پہچانے۔
دلدار علی۔ عبداللطیف اعوان۔ محمد اسلم۔

پندرہ پندرہ میں میں منٹ کے اس انٹرویو کے شروع والے حصے نے ہی اسے تھکا ڈالا تھا۔
غیر معمولی صلاحیتوں والے نوجوانوں کی کمی نہیں اور پرویز ڈکاری نام ہے۔

چوہدری سعید۔ اس نے فائل سمجھیں اور نیا صفحہ پڑھنے لگی۔
چیز اس کی ہمراہی میں آنے والے تھے امیدوار نے لمحہ بھر کے لیے اس کو ماکن کر دیا۔ چار میں زمین
اپنی جگہ سے سرک ٹی کیا۔ آہان کی گردشوں میں کوئی انقلاب آ گیا یا۔۔۔

رات کی بے خوابیوں میں دیکھ جانے والے ایک بے ربطے تصور نے کسی زندہ خواب کی شکل اختیار
کر لی۔

وہ کشاں کشاں دروازے سے چٹا آ رہا تھا۔ اس کا اٹھنا ایک ایک قدم جیسے اس کے دماغ اور اعصاب
کو کشاں کشاں دروازے سے چٹا آ رہا تھا۔ اس کا اٹھنا ایک ایک قدم جیسے اس کے دماغ اور اعصاب

پرویز رحیم کی طرح جمع رہا تھا۔ ہم۔ ہم۔ ہم۔

وہ نظریں اٹھا کر دیکھے۔

اپنی نگاہوں پر یقین کر لے یا بے یقینی کے اس لمحے کو آنے والے سڑکی گرد سے اٹے جو توں پر نظریں
جمائے جمائے ٹپک جائے۔

اس نے کرسی فیصلی اجازت بھی چاہی۔ اور بیٹھ بھی گیا۔

وہ وہیں تھی اس طرح وہ توں ہاتھوں کی انگلیاں اٹھائے۔ بے سبب اور بے طرح جوڑ سکتے ہیں کوئی
کر باؤں میں کرنے کی کوشش میں کُن۔ نہ اس نے مخاطب کی طرف دوسری نظر پھینکنے کی ہمت کی تھی
نہ فائل پر دوسرے کاغذ کو ایک سے دوسری مرتبہ دیکھنے کی جرات۔ وہ جنس کا خطہ مول لینے کو بھی تیار
نہیں تھی جانے یہ طلسم کدہ کس نے بنایا ہے۔ اور کب ٹوٹ جائے۔ کب کا سینے میں اٹکا ہوا ایک یاد
سائس آسٹری سے اس کے ذہن کی ڈول سے آزاد ہوا۔

”ہوش میں آئیں آپ؟“ بلاشبہ لہجہ انتہائی تھانہ انداز مخاطب۔ بول چیرا ہوا اظہار لہجہ اور لہجے کا
ساتھ نہ دیتی مسکراتی آنکھیں۔ آپس میں ابھی ہولی انگلیاں ہلکے سے لڑ لڑ گئیں۔

”میں آپ کی تلاش میں بہت دور سے آیا ہوں۔ امید ہے آپ نظر کرم کریں گی۔“ وہ طنز ڈاٹا سا
مسکرا نا لہجہ۔ مودب انداز میں اس کی طرف جھکا۔

”میں آپ کو یقین دلانا ہوں اس باب کے لیے مجھ سے بہتر تو ہی آپ کو پورے پاکستان میں کیس نہیں
ملے گا۔“

”ٹھیک ہے رحیم دین۔“ سستی دیر بعد اس کے حلق سے مرے مرے انداز میں پھسلا۔ ”متم جاؤ۔“ وہ
خاموشی سے جیسے چڑاسی کے دروازے کی طرف بوڑھے قدموں کو گنتی رہی۔ ایک دو۔ تین پھر پانی

امیدواروں اور ان دونوں کے درمیان بڑا سا چلی دروازہ خال ہو گیا۔
ایک طویل اور پراسرارے گھرے سکوت کے درمیان وہ اس کی گیراؤ کرتی نظروں سے بچنے کے جتن
کرتی ہو کھاتی رہی۔

کیسے آئے آپ؟ اس طویل الجھن سے بچ نکلنے کا صرف یہی سرا اس کے ہاتھ لگا۔

”آپ نوکریاں پانچ رہی ہیں۔ ہم نے سوچا لگے ہاتھوں ہم بھی نوکریاں پانچ دھولیں۔“

”آپ خود نوکریاں پانتے ہیں۔“ اس نے میز کی شفاف سطح سے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا تھا۔ ”آپ
نوکری کا کیا کریں گے؟“

”نہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“

”اور سب لوگ کیسے ہیں؟“ کتنی دیر سے روکتے روکتے اس کے اندر سے نکلا۔

”آپ کی بلا سے۔“ انہوں نے کرسی چھوٹ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”پاہر جتنے بھی امیدوار ہیں
ان میں مجھ سے زیادہ سستی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اجازت چاہوں گا۔“

وہ آئے بھی۔ بیٹھے بھی اور چلے بھی گئے۔

اسے اس طرح حیران اور سکت چھوڑ کر جیسے رات کی اولین نیند میں کوئی اوجھڑا سا کچا خواب دیکھے۔ وہ اپنے کوئی پتا نشان چھوڑ کر نہیں آتی تھی۔ پتا نہیں اس شخص کو ان راستوں کی نشان دہی کس نے کی تھی۔ رجب دین میاں کی ناز میں دوسرا امیدوار لے آیا۔ شاید یہ اصلی چوہدری سعید تھا۔ یا کوئی اور تھا۔ اس کا بے ربط بے چارہ بن جیسے کسی ایک نقطے پر مرکوز ہونے سے قاصر رہ گیا۔

بے سے بے پاس اس کا پتا تھا نہیں تھا۔ کبھی اس نے بندے تل کو تفصیل سے اپنے بارے میں بتایا تھا۔ کیا انہوں نے اپنی موت سے پہلے دانیال خان کو کچھ بتایا ہو گا یا جذبہ دل اور اس کی شش وغیرہ جیسی بے ہودہ باتوں میں کوئی حقیقت ہے؟ اس کا دل کسی دلیل پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ سکون سے بیٹھ کر تجزیہ کرنے کا وقت آنے اور جانے میں ہی نکل گیا۔ ہاں انکا امیدوار منتظر تھا۔ آنکھیں پھٹائے لیکن سر اٹھائے۔ کہ یکم صاحبہ سوانوں کا سلسلہ شروع کریں۔ اور روزگوار اور بے روزگاری کے پکڑے آزاد ہو جائیں۔

اس نے ساری ذاتی صلاحیتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی لیکن بہن جیسے مایوسیاں ناکارہ اور بے کار سا ہو گیا۔ اچھل کر حلق میں آگڑھنے والا دل ابھی تک ہمار نہیں ہوا تھا۔ اور اب تو ذہن اس یقین اور بے یقینی کی کیفیت سے گزر رہا تھا کہ کیا اس نے حقیقت میں کچھ دیکھا بھی تھا نہیں۔

اس کا دل چاہا وہ اس اندر کو اوجھڑا چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے سب کو بھٹل بھٹال جائے۔ اندر کو کو راض بھائی کے آنے تک انتظار کئے کہ اس کا نیم خوابیدہ سافین حلقہ اور درست فیملہ کرنے میں ناکام جا رہا تھا۔

وہ معذرت کر کے اٹھی۔ ملحقہ غسل خانے میں پانی کے بہت سے چھینٹے اس نے اپنے چہرے پر ڈالے۔ تو لے سے مت نکلتے ہوئے اس نے خود سے کہا۔ یہ بچکانہ پن ہے اور جب سال بھر اس نے اس آگ کے شعلوں سے اپنا دامن بچائے رکھا تو اب برف کے تو دل میں بھلسائے میں کیا دانشمندی ہوگی۔ ایک گرم جانے کی بیل امیدوار گوے کر اور ایک اپنی بی بی کر اس نے عارضی طور پر خود کو ہوا کر ہی لیا۔

پھر وہ بلا ہر اطمینان سے اندر کو کے غسل میں مصروف ہو گئی۔ کہ وہ بچے اس کو چھپا کر لٹھ کی چٹنی موصول ہوئی جس پر لکھا تھا۔ ”اب کوئی بچہ بچا جا رہا ہے امیدوار ان کو کل بلوا جائے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔“ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اس نے حیرت سے دیکھا صبح سے انتظار میں بیٹھے امیدوار ان کو کل بچہ بلوا لیا جائے۔ کیا زندگی میں ان کو کوئی کام نہیں کرنا ہوتا ہے ایک قطار میں آکر لگ جانے کے

اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ مجید صاحب اپنی جانب سے معذرت کر کے انہیں رخصت کر رہے تھے اور شاید ایسا ہوتا ہی رہتا تھا کہ انہوں نے برا نہیں منایا۔ وہ حیرت اور افسوس سے دیکھتی رہ گئی اور لوگ اب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ جانے ہی گئی تھی گوشی اس کو پکڑا لے گی۔ چہرے سے گری ابھی وہ کھانے پر جانے کو ہٹائے چاہتی تھی۔ وہ گزری ساری وارات حرف بہ حرف اس کے چہرے پر تک ختم نہیں ہوئی تھی اور شیشہ تیار تھا کہ اس پر گزری ساری وارات حرف بہ حرف اس کے چہرے پر

لکھی ہے۔ اس نے تھوڑا سا منہ اور وحیا۔ وہ کوئی سے خوفزدہ سی کیونکہ وہ جان جائے گی مین منہ سے کچھ نہیں کہے گی۔ ایک اور پیغام کھانے کے سلسلے میں اس وقت موصول ہوا جب وہ غسل خانے کے شیشے کے سامنے کھڑی چہرے پر لکھی داستان کھینچ رہی تھی۔

اسے اب جانا ہی ہو گا۔ چلے دو رو اس کے اس طرف اسٹول رکھ کر سری طرف چلا گیا۔ لکھی تھی لیکن اب اسی دیوار میں شکاف ڈال کر ایک عارضی دروازہ بنا دیا گیا تھا۔ تاکہ سڑک پر جانے بغیر اندر ہی اندر غلطی نہ رکھا جاسکے۔

وہ برآمدے میں پہنچی تو کھانے والے کمرے میں شور مچا رہا تھا۔ ”راض بھائی اس کے ساتھ دھوکا دینے کی واردات کر کے نازان آفس میں گئے تاکہ اسے ان تمام جھیلوں سے تباہی نمونہ پڑے۔“

اور اسی لیے پچھلے اس قدر زور دیا جا رہا ہے۔ راض بھائی سے اچھی طرح منہ کے لیے اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اپنی جگہ بچھڑ گئی۔ سارے جسم سے خون تھج ہو کر اس کے چہرے پر تھا۔ ہاں لگے تھتھا ہوا سر پہ چہرے۔ تیشی کو جی کے آئینہ ان میں سگنے والے انکا رے ہاں اگر کوئی سے کوئی چیتا اگر کوئی کے براہروی کرسی پر بیٹھا نہیں رہا ہوتا تو اسے اتنی حیرت نہ ہوتی۔ لیکن وہ چیتا نہیں تھا۔ اور یہ دن دہائے تصور کی دنیا میں دیکھے جانے والے ڈے ڈیر بھی نہیں تھے۔

”اسلام علیکم۔“ انہوں نے بہت دیر پہلے کہا تھا۔ اور وہ اس کے احترام میں جب سے مودب کھڑے ہوئی تھی۔

”بیٹھو بیٹی۔“ ڈوڈی نے پلٹ کر اس کی طرف متنبہ سے دیکھا۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ وہ ہوش میں آگئی تھی۔ اور اس کو ہوش و خواہش سے بچانے کرنے والا شخص بڑے اطمینان سے اس کے اعصاب سمیٹ کر اپنی کرسی سنبھال چکا تھا۔

”تم نے خان صاحب کو کھانے پر اپنی دیر کرا دی۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ ڈوڈی کے لہجے کی شفقت اور جھڑک دونوں ہی پلایا جیسی تھیں۔ اور اس کی ان کو بوش کی حالت سی ہو گئی تھی۔

”سوری بیٹی۔“ اس نے نہ ہم سے لہجہ میں کہا۔ ”ڈوڈی۔ جانا انکو روکھا تھا۔ آج۔“ گوشی نے چہرے کی خبیثگی بحال کر کے ذرا سا سر ہلکا لیا۔

”بیٹا تمہارا بیٹا بھائی سے کیوں نہیں لیتا؟“ ”جیسے وہ تو ان کے درمیان رہتے رہے ہوں۔ جیسے وہ اس گھر کے ہی فرد تھے اور ابھی کہیں پھنس کر رہا ہو لایا ہے۔“

”میں ملی ہوں۔ اسلام علیکم۔“ ”مکراتی آنکھوں اور طمانیت سے مسکراتے چہرے کے ساتھ صبح کے مقابلے میں بالکل تازہ دم اور شاش شاش تھے۔ جیسے واقعی یہ ان کا گھر تھا۔ اور یہاں کچھ بھی اجنبی نہیں تھا۔“

”ہم تو بیٹہ دانیال خان کے ممنون رہے ہیں۔“ ڈیڈی نے ڈوٹے ان کی طرف بڑھائے۔
 ”یہ دانیال خان ہی تھے جو تمہاری نیہیت کی اطلاعات ہم تک پہنچاتے رہے۔ تمہارے بیٹے ہوئے
 تمہارے لائے۔ اور تمہارے پیچھے۔ اور اگر دانیال خان انہی محنت نہ کرتے تو اتنی آسانی سے تمہارا
 کاروبار واپس بھی نہ ملتا۔“
 اس کا منہ حیرت سے کھلا تھا لیکن زبردستی اس نے ہنر کر لیا۔
 ان کے چہرے پر غمت تھی نہ شرمندگی۔ جیسے اس میز پر کسی نے کوئی غلط بیان دیا ہی نہیں اس نے پلٹ
 سامنے کی اور خاموشی سے سر پیچ کر لیا۔

گوشتی پوچھا: ”اور ایسی خوشی اور چوچھالی اچھے دنوں کے بعد اس نے بھی اس کے چہرے پر
 نہیں دیکھی تھی۔“ وہ مسلسل دانیال خان سے کہا کہ وہی تھی۔ اس کے کانوں میں ڈیڈی کا لفظ بھی نہیں پڑ
 رہا تھا۔ داغ میں بیٹھتے ہوئے جیسے ہتھوڑے کی ٹھک ٹھک اور شل شل کرتے کان۔
 مٹی نے اس سے دن بھر کی مصروفیت کے بارے میں پوچھا تھا۔
 اور ڈیڈی نے انٹرویو کی تفصیل مانگی۔ اور اس کو ڈیڈی بھی تھا کہ روزگار کی خاطر دنیا ہی ترک نہیں کر بیٹھے
 لیکن ایک مکمل فٹور ایک پورا جملہ اس کے کانوں نے نہیں سنا۔
 ”آپ کھانا شروع کیجئے نا۔“ دانیال خان نے ہی اس کو مشکل سے ڈکلا تھا۔ وہ بھی اس سہولت سے
 جیسے یہ ان کا اپنا گھر ہو اس کے سامنے گھر پر اپنا حق حشر ہے۔

”بیٹا نروس ہو رہی ہے۔“ گوشتی کھانے کا کرہنسی تھی۔ اس کا جی چاہا گوشتی کی اس حماقت پر اس کو چائنا
 مارے۔ اس نے احمد اس کو چوک میں کھڑا کر کے تماشہ بنایا تھا۔
 ”کیوں۔ نروس کیوں ہو رہی ہے؟“ مٹی کو کھلا نہیں ”ٹھک جی ہوگی۔ خاک گوشتی۔ کبھی تو ڈھنگ کا لفظ
 بولا کر۔“
 ”سوری مٹی۔ میرا ذخیرہ الفاظ اچانک ختم ہو گیا ہے۔ میں اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہوں۔“ سوری
 مٹی کے بعد کھانا اچھا رہا اس نے زبردستی بڑا کر کھا تھا۔
 اس نے ایک نظر گھور کر گوشتی کی طرف دیکھا۔ گوشتی اس کی بتا رہی تھی کہ وہ بیٹہ خانہ سے بیٹھ کر بیٹھ رہی تھی۔ لیکن
 اس وقت وہ سوڈو نراں سے بالاتر ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اپنے ساتھ بیٹھے شخص کی شہ پر اس کو تماشہ
 لکوا رہی تھی۔

اس نے ایک نظر دانیال خان کی طرف ڈال دیا۔ وہ اس کو جیسے چاند کی پتھر تک سے ساکن کر کے بے نیاز
 سے ہو گئے تھے۔ لاپرواہی سے کھانا کھاتے اس کو خاص طور پر بے توجہی سے نوازتے ”ایک ایک شخص
 سے غائب تھے۔“

تم میرے دل کے ہر ہر موسم سے آگاہ ہو۔ مسکرو دانیال خان۔
 میں بھی تمہیں جھسم کر سکتی ہوں۔ تم جانتے ہو بدلتے ہوئے میں میرا بھی کوئی مقابلہ نہیں۔
 اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اور گھر میں سب لوگ کہتے ہیں؟“ اس نے تسخیر آوازیں نکالیں۔ میں ان کی شرارت کرتی آنکھوں
 میں دیکھا تھا۔ اور روراب کہہ کر دیکھا تھا۔ آپ کی ملا ہے۔
 وہ تھوڑی دیر کے لیے جیسے بے یقینی کی کیفیت میں رہے۔ اس نے خود پر قابو پایا۔ پہل وہ اسی طرح
 خود کو سرزنش کرتی رہتی ہے اسے اپنے آپ پر بلا کا عہدہ حاصل ہے۔
 ”سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔“ وہ بالکل سنجیدہ ہو گئے۔ ”آپ کو یاد کرتے ہیں۔“

”جی ہاں۔“
 ”جی ہاں بھی اور سب بھی۔“
 سب سے زیادہ یاد کرنے والا تو اب تھا ہی نہیں۔ وہ تھوڑی دیر پہنچی رہی۔ پھر اس نے بیل دوبارہ اپنے
 رنگ میں کر لیا۔

”اور انہوں نے میرے لیے کیا بھیجا ہے؟“
 ”آپ کے لیے۔“ انہوں نے چٹون کی سیب میں ہاتھ ڈالا اور خالی نکال لیا۔
 ”کچھ بھیجا تو ہے۔ شاید بیک میں ہے۔“
 ”کیا چیز ہے؟“ مٹی نے بھیجی ہے؟“
 ”ہاں نہیں۔ میں نے کھول کر نہیں دیکھی۔ بے بے نے بھیجی ہے۔“ انہوں نے جھجکی کا خول
 چڑھائے رکھا۔

”اور آپ انہیں لے کر کیوں نہیں آئے؟“ وہ جال بچا رہی تھی اور قدم قدم پر ان کو لڑکھڑاکر گرانے
 میں اسے مزاحمتی آ رہا تھا۔ وہ اب تک کا بیاب تھی۔ انہوں نے ایک نظر اس کی آنکھوں کی فاقہ چمک
 کی طرف دیکھا۔ لہجہ بھر کا ڈرامائی وقوف دے کر انہوں نے اس کی آنکھیں اپنی گرفت میں کر لیں۔
 ”آپ کہتی ہیں تو انہیں بھی لے آؤں گا۔“

ان کے لیے کسی کی معنی خیزی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ کم از کم میز کے چاروں کناروں پر۔ وہ لڑکھڑا گئی
 اس کی ساری حاضری جالی اور ذہانت ایک دم جیسے بھاب ہو گئی۔
 انہیں تھوڑا سا لال بھی ہوا۔ خواہ مخواہ خود کو سکندر اعظم سمجھنے والی لڑکی کر انہوں نے چاروں شانے
 چیت کر دیا تھا اس کے چہرے پر ہلکی سی زردی آگئی۔ اس نے ڈیڈی اور دانیال خان کے مابین گفتگو کا ایک
 لفظ بھی نہیں سنا تھا۔

اسے آٹس میں کچھ کام تھا۔ اس نے گھروالوں اور ان کے مہمان سے معذرت کی اور خاموشی سے گھر
 آگئی۔ دن کی تیز شعاعیں کھڑکی کے راستے کمرے میں آ رہی تھیں۔ اس نے پڑے گرا دیے۔ بیڈ کو
 الٹ کر بچھا۔

یہ وہی گھر تھا۔ اور وہی اس کا محبوب پلنگ۔
 کہ جب وہ یہاں سے گئی اور وہی اس نوعیت اور فہم کی اس شدت سے واقف تھی۔ اس کے گرا ایک
 جال سا چھایا جا رہا ہے۔ اس میں کون کون شریک ہے؟ کون کون ہے جو یوں سر محفل اس کا ڈرامہ رچا کر
 خوش ہو رہا ہے۔ نہ اس کہانی کے خالق سے آگاہ تھی نہ کرداروں سے۔

ہاں کمرہ بند کر کے سکون کے بہانے ان سے چھپ سکتی تھی۔ سوچ چھپ گئی۔

اس نے راکے کے اشارت ہونے کی آواز بھی سنی اور اس کا مخصوص بارن بھی جواں گھر کے سامنے خوب زور سے بجایا گیا تھا۔ یہ بارن بجانے والا ہاتھ کوئی کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔ پھر چھپ چھپ گئی۔ وہ کہاں گئے تھے۔ وہ کہاں جاتے تھے۔

اور یہاں تک کہ آپ نے اپنے تھے؟ وہ نہ سمجھتے تھے بالکل عاجز تھی۔ کتنی دیر وہ سیدھی پڑی چھت کو کھینچتی اپنی ذہنی صلاحیتیں استعمال کرتی رہی۔ پھر تھک کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ یہاں جس لیے بھی آئے تھے ان کے رویوں میں واضح فرق دکھنا چھپا نہیں تھا۔ شاید اس کے بھی کہ یہ ان کا گھر نہیں تھا۔ لاکھوں اس کے مالک نہ تھے۔ اسے لگا اس نے آنکھیں ہی بند کی تھیں اور کھول دیں۔

کوئی اس کا دروازہ پینٹ رہا تھا اور گرے ہوئے پردوں کے پیچھے تاریکی پھیل رہی تھی۔ بے ساختگی ہی میں اس نے لگا کو کھینچا۔ وہ سرات آٹھ گھنٹے سوئی رہی تھی۔ اب دروازے کے پنے جانے میں شدت آگئی تھی۔ جیسے دروازہ توڑا جائے گا۔ یہ کیا اماں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ یا رحیم چاچا! وہ کتنے دنوں سے اس کے آنکھیں دھکنے توڑ رہے تھے۔ لہذا پڑھ پڑھ کر پتہ چل رہا تھا۔ اس نے دروازہ پھوٹا اور بھل سی ہو گئی۔ غیر معمولی نیند سے بوجھل متحور آنکھیں۔ اچھے کھڑے بال۔ سلوٹوں سے بھرے بے ترتیب سے لباس میں۔

”کی ایم سو ری۔“ لے والے نے آہستہ سے کہا۔
”ب کھروالے سمجھے آپ ہمارے ساتھ ہیں۔ ابھی ابھی آپ کی گمشدگی کی اطلاع عام ہوئی ہے۔“
”میں دیر تک سوئی رہی۔ سو ری۔“ وہ دونوں ایک دوسرے کے آگے سامنے دھکیلتے تھے۔

میں کھڑے رہے۔
و کتنی دیر اس کے گھر پر پھیلی زردی اور دن بھر سوئے رہنے کے پتہ جو اس کا چہرہ دیکھتے رہے تھے۔

”میں نے یہاں آکر تمہیں پریشان کر ڈالا ہے۔ ہے نا؟“ انہوں نے نرمی سے اس کے دروازے کی چوکھٹ سے کمرنگائی۔

”اور یہ عجیب بات ہے میں ہمیشہ تمہارے لیے پریشانی کا سبب بن رہا ہوں۔ جالا کہ ایسا میں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔“ وہ خاموش رہی۔ اس کے اس ان سارے الزامات کا جواب بھی نہیں تھا۔
”میں جانتا تھا جو خیریاں تم سے پھر گئیں۔ وہ تو میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ لیکن تمہیں مزید الجھنوں سے بچانے کے لیے شاید اس سے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ بہت مدت ہوئی۔ کوئی کا ایک خط میرے

نام آیا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس نے یہ بتا دیا کہ رشی لا بیرری سے پرانے اخبار کنگال کر ڈالا ہے۔ اس نے یہ معلوم کرنا چاہا تھا کہ آیا وہ لا نام کی کوئی لڑکی یہاں ہے؟ اس سے مجھے اندازہ ہوا شاید تم گھر سے ناراض ہو کر آئی ہو۔

میں تمہارے بارے میں تفصیلات لینے کو کسی کے گھر تک آیا تو مجھے اگل جھپٹے سے سب باتوں سے آگاہ کیا۔ یہ اتفاق ہی تھا یا شاید تمہاری گھر کی ہمسائیگی جس نے ایک مدت مجھے اس گھر میں رکھا۔ بے کو میں نے اطلاع دی میں سرخارا میں ٹھہرا ہوں۔ لیکن جب تک یہ مسئلہ مکمل طور پر حل نہیں ہوا۔ میں نے تمہارا سامنا نہیں کیا۔ مجھے کوئی نے بہت مزید فصاحت کی تھی کہ کوئی تمہارا دل نہ دکھائے پائے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تمام خوب اچھی طرح کی مرتبہ میرا اپنا دل دکھا چکی تھیں۔
”نہیں نے آپ کا دل بھی نہیں دکھایا۔“ وہ جیسے برہمی سے کھڑے سے بچھ گئی۔ اسے لگا اس کے پیروں میں مزید کھڑے رہنے کی جان نہیں ہے۔
کو اڑتے ٹیک لگائے اس نے رندھی سی آواز میں کہا۔

”الہ! آپ ہر وقت مجھے برا بھلا کہتے رہے ہیں۔“
”تم نے مجھے کوئی اچھی بات کہنے کا موقع ہی کم دیا ہے۔ ہر وقت گھوڑے پر سوار تم ہنر افغانے رکھتی ہو۔ اور اپنا آپ بچانے کے لیے مجھے کسی بھی لڑکی کے حوالے کرنے کو ہر وقت تیار۔“ وہ گھنٹوں کے سارے اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

”بے۔ کو تو میں تمہاری خواہش کے مطابق لے لی آؤں گا۔ لیکن فی الحال یہ انگوٹھی میرے ہاتھ سے ہی ہٹاؤ۔“ انہوں نے انگوٹھی ڈھپا سے نکال کھینچا اور گھاس پر اچھال دی۔
”جی نہیں۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔“ اس نے اپنی انگلیاں ان کے ہاتھ کے شکنجے ایسی گرفت سے چھڑائی چاڑھیں۔

”گو اگر میریوں جیسی رسم ہے ہر کیف۔“ انہوں نے اس کی انگلی میں وہ سنہری سا چھلچھلاہٹا جھانسی دیا تھا۔
”اور کمال۔ ہند میں نے تو سنا ہے آپ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی بھی رہی ہیں۔ اور خود کو صبح بھی کرتی رہی ہیں کہ نیت جیسا مہدی مرض آپ کو نہ لگے۔ کہیں آپ کی دعائیں قبول نہ ہو جائیں۔ اسی لیے تو ہم بھاگتے ہوڑے یہاں پہنچے ہیں۔“

وہ بری طرح جھنجھلا کر اپنے ہاتھ ان کی گرفت سے آزاد کرانے لگی۔ ”یہ کوئی کی بچی سے تیس منٹ لوں گی۔“ بے ساختگی میں افسوس لگا کر بٹنے اس نے انہیں ہلکی دھکی دیکھا تھا۔
”دیکھا۔ تم جیسا اپنا ہاتھ مجھ سے پھنکار کر بھانکتی رہی ہو۔ جی کہ مجھے زخمی حالت میں چھو کر رہی۔“
”ہے بیلا یہاں۔“ ٹوٹے دروازے کے شگاف سے اپنی کچھنی کوئی نے اندر قدم رکھا اور اس کے وزٹے قدم ڈبیاں آکر رک گئے۔ جس کی انگوٹھی کا ٹھیکہ اس کی عزیز اذجان دوست کی انگلی میں جھک رہا تھا۔ جس کی آنکھوں کی پلک اور پرے کا رنگ انگوٹھی کے نیچے پتھر کا بندھے دے رہا تھا۔
”انگوٹھی کے لوگوں کو تمہارا شدید انتظار ہے بیلا۔ بے کو شیریں اور ڈارگو خان گل کو۔ جی کہ قیمت خان کو۔ وہ ایک اور جان کو قربان کرنے پر تیار نہیں۔ بھتی کے لوگ۔ وہ تم سے کتنا پیار کرتے ہیں یہ

انہیں اب معلوم ہوا ہے۔“
بیٹا کے خوبصورت سے ہاتھ دو مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ محفوظ اور مایوس۔
دل کا اطمینان اس نے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر برستے دیکھا۔ رنگوں کی پھیلاؤ اور نرم محبت بھرے
جذبول کی بارش میں۔ جھینپ کر مسکراتی اس کی دوست۔
اس نے دوڑتے دوڑتے دونوں ہاتھیں پھیلا کر ان دونوں کی گردن میں اٹکا دیں۔

